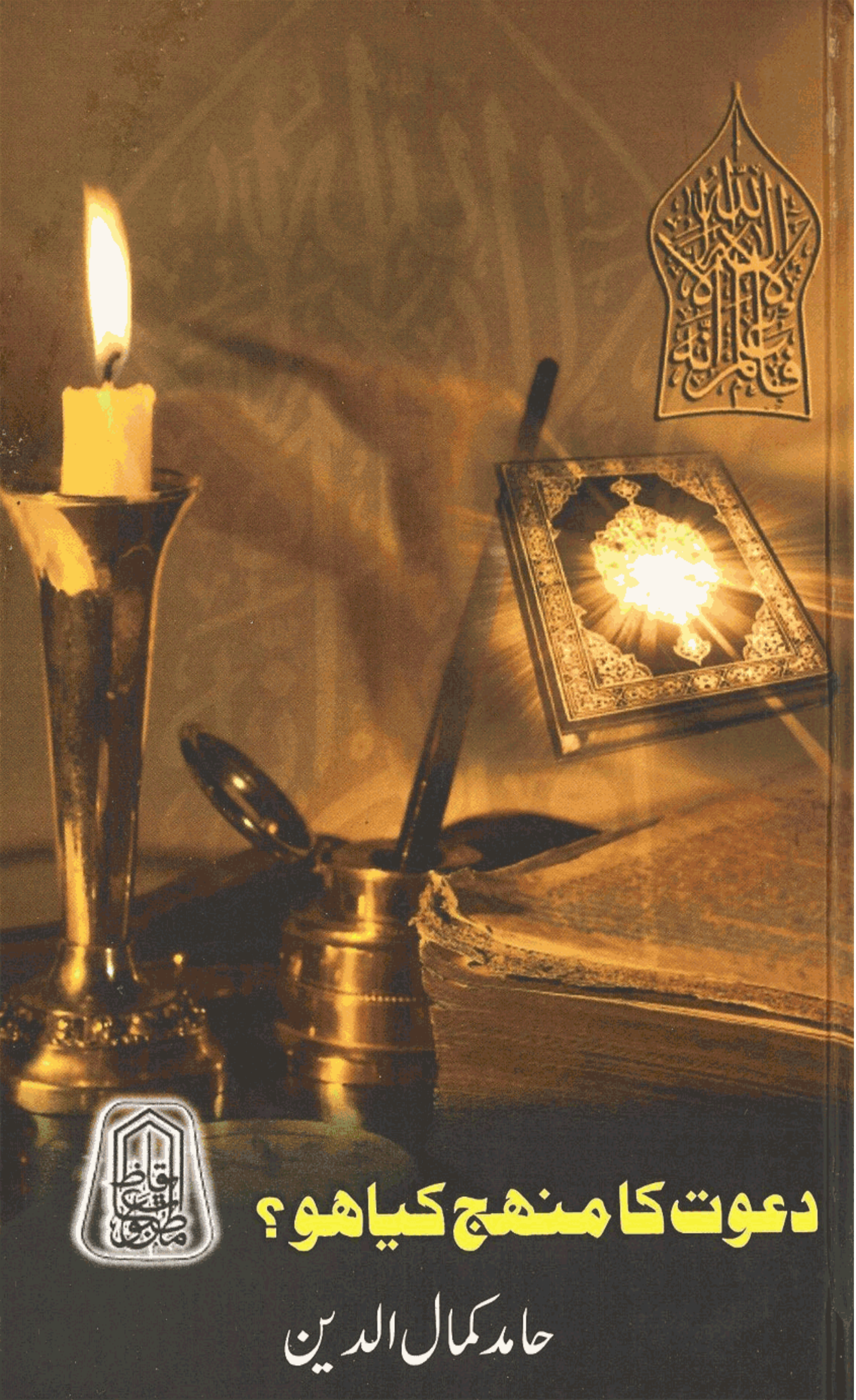


# دعوت کا منہج کیا ہو؟

حامد کمال الدین

# دعوت کا منہج کیا ہو؟

# دعوت کا منہج

## کیا ہو؟

تالیف: محمد قطب

اردو استفادہ: حامد کمال الدین

مطبوعات ایقاظ

طبع اول: ذوالقعدۃ ۱۴۲۸ھ، نومبر ۲۰۰۷ء

طبع ثانی: ربیع الاول ۱۴۲۹ھ، مارچ ۲۰۰۸ء

عنوان: دعوت کا منہج کیا ہو؟

عربی عنوان: كيف ندعو الناس؟

مؤلف: محمد قطب

اردو استفادہ: حامد کمال الدین hamidateeqaz@gmail.com

ناشر: مطبوعات ایقاظ

برائے رابطہ ووی پی:

مطبوعاتِ ایقاظ

۶۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

Ph: 042-7530541 / 0323-4031634

www.eeqaz.com

زمانے پر اثر انداز ہونے کیلئے لازم ہے ہماری تحریکیں فکر اور منہجِ عمل کے معاملے میں اپنی پیدائش، دین کے ایک اصیل اور عمیق فہم سے کرائیں اور 'حالات' کو اپنے اندر کم سے کم بولنے دیں۔ پچھلے پچاس سال سے جاری تحریکی عمل کا ایک معروضی جائزہ لیا جانا بھی ہماری ضرورت ہے۔ وہ باتیں جو سقوطِ خلافت سے متصل بعد کے عشروں میں یہاں اسلامی قیادتوں کی ایک محدود سی تعداد کو ہی پریشان اور مصروفِ فکر کرتی تھیں ان موضوعات کو آگے بڑھانے اور مزید پختہ کرنے پر عالم اسلام کے کئی ایک خطوں میں خاصا کام ہوا ہے اور بہت سے قابل قدر اضافے ہوئے ہیں، جن سے لاتعلق رہنا ناشکری شمار ہوگا۔ ہماری برصغیر کی تحریکی دنیا کو درپیش بعض معضلوں کی بابت محمد قطب کی یہ کتاب ایک اچھی سمت میں راہنمائی ہوگی۔

# فہرست

# عرضِ مترجم

''دین کا کام'' ایک خاص اصطلاح بن گئی ہے جس سے یہاں کا ہر طبقہ گو اپنی اپنی مراد لیتا ہے مگر اس کے پسِ منظر میں سقوطِ خلافت کے مابعد پیدا ہو جانے والا خلا اپنی غمازی عموماً کروالیتا ہے۔

''تحریک'' کا لفظ چاہے مستعار ہو اور اسلامی اصطلاحات میں اس لفظ کی تاریخ سو پچاس سال سے زیادہ پیچھے نہ جاتی ہو، مگر ''دعوت'' سے مراد بھی یہ لے لینا درست نہیں کہ یہ لوگوں کو اسلام کی بات 'بس پہنچا دینا' ہے۔ اس کیلئے الگ سے ایک لفظ ہے جو کہ قرآن میں بھی مستعمل ہے، یعنی ''بلاغ'' یا ''تبلیغ''، جو کہ یقیناً ''دعوت'' کا ایک پہلو ہے البتہ ''دعوت'' کا لفظ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

لوگوں کو ''اللہ کی طرف'' اور ''اللہ کے راستے پر'' لے کر آنے کا وہ ''پورا عمل'' جو انسانی معاشروں کے اندر بے شمار مرحلوں سے گزرتا اور متعدد صورتیں اختیار کرتا ہے ''دعوت'' ہی کہلاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے پورے کام کو ''دعوت'' قرار دینا اور قرآن کا آپ ؐ کو **''شاھداً و مبشراً و نذیراً و داعیاً الیٰ اللہ باذنہ و سراجاً منیراً''**[1] کہنا اسی جامع مفہوم کے ساتھ لیا جانا ہی آپ ؐ کے اور آپ ؐ کے مشن کے شایانِ شان ہو سکتا ہے۔

اس معاملہ میں وقت کے ان بعض ہزیمت پسند رجحانات سے متاثر ہو جانا بے حد نقصان دہ ہو سکتا ہے جنہیں ہم اپنے بعض مضامین میں ''اسلام کے اندر گاندھی کے مذہب کی ترویج'' سے تعبیر کر چکے ہیں۔ ''دعوت'' کو ''بیان'' یا ''تذکیر'' یا ''اپیل'' یا ''ابلاغ'' اور ''نشر و اشاعت'' کے معانی میں محدود کر دینا نہ صرف رسول اللہ ﷺ کے مشن سے ناواقفیت ہے بلکہ یہ عربی زبان کو عجمی مفہومات پہنانے کی بھی ایک

---

(۱) الاحزاب: ۴۵ ''ہم نے تمہیں شہادت دینے والا، بشارت دینے والا اور خبردار کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے، اور اللہ کی طرف داعی، اُس کے اذن سے، اور ایک روزِ روشن کر دینے والا سورج''

معیوب ترین صورت ہے۔

ان جدت پسند رجحانات کے جواب میں 'دلائل' اور 'حجت و برہان' کی نوبت کو پہنچنے سے پہلے دراصل یہی ضروری ہے کہ ان کے زیرِ استعمال ''اصطلاحات'' کو ہی مشکوک ٹھہرایا جائے اور جو 'مفہومات' ان کی اپنی جانب سے ''اہلِ اسلام کے ہاں مستعمل الفاظ وکلمات'' کی تہہ میں ٹھونس دینے کی آج کوشش ہو رہی ہے ان اجنبی اور رکیک naiive مفہومات کو ہی سب سے پہلے مسترد کر دیا جائے۔ ''اصطلاحات'' کا مسئلہ حل ہو جائے تو بہت امکان ہے بحث و آرا کی ضرورت ہی ختم ہو جائے۔

''أدعو الىٰ الله علىٰ بصيرة أنا و من اتبعني''[1] ...... ایک با قاعدہ وصف اور مشن ہے جو رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے متبعین کو منجانبِ قرآن دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں کوئی نقطہ ایسا نہیں آیا جہاں آپؐ نے ''دعوت'' کا کام ختم اور اِس کے 'علاوہ' کوئی کام شروع کر لیا ہو۔ ہر مرحلہ ''دعوت'' ہی کا مرحلہ رہا، خواہ وہ ابلاغ ہو، خواہ تذکیر، خواہ حکم اللہ کا قیام، اور خواہ قتال فی سبیل اللہ اور طواغیت کو اسلام کی راہ سے ہٹانے اور زمین کو فتنہ سے پاک کرنے کا مبارک عمل۔

''دعوت'' اور ''جہاد'' کے مابین کوئی ایسی لکیر کھینچ دینا جہاں یہ الگ تھلگ مشن دکھائی دیں، اور 'فریقین' اپنے اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل مہیا کریں، خوامخواہ کی ایک مشقت ہے۔ ''جہاد'' اور ''دعوت'' مختلف جہتوں سے ایک ہی حقیقت کا بیان ہے اور رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے پیچھے چلنے والوں کی سعی کا اور اس سعی کے مراحل کا ہی ایک تسلسل۔

''مابعد'' مراحل کی ساری بنیاد دراصل ''دعوت'' ہی کے اندر پڑی ہے بشرطیکہ ''دعوت'' کا مفہوم اپنی پوری جامعیت کے ساتھ واضح ہو جائے اور ''دعوت'' کو محض 'تبلیغ' اور 'نشر و اشاعت' کے معنی میں نہ لیا جائے۔

حق یہ ہے کہ آج کے بعض جدت پسند شکست خوردہ رجحانات نے صرف ''جہاد'' کا ہی مفہوم سکیڑ دینے کا جرم نہیں کیا۔ جو ظلم ان طبقوں نے ''دعوت'' کے مفہوم کے ساتھ کیا وہ بھی بیان سے باہر ہے۔ بلکہ ''جہاد'' کے مفہوم کا تیا پانچہ کرنے پر تو امت کے کچھ صالح طبقوں نے شاید اس تحریف کا نوٹس لیا ہو جو

---

(۱) یوسف: ۱۰۸: ''کہو: یہ ہے میرا راستہ: میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں ایک پوری بصیرت پر رہ کر، میں بھی اور میرے پیچھے چلنے والے بھی، اور اللہ کی پاکی ہے، اور میں مشرکوں سے کچھ ناطہ رکھنے والا نہیں''

کبھی 'قانونِ اتمامِ حجت' کے تحت ہوتی رہی اور کبھی 'تعبیر کی غلطی' کے زیرِ عنوان...... البتہ ''دعوت'' کے مفہوم پر جس طرح ہاتھ صاف کیا گیا اس کا نوٹس لینے کو بھی الا ماشاءاللہ کم ہی کوئی آگے بڑھ پایا۔ یہاں تک کہ ''دعوت'' بطورِ مشن اور بطورِ منہج وطریقِ کار انہی کا امتیاز تسلیم کیا جانے لگا، یعنی دوسرے طبقے کچھ اور عنوانات کے تحت اپنا دینی مشن بیان کرتے رہے تو ان ہزیمت پسند طبقوں کا مشن 'صرف' دعوت بتایا گیا! جبکہ درحقیقت ان طبقوں کو ''جہاد'' ہی نہیں ''دعوت'' کے ساتھ بھی کچھ نسبت نہ تھی، نہ ''دعوت'' کے مضمون اور موضوعات کے لحاظ سے ان طبقوں کو انبیا کی دعوت سے کوئی علاقہ، نہ دعوت کے منہج اور طریقِ کار کے حوالے سے ان کے کام کو انبیا کی سعی وجہد سے کوئی واسطہ، نہ ان کی ولاء اور نہ ان کی براء، نہ ان کی دوستی اور نہ ان کی دشمنی، باطل کو ان سے اور نہ ان کو باطل سے کوئی پرخاش، نہ جاہلیت اور جاہلی دستور سے تعرض کا ان کے ہاں کوئی تصور، نہ اہلِ حق کی شیرازہ وصف بندی...... جبکہ یہ سب کچھ انبیا کی زندگی میں ''دعوت'' ہی کے تحت انجام پاتا رہا تھا۔

زیرِ نظر کتاب چونکہ ہمارے دینی حلقوں میں دعوتی عمل کے اندر ایک بہتری اور تصحیح وترقی لائے جانے سے ہی بحث کرتی ہے، لہٰذا ہم نے ___ اپنے برصغیر کے حوالے سے ___ اس جانب اشارہ کر دینا بھی ضروری جانا کہ بعض ذہنوں میں دعوت کے ''طریقہ ومنہج'' سے پہلے، جو کہ اس کتاب کا اصل موضوع ہے، خود دعوت کا ''مفہوم'' ہی درست ہو جائے۔ گو اس سلسلے میں الگ سے کچھ لکھا جانے کی ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

انسانی زندگی میں وہ جامع ترین تبدیلی ایک منظّم انداز میں برپا کر دینا جو انسانی نفس کو ہر معنیٰ کے اندر خدا کی بندگی میں دے آئے اور انسانی معاشرے کو خدائی شریعت کے نقشے پر سرتاپیر ڈھال دے...... پھر اس تبدیلی کو معاشرے کی ہر سطح پر لے جانا...... اور اس صالح تبدیلی کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ہٹا دینے کیلئے اپنا پورا زور صرف کر دینا، خواہ وہ رکاوٹ نفس کے شرور ہوں یا مجرمینِ ارض کا برپا کیا ہوا فتنہ وفساد...... یوں انسانی دنیا کو ہر ہر پہلو سے اور ہر ہر سطح پر خدا کی جانب لے کر چلنا اور خدائی تنزیل کو بنیاد بنا کر انسانی واقعے پر بھرپور طور پہ اثر انداز ہونا ''دعوت'' ہی میں شمار ہوتا ہے۔ وہ بہت سے اجتماعی فرائض اور حالات جو اس عمل کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے ضمن میں فقہاومفکرینِ اسلام کے زیرِ

بحث آتے ہیں، چاہے یہ تربیت ہو یا تعلیم اور تزکیہ، یہ سری (خفیہ) دعوت ہو یا علانیہ اظہارِ حق، یہ ''**جادلھم بالتی ھی احسن**''(۱) ہو یا ''**واغلظ علیھم**''(۲)، یہ تبشیر ہو یا انذار، ترغیب ہو یا زجر و توبیخ، آمنے سامنے آ کر باطل کو للکارنے کی بات ہو یا اصحاب کہف کا اسلوب اختیار کرنے کی، ہجرت ہو یا قتال، کفار و منافقین کے ساتھ نمٹنے کا عمل ہو یا اہلِ ایمان کی وحدتِ صف اور تالیف و شیرازہ بندی...... یہ 'دعوت'' کے وسائل ہیں یا پھر ''دعوت'' کی صورتیں اور ''دعوت'' کے مراحل۔

''وسائل'' اور ''مراحل'' کا درست تعین البتہ ایک عظیم الشان علم ہے اور حکمت کا یہ سرا نصیب والوں کو ملتا ہے۔ چونکہ یہ علم کا ایک بڑا شعبہ ہے اور اجتہاد کا ایک زبردست میدان، لہٰذا دعوت کے وسائل اور مراحل کے تعین میں اہلِ اختصاص سے رجوع کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ گو اجتہادات کے اختلاف کیلئے گنجائش رکھنا اور علومِ دین کے دیگر شعبوں ہی کی طرح یہاں پر بھی اجتہاد کے حدود اور قیود کا پابند رہنا اپنی جگہ مطلوب ہے۔

''دعوت'' کے مفہوم کی بابت بات کی جانا تو، جیسا ہم نے کہا، کسی اور مقام پر ہی ممکن ہے مگر دعوت کے وسائل اور مراحل کے کچھ اہم جوانب کی بابت یہ کتاب البتہ ضرور قاری کی راہنمائی کرے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆

خلافت کے سقوط کے بعد عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں ایک نئے تحریکی عمل نے جنم لیا تھا۔ ابتدا کے چند عشرے اس میں زبردست جوش و خروش پایا گیا۔ مگر اب کوئی دو تین عشروں سے ایک شدید یکسانیت محسوس ہو رہی ہے اور کچھ لگے بندھے معمولات اور محدود سے اہداف ہی بار بار دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ نہ صرف یہ، بلکہ ایک بند سے راستے پر پہنچ رہنے کا احساس عام ہو رہا ہے۔ بہت سے طبقے جو اپنی سعی و جہد سے کچھ برآمد کرنا چاہتے ہیں اور اپنی محنت اور تگ و دو کو 'معمولات' کی بھینٹ چڑھانے پر تیار نہیں، مایوس بھی ہو رہے ہیں۔ کچھ اور طبقے بے صبری اور جلد بازی کی نذر ہونے لگے ہیں۔ جبکہ بہت سے طبقے یہاں مطلوب دعوتی عمل کی بابت بڑے بڑے سوالیہ نشان رکھتے ہیں۔ حتی کہ کئی ایک طبقے سرے سے ان ہزیمت پسند رجحانات کا شکار ہو رہے ہیں جو یہاں ایک بھاری بھر کم تبدیلی کی صدا بلند کرنے کو ویسے ہی 'تعبیر کی غلطی' شمار کرتے ہیں اور اس جانب کو رخ کرنا ایک صریح انحراف......!

---

(۱) النحل: ۱۲۵ ''ان سے باحسن اسلوب ہی جدال کرو'' (۲) التحریم: ۹ ''ان پر شدت کرو''

دعوتی عمل کی ان پیچیدہ گتھیوں کو اس کتاب نے، جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، بہت خوبصورتی کے ساتھ سلجھایا ہے۔

دعوتی اور تحریکی عمل جو پچھلے سات عشروں سے مسلسل جاری ہے بلاشبہہ ضرورت مند ہے کہ اس کا ایک از سرِ نو جائزہ لیا جائے اور اس کو جن نئی جہتوں سے آشنا کرائے جانے کی ضرورت ہے یا جن نقائص سے پاک کیا جانا ضروری ہے ان سب کو پوری دقت اور دیانت داری کے ساتھ سامنے لایا جائے۔ کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ کسی تحریکی عمل کے مؤسسین نے اپنی اجتہادی صوابدید سے جو راہ اپنے ہم سفروں کیلئے ایک بار طے کر دی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اب وہ پتھر پر لکیر ہے یا یہ کہ جس وقت کسی تحریک کا منہج اور طریقِ کار وضع کیا گیا تھا اُس وقت اس کے وضع کرنے والوں پر کوئی وحی اتری تھی۔ جب ایسا نہیں ہے تو پھر موجودہ تحریکی عمل میں بہتری لائے جانے کیلئے بہت کچھ پڑھا پڑھایا جانا ضروری ہو جاتا ہے اور کچھ پختہ تر اہداف کیلئے ذہنوں کے اندر گنجائش پیدا کی جانا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔

آج کے دور میں جس طبقے کے ہاں بھی اپنے فکری و منہجی اثاثہ جات کو مسلسل اپ ڈیٹ کرنے کا عمل موقوف ہو جائے گا، خدشہ ہے کہ آنے والے کچھ تیز تر ین مراحل میں وہ اپنے آپ کو بہت پیچھے رکھ لے گا۔ پس لازم ہے کہ ہماری قیادتیں ان موضوعات کو ہرگز بے توجہی کا مستحق نہ جانیں۔

معاملہ یہ ہے کہ جو باتیں آج سے ساٹھ ستر سال قبل اسلامی قیادتوں کی ایک محدود سی تعداد کو پریشان اور مصروفِ فکر کرتی تھیں اور ان قیادتوں نے اپنا غور وخوض کر لینے کے بعد اُس وقت اپنے اصحاب کو ایک راہ تجویز کر کے دی تھی...... پچھلے سات عشروں میں ان موضوعات پر سوچ بچار کرنے والے مخلص ذہین صاحبِ علم دماغوں کی تعداد بحمداللہ بے اندازہ بڑھ چکی ہے اور یوں اس باب میں بہت کچھ نیا سامنے آ چکا ہے، جس سے بے رغبتی برتنا کفرانِ نعمت ہی نہیں اپنا تحریکی نقصان کرانے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔

ایسا بھی نہیں کہ کسی جماعت کو اپنے منہج کے اندر کچھ نہ کچھ مقامات پر 'تبدیلیوں' کا خیر مقدم نہ کرنا پڑا ہو۔ ایسا ممکن بھی نہیں۔ ہر طبقہ اور ہر جماعت کو لامحالہ کچھ تبدیلیوں سے گزرنا پڑا ہے اور وقفے وقفے سے اس واقعہ کا اعادہ بھی ہوا ہے، جس میں کہ اصولاً کوئی غلط بات نہیں۔ خود پر آہنی قالب چڑھا رکھنا اپنے عمل میں بہتری اور ترقی لانے کے اندر ایک بڑا مانع ہے اور کوئی باہمت تحریک اس امر کی متحمل

نہیں چاہے اکابر اور مؤسسین سے وہ کتنی ہی عقیدت رکھتی ہو۔ غور طلب بات البتہ یہ ہے کہ ہماری تحریکوں کی تاریخ میں بیشتر ایسا 'مجبوری' کے تحت ہی ہو پایا ہے نہ کہ "دلیل کی قوت" اور "مسئلے کے موضوعی حکم" objective ruling کو سامنے رکھتے ہوئے اور نہ ہی اپنے فکر اور اپنے منہج کے ایک "تنقیدی جائزے" کے نتیجے میں!......الا ماشاءاللہ

گویا اگر کبھی ہم اپنے مناہج پر نظرِ ثانی کریں گے بھی تو یہ 'حالات' (کے جبر) کے زیرِ اثر ہوگا نہ کہ کسی علمی مراجعے یا کسی فکری و تحقیقی وتنقیدی تقاضے کے طور پر۔ ایسے میں خدشہ یہی ہے کہ فکر و عمل کے معاملہ میں ہماری تحریکیں بالآخر 'حالات' کی پیدا کردہ ہوں جبکہ ہونا یہ چاہیے کہ 'حالات' ہماری تحریکوں کے پیدا کردہ ہوں۔ یہ ایک بہت بڑا فرق ہے جو تا حال ہم میں سے بہت سے ذہنوں کے اندر واضح نہیں بلکہ یہ ایک گھاٹی ہے جسے ہماری تحریکوں کو بہر حال چڑھنا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہی اصل چیلنج ہے۔

زمانے پر اثر انداز ہونے کیلئے ہماری تحریکوں کو جس صلاحیت کی ضرورت ہے وہ اسی چیز کی پیدا کردہ ہوگی کہ ہماری تحریکیں فکر اور منہجِ عمل کی معاملے میں اپنی پیدائش، دین کے ایک اصیل اور عمیق فہم سے کرائیں اور 'حالات' کو اپنے اندر کم سے کم بولنے دیں......اور یہ کہ علم اور حکمت کی بات جب بھی اور جہاں سے بھی ملے اس کو قبول کرنے میں پس وپیش سے کام نہ لیں کیونکہ یہ جہاں بھی ملے در اصل انہی کی چیز ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

تحریکی میدان میں جو لائحۂ عمل ابتدا سے اختیار کیا گیا ____ یعنی آج سے کوئی ستر اسی سال قبل ____ وہ بے حد مستحسن ہونے کے باوجود اپنے اندر کچھ بنیادی کمیاں رکھتا تھا، جن کی جانب اس کتاب میں باسلوبِ احسن اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ کمیاں اگر دور کر لی جاتیں تو آگے بڑھنے کا راستہ بہت کشادہ ہو جاتا۔ مگر جب ایسا نہیں ہوا تو اس تحریکی عمل کا خاطر خواہ بار آور ہونا ممکن نہ رہا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جو لوگ اس تحریکی عمل کی پیشرفت سے مطمئن نہ تھے وہ ان بنیادی کمیوں کے ازالہ پر ہی کمر بستہ ہو جاتے اور یوں ان کی کوششیں اس خلا کو جو ابتدا کے اندر پر ہونے سے رہ گیا تھا اب پر کر لیتیں۔ مگر ہوا یہ کہ ایسے نئے اٹھنے والے بیشتر طبقے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ ویسی ہی ایک چیز برآمد کرنے لگے جو پہلے سے یہاں موجود تھی اور اسی سے امید لگا بیٹھے کہ وہ سنگِ گراں جو اس تحریکی عمل کی راہ میں

حائل تھا اب ان کی اس کوشش سے دور ہو رہے گا۔ نتیجتاً ہر نئے طبقے سے مایوس ہو کر ایک نیا تر طبقہ سامنے آنے لگا بغیر اس کے کہ صورتِ حال میں مجموعی طور پر کوئی بڑی پیشرفت سامنے آئے۔ یہ سلسلہ اب بھی خاصے زور و شور سے جاری ہے اور لوگوں کے ہاں پہلے سے پائی جانے والی پریشانیوں کے اندر اور سے اور اضافہ کر رہا ہے۔

پچھلے دو عشروں سے البتہ 'تبدیلی' کی سعی کرنے والی یہ کوششیں ایک نیا رخ اختیار کرنے لگی ہیں جو کہ تحریکی عمل کیلئے بے حد خطرناک ہے، اور یہ ہے طاقت کے استعمال سے 'انقلاب' لانے یا 'شریعت نافذ' کرانے کا راستہ۔ وہ بنیادی کمیاں جو اس تحریکی عمل کی تہہ میں ابتدا سے پڑی ہیں، اس کے دور کرنے پر تو اس طبقے کے ہاں بھی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں ہوئی جواب تشدد کی راہ کو ہی ایک درست راہ باور کرنے لگا ہے۔ البتہ اس کے ہاں ایک بند راستے کو بزور کھولنے کا رجحان تیزی سے پرورش پانے لگا ہے۔ مصر، الجزائر، لیبیا اور شام کے اندر تو اس کے خاصی بڑی سطح پر تجربات ہو چکے ہیں جو کہ دینی کارکنوں کے کچھ بڑے بڑے نقصانات کرانے پر منتج ہوئے ہیں۔ البتہ کچھ دوسرے ملکوں میں بھی 'طاقت کے استعمال' کی آوازیں مسلسل پڑ رہی ہیں اور ایک اچھے خاصے طبقے کی امیدیں اسی عمل سے وابستہ کرائی جانے لگی ہیں۔ ہمارے اپنے ملک کے حالات اور پھر حکمرانوں کی کفر نواز طاغوتی پالیسیاں بھی اسی تشدد اور رد عمل پر مبنی اندازِ فکر ہی کی حوصلہ افزائی کر رہی ہیں۔ اس سے معاملہ جس انتشار اور افراتفری کا شکار ہونے والا ہے اس سے اسلامی تبدیلی کا عمل اور بھی بہت پیچھے جا سکتا ہے بلکہ ''اسلامی تحریک'' کو ایک 'انحراف' ثابت کرنے والے جدت پسند طبقے اپنے مقدمہ کے ثبوت میں اس سے جیسے جیسے دلائل اور شواہد پائیں گے اور 'اسٹیٹس کو' کے داعی طبقے تبدیلی کی صدا کو دبا دینے یا پٹڑی سے ہٹا دینے کیلئے اپنے حق میں اس کے اندر جیسا جیسا مواد پائیں گے وہ شاید ہمارے ان قابلِ احترام طبقوں کے اندازے سے بھی باہر ہو۔

ان سب رجحانات کو ہی اس کتاب کے اندر جس انداز میں زیرِ بحث لایا گیا ہے اور تحریکی عمل کو کچھ سماجی جہتوں سے روشناس کرانے کی بھی جس طرح ایک کوشش کی گئی ہے...... یہ سب ہماری تحریکی دنیا میں ایک نئی پیشرفت لے آنے کیلئے یقیناً اپنے اندر بہت کچھ رکھتا ہے۔ اردو دنیا میں یہ کتاب امید ہے 'فقہِ تحریک' پر ایک بیش بہا اضافہ سمجھی جائے گی۔

وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی پون صدی کا ایک معروضی جائزہ لیں اور مختلف خطوں کے اندر جو فکری اور تحریکی پیشرفت ہوئی ہے اس سے مدد لے کر اپنے کام کو مؤثر تر بنائیں۔ محمد قطب کی اس کتاب کا اردو استفادہ ہم نے اسی مقصد سے کیا ہے کہ "تحریکی پختگی" کی جانب بڑھنے کا یہ عمل ہمارے برصغیر کے اندر بھی ترقی کی نئی منزلیں سر کرے۔

☆☆☆☆☆☆☆

اس کتاب کا مؤلف ایک ایسی شخصیت ہے جو تحریکی دنیا کا ایک بہت بڑا نام ہے بلکہ ایک نہایت قابلِ احترام مایہ ناز بزرگ۔ آج کے کئی ایک جلیل القدر علما و مفکرین اسے اپنا استاد مانتے ہیں حتی کہ کئی ایک حلقوں میں اسے "شيخ الصحوة" یعنی "اسلامی تحریکوں کا پیر" کا خطاب دیا جاتا ہے۔

محمد قطب عالم اسلام کے اس وقت کے بڑے مفکرین میں سے ایک ہیں۔ آپ سید قطب کے برادرِ خورد ہیں۔ مصر سے جلاوطن ہو کر ایک عرصہ مکہ مکرمہ میں مقیم اور ام القری یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ عصر حاضر کے افکار اور نظریات کو اسلام کے آئینے میں دیکھنے اور قدیم وجدید کی گتھیاں سلجھانے میں ایک خاص مہارت اور امتیاز رکھتے ہیں۔ فکرِ مغرب کی درآمدات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اسلامی تاریخ ان کا خاص موضوع ہے۔ اسلامی بیداری کا عمل ان کی توجہ کا خاص مرکز ہے۔ دعوت، تربیت، جہاد، معاشرتی تبدیلی...... ان کی فکر کا مرکزی نقطہ ہیں۔

محمد قطب دو درجن سے زائد تصنیفات کے مؤلف ہیں۔ علاوہ ازیں، فکری اور تحریکی موضوعات پر ایم اے اور پی ایچ ڈی کی سطح کے متعدد بیش قیمت مقالات اور تحقیقات کے نگران رہ چکے ہیں۔ ان کی جلالت علمی کا اندازہ اس سے ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر سفر الحوالی جیسے نابغہ روزگار ان کے شاگرد ہیں۔ شیخ سفر الحوالی کے ایم اے اور پی ایچ ڈی کے مقالے انہی کی نگرانی میں لکھے گئے۔

اپنے مرحوم بھائی ہی کی طرح، محمد قطب بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو الاخوان المسلمون کے پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں اور اخوان سے محبت کو اپنی زندگی کا اثاثہ جانتے ہیں۔ البتہ اخوان کے منہج کو نئی جہتوں سے ہمکنار کرنے کے بھی شدت سے خواہش مند ہیں...... اس کا اندازہ آپ کو ان کی اس تالیف سے بھی ہو جائے گا۔

'آلِ قطب' نے دورِ حاضر میں دین کے فکری اور تحریکی اثاثہ جات کی ثروت میں جو بیش بہا اضافے کئے ہیں، کچھ محتاجِ بیان نہیں۔ سید قطب کا نام تو تحریکی دنیا کے چہار آفاق میں پھیلا ہے مگر دیگر تینوں بہن بھائی بھی اس عمل میں اپنا اپنا حصہ رکھتے ہیں، خصوصا محمد قطب۔ یہ مکتبِ فکر دوستوں اور دشمنوں ہر دو کی نظر میں کس قدر اہمیت اختیار کر گیا ہے، اس کا اندازہ ہمیں محمد قطب کے اپنے ہی ایک اقتباس سے بھی ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ایک دوست نے جو میرے ساتھ ایک ہی جگہ (ادارہ ثقافتِ عامہ، مصر) کام کرتا رہا ہے، ایک مستشرق سے اپنی ایک بار کی ملاقات کا احوال مجھے سنایا۔ یہ مستشرق ساٹھ کی دہائی کے اوائل میں قاہرہ کے دورے پر آیا تھا۔ اس نے میرے اس دوست سے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بہت سے سوال پوچھے اور مسلمانوں کے ہاں پائے جانے افکار کی بابت کچھ استفسارات کئے۔ دورانِ گفتگو، مستشرق اس سے میرے بارے میں پوچھنے لگا: "کیا فلاں شخص کو جانتے ہو؟" میرے دوست نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر اس سے پوچھنے لگا: "کیا وہ الازہر کا پڑھا ہوا ہے؟" دوست نے جواب دیا: "نہیں، وہ قاہرہ یونیورسٹی کے انگریزی ڈیپارٹمنٹ سے پڑھا ہے"۔ اس پر وہ اپنی حیرانی بلکہ ناپسندیدگی چھپائے بغیر نہ رہ سکا کہ قاہرہ یونیورسٹی کا انگریزی ڈیپارٹمنٹ جو کہ بنایا ہی اس لئے گیا تھا کہ یہاں چوٹی کے سیکولر پیدا کرے جو اس ملک میں رہتے ہوئے یہاں مغرب کی طرح سوچیں اور مغربی طرزِ زندگی کا ایک عکسِ جلی نظر آئیں...... اس ڈپارٹمنٹ کا پڑھا ہوا دینی معاملات میں کس طرح جتا ہوا ہے اور اسلام کے موضوعات پر لکھتا ہے!

اس کے بعد وہ میری تحریروں پر تنقید کرنے لگا، خصوصا میری کتاب "**شبہات حول الاسلام**" پر۔ سب سے زیادہ وہ اس بات پر تلملا رہا تھا کہ میں مغرب کی مادیت پر کس طرح تنقید کرتا ہوں اور مغرب کی مادی تہذیب پر، جو کہ روح سے خالی ہے، کس انداز میں چڑھائی کرتا ہوں۔ اسی تنقید کی رو میں وہ میرے دوست سے کہنے لگا: "اچھا تو تم لوگوں نے اپنی روحانیت کے بل بوتے پر کیا کر لیا؟ البتہ

ہماری مادی ترقی اگر نہ ہوتی تو تمہارا جینا ہی آج دشوار ہوتا!'' میرے مرحوم دوست نے اس پر اس کی تصحیح کی: ''مگر وہ (محمد قطب) تو یہ کہتا ہے کہ اسلام صرف روحانیت نہیں۔ اسلام تو ہے ہی اس حقیقت کا نام جہاں عالمِ مادہ و عالمِ روح یکجا ہو جاتے ہیں۔ وہ تو اس بات کا داعی ہے کہ ان دونوں ہی میدانوں میں مسلمان بیک وقت سرگرمِ عمل ہو''۔ مستشرق کہنے لگا: ''مگر تمہارے ہاں حقیقتِ حال جو اس وقت پائی جاتی ہے وہ تو کچھ اور کہتی ہے''۔ میرے دوست نے میرے بارے میں اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا: ''اس کی فکر کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں پائی جانے والی آج کی جو حقیقتِ حال ہے وہ حقیقتِ اسلام سے ایک بڑا فاصلہ اختیار کر گئی ہے''۔ اس پر تو مستشرق اپنا آپ ضبط ہی نہ کر سکا۔ جوش میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا: ''اچھا! تو وہ یہ کہتا ہے؟!! کہاں کہا ہے اس نے یہ؟؟'' میرے دوست نے جواب دیا: ''اپنی کتاب هل نحن مسلمون ''کیا ہم مسلمان ہیں؟'' میں۔ اس پر مستشرق نے پسپائی اختیار کر لی اور کہنے لگا: ''یہ ایک خطرناک جہت ہے!!''

(اقتباس از کتاب هلم نخرج من ظلمات التيه مؤلفہ محمد قطب ص۱۲)

☆☆☆☆☆☆☆

مؤلف کی خاص یہ کتاب '' كيف ندعو الناس ''ایک طویل دعوتی و تربیتی تجربے کا نچوڑ ہے جو کہ پچھلے پچاس سال سے جاری تحریکی عمل کو بہت قریب سے دیکھنے بلکہ اس میں شریک رہنے والے اس نہایت مخلص اور ہمدرد بزرگ کے قلم سے نکلی ہے، خصوصاً جبکہ یہ مؤلف کی تا حال آخری ترین کتب میں سے ایک ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی مؤلف کے علم اور زندگی میں برکت دے۔

**حامد كمال الدين**

## مقدمہ

# غربتِ ثانیہ تا نشأۃِ ثانیہ

دعوت، یعنی لوگوں کو اللہ کی طرف لانا، اس امت کی دائمی ذمہ داری ہے:

وَلۡتَكُن مِّنكُمۡ أُمَّةٌ يَدۡعُونَ إِلَى ٱلۡخَيۡرِ وَيَأۡمُرُونَ بِٱلۡمَعۡرُوفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ ٱلۡمُنكَرِۚ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُفۡلِحُونَ (آل عمران ۱۰۴)

تم میں سے کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں' بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ یہی ہیں جو کہ فلاح پانے والے ہیں

اس لیے کہ یہ خاتم الرسل ﷺ کی امت ہے، جسے اپنے رسول ﷺ کے بعد آپؐ کی رسالت کو لے کر چلنا ہے۔آپ کی رسالت پوری کی پوری انسانیت کے لیے ہے، ہر وقت اور ہر زمانے کیلئے ہے۔آپؐ کی بعثت سے لے کر رہتی دنیا تک اب ہر انسان اسی رسالت کا مکلّف ہے اور اسی کا مخاطب۔

یہ مشن دو حصوں پر محیط ہے: اس کا ایک حصہ وہ ہے جس کا ہدف وہ لوگ ہیں جو ابھی اس دین پر ایمان نہیں لائے، ان کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دی جائے، اور اس کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کا مخاطب وہ لوگ ہوں گے جو اس پر ایمان لا چکے ہیں تا کہ ان کو اس کی تذکیر اور یاددہانی کرائی جائے اور اس پر ان کا ایمان راسخ کیا جائے۔

وَذَكِّرۡ فَإِنَّ ٱلذِّكۡرَىٰ تَنفَعُ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ (الذاریات ۵۵)

البتہ نصیحت کرتے رہو، کیونکہ نصیحت ایمان والوں کے لیے نافع ہے

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ ءَامِنُواْ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَٱلۡكِتَٰبِ ٱلَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ وَٱلۡكِتَٰبِ ٱلَّذِيٓ أَنزَلَ مِن قَبۡلُۚ وَمَن يَكۡفُرۡ بِٱللَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَكُتُبِهِۦ وَرُسُلِهِۦ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلَٰلَۢا بَعِيدًا (النساء۔۱۳۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ پر اور اسکے رسول پر اور کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس سے پہلے نازل کر چکا ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخرت سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا

مگر آج امت کچھ ایسے حالات سے گزر رہی ہے کہ جن سے شاید امت کو اس سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ آج اسلام کی حقیقت سے آشنائی خود اس امت میں اس درجہ انحطاط کو پہنچ چکی ہے کہ امت کی پوری تاریخ میں مسلمان حقیقتِ اسلام سے اس قدر نابلد کبھی نہ ہوئے تھے۔ یہ دردناک حالت ابھی حقیقتِ اسلام سے خالی ''آگاہی اور واقفیت'' کی ہے، رہی اس حقیقتِ اسلام پر ''عمل پیرائی''، تو اس کی حالت اس سے بھی کہیں ناگفتہ بہ ہے۔

چنانچہ آج فریضۂ دعوت اور اس کا دائرۂ کار، آج سے پہلے کے تمام ادوار کی بہ نسبت، کہیں زیادہ سنگین اہمیت کا حامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب مسلمانوں کے لیے دعوت کی نوعیت محض تذکیر و یاددہانی کی نہیں رہی، بلکہ اب یہ قریب قریب ایک 'تعمیر نو' کا کام ہے۔ ایک عمارت جو بوسیدہ اور جسکی بنیادیں بڑی حد تک کھوکھلی ہو رہی ہیں اسے انہی بنیادوں کو مضبوط کر کے نئے سرے سے اٹھایا جانا ہے۔ جبکہ دوسری جانب صورت حال یہ ہے کہ اقوام عالم اس امت پر ہر طرف سے پل پڑی ہیں جس کی کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی پیشین گوئی فرمائی تھی:

| | |
|---|---|
| يُوشِكُ الْأُمَمُ اَنْ تَدَاعَىٰ عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَىٰ الْاَكْلَةُ اِلَى قَصْعَتِهَا قَالَ قَائِلٌ: " اَمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ يَارَسُوْلَ اللهِ". قَالَ: "بَلْ اَنْتُمْ كَثِيْرُوْنَ وَلَكِنَّ اللهَ يَنْزَعَ فِيْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ وَلَيَقْذِفَنَّ فِي قُلُوْبِكُمُ الْوَهْنَ". فَقَالَ قَائِلٌ: "مَاالْوَهْنُ يَارَسُوْلَ اللهِ". قَالَ: "حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ". | ''عنقریب وہ وقت آئے گا جب اقوام عالم تم پر یوں پل پڑیں گی جیسے بھوکے کھانے کے تھال پر ٹوٹ پڑتے ہیں'' صحابہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول کیا یہ اس وجہ سے ہوگا کہ تب ہم تھوڑے ہونگے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں تعداد میں اس وقت تم بہت زیادہ ہوگے مگر تم خس و خاشاک ہوگے جیسے خس و خاشاک سیلاب کی سطح پر (تیرتے ہیں) اللہ تعالیٰ دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب و دبدبہ ختم کردے گا اور تمہارے دلوں میں کھوکھلا پن (وہن) پیدا کردیگا۔ ایک سائل نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول یہ 'وہن' کیا ہے؟ |
| (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَ أَبُوْ دَاوُدْ) | فرمایا ''دنیا کی چاہت اور موت سے جی چرانا |

ہم سب اس یقین سے سرشار ہیں کہ ان شاء اللہ یہ تعمیرِ نو ہو کر رہنی ہے اور اس عمارت کو اپنی بلندی تک پھر پہنچنا ہے۔ ہمارے دین کی سب پیشین گوئیاں اسلام کے دنیا میں پوری آب و تاب سے لوٹ آنے اور زمین میں تمکین پانے کا پتہ دے رہی ہیں، چاہے وہ جنگ جو جاہلیت اسوقت پوری زمین

میں اسلام کے خلاف روا رکھے ہوئے ہے کتنی بھی وحشت ناک کیوں نہ ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسلام پر آج جو پہلے والی غربت اور اجنبیت کا دور پھر آچکا ہے اس غربت اور اجنبیت کا خاتمہ بلا شبہ ایک پر مشقت اور پر خطر کام ہے۔

بدأا لاسلام غريبا، و سيعود غريبا كما بدأ (اخرجه مسلم) اسلام کی ابتدا تھی تو یہ اجنبی اور نامانوس تھا ۔عنقریب یہ پھر پہلے کی طرح ہی اجنبی اور نامانوس ہو رہے گا

یہ ایک صبر آزما کام ہوگا جس میں ایک جانگسل محنت و جدوجہد درکار ہے تو ایک غیر معمولی بصیرت بھی مطلوب ہے۔

یہ اس لیئے کہ اسلام کو جب پہلی بار غربت اور اجنبیت سے واسطہ پڑا تھا تو کم ازکم لوگ یہ تو جانتے تھے کہ اسلام کیا ہے اور اس کے اصول اور اساس کیا ہیں ۔ایک اللہ پر ایمان لانے کا مطلب کیا ہے، وحی اور نبوت پر ایمان سے کیا مراد ہے اور آخرت پر ایمان کیا معنی رکھتا ہے، لوگ اس بات سے آگاہ تھے چاہے وہ اس نئے دین میں داخل ہونے والے لوگ ہوں چاہے اس کی مخالفت پر کمر بستہ اور اس کی بیخ کنی پر آمادہ لوگ ۔تب اس غربت اور اجنبیت کا سبب بس یہی تھا کہ اس پر ایمان لانے والے دنیا میں مٹھی بھر تھے، کمزور اور ناتواں تھے اور اپنی مادی قوت سے لوگوں پر بھاری نہ پڑ سکتے تھے، جبکہ انکار کرنے والوں سے دنیا بھری ہوئی تھی جو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی اور سرکشی پر ہی بضد تھے۔

چنانچہ جب خدیجہؓ نے ورقہ بن نوفل کو وحی آنے کا واقعہ سنایا تو ورقہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا: کاش جب تمہاری قوم تمہیں نکالے گی تو مجھ میں اس وقت دم خم ہوتا! آپؐ نے کہا: تو کیا یہ مجھے نکال دیں گے؟ ورقہ نے کہا: جو دعوت تم لائے ہو ایسی دعوت لانے والے ہر آدمی کی ہی دنیا دشمن ہو جاتی ہے[1]

اور جب ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں اور آپ نے جواب دیا کہ ''اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں'' تب اس نے کہا یہ ایک ایسی بات ہے کہ عرب آپ کو اس کی اجازت نہیں دیں گے!

---

(1) ملاحظہ ہوں اس موضوع پر کتب سیرت

تاہم اب کی بار یہ جو "غربتِ ثانیہ" ہے...... یہ جس غربت اور اجنبیت کا اسلام کو اب سامنا ہے......تو اس کا معاملہ پہلے سے مختلف ہے، باوجود اس کے کہ اجنبیت بہر حال اجنبیت ہی ہوا کرتی ہے۔

آج معاملہ یہ ہے کہ اسلام خود اہل اسلام کے لیے اجنبی ہے۔ دوسرے لوگوں کے لیے تو یہ جتنا عجیب وغریب ہے وہ ہے ہی، مگر اہل اسلام کا ہی یہ حال ہے کہ جب ان کو آپ اسلام کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں تو وہ بھی تعجب اور حیرت کے اظہار کے ساتھ کہتے ہیں: یہ اسلام تم کہاں سے نکال لائے ہو۔ یہ تو آج تک کبھی ہم نے سنا تک نہیں!

ایک درگاہ کا طواف کرنے والے شخص سے جب آپ یہ کہتے ہیں، جو کہ وہاں تبرک حاصل کرنے اور اس میں برسوں یا صدیوں سے دفن ہوئے انسان سے مرادیں پوری کروانے جاتا ہے: کہ بھائی یہ شرک ہے اور اسلام میں اس کی اجازت نہیں، تو وہ آپ کو تعجب اور حیرت سے تکتا ہے اور اسے یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ 'اسلام' آپ کہاں سے نکال لائے! اس کے خیال میں آپ اسلام کی 'روحانیت' کا ستیاناس کر دینے کے درپے ہیں!

ایک اللہ کی شریعت کی جگہ پر اپنی شریعت چلانے والے یا اللہ کی شریعت کی جگہ پر غیر اللہ کی شریعت کو قبول کرنے والے شخص سے جب آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ شرک ہے تو وہ بھی آپ سے یہی کہتا ہے کہ یہ مسئلہ تم کہاں سے نکال لائے؟ یہ انتہا پسندی ہے، جمود ہے، رجعت پسندی ہے! دنیا ترقی کر چکی ہے! یا کم از کم بھی یہ تو ضرور کہے گا کہ یہ شرك دون شرك ہے، شرك لا يخرج من الملة ہے، یعنی یہ شرک ہے بھی تو ویسا شرک نہیں جسے کرنے سے آدمی ملت سے خارج ہو جاتا ہے!

جب آپ سوشیالوجی کے کسی استاد، یا نفسیات کے کسی پروفیسر، یا کسی ماہر تعلیم یا تاریخ کے پروفیسر سے یہ کہتے ہیں کہ آپ نے مغرب سے جو علوم لیے ہیں اور جو کچھ آپ یہاں طلباء کو پڑھا رہے ہیں یہ اسلام کے مفہومات سے متعارض ہیں بلکہ بعض اوقات تو یہ اسلام کے عقیدہ سے براہ راست اور صریح طور پر متصادم ہوتے ہیں تو بہت تھوڑی تعداد کو چھوڑ کر بیشتر سے آپ کو یہی جواب ملتا ہے کہ اسلام کا ان علوم وفنون سے بھلا کیا واسطہ؟ تم ہر چیز میں اسلام کو گھسیٹ لاتے ہو!؟ یہ سوشل سائنس اور سماجی مطالعہ ہے جبکہ اسلام ایک مذہب ہے، مذہب کو سماجیات سے آخر کیا سروکار!؟

ایسے بے شمار پہلو اور بے شمار امور ہیں.... جن میں آپ لوگوں کو حقیقت اسلام سے آگاہ کرتے ہیں تو وہ حیرت اور پریشانی کا اظہار کرتے ہیں۔ کم از کم تعجب تو ضرور کرتے ہیں کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کو انہیں یہ سمجھانے کے لیے اچھی خاصی جان کھپانا پڑتی ہے کہ وہ اسلام جو اللہ کے ہاں سے آیا ہے دراصل یہی ہے اور جسے وہ غلط فہمی سے 'اسلام' سمجھتے رہے ہیں وہ سرے سے اسلام ہی نہیں!

یہ ناگفتہ بہ حالت ابھی اسلام سے خالی 'واقفیت' کے معاملے میں ہے۔ البتہ یہ کہ وہ اس خالص اسلام پر 'عمل پیرا' بھی ہوتے نظر آئیں تو اس پر آپ کی جتنی محنت ہوگی اور اس پر آپ کو جتنی جان کھپانا پڑے گی وہ تو اس سے بھی کہیں بے اندازہ ہے!

اسلام کی حقیقت سے 'واقفیت' اگر ہو بھی تو ظاہر ہے کہ وہ اکیلی کافی نہیں مگر یہاں صورت حال یہ ہے کہ اہل اسلام کے ہاں حقیقتِ اسلام سے خالی 'واقفیت' بھی نہیں پائی جاتی جو کہ کسی بھی دوسری چیز سے پہلے بہر حال پائی جانا ضروری ہے۔ وحی کا پہلا کلمہ یہی تھا کہ ''پڑھو'' (اِقْــــرَاْ) پھر رسول اللہ ﷺ پر یہ وحی بھی نازل ہوئی ﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (سورہ محمد: ۱۹) کہ 'لا الہ الا اللہ کی حقیقت کا علم حاصل کرو' اور ''علم'' جیسا کہ از روئے فہمِ سلفؒ واضح ہے، خالی جان لینا نہیں بلکہ سلف کے ہاں 'علم' سے مراد ایسا 'جان لینا' ہے جو انسان کو عمل تک اور ایک جیتا جاگتا واقعہ بننے تک پہنچا کر آئے۔ چنانچہ یہ ایک ایسا مشن ہے جو حقیقت اسلام کی آشنائی کرانے سے شروع ہو اور اس کو عملاً رو پذیر کرانے پر ختم۔ ہماری اس وقت کی صورت حال کا اس پہلو سے واضح ہو جانا نہایت ضروری ہے۔

اگر اسلام کی غربت اولیٰ کے دور میں لوگوں کو لا الہ الا اللہ کے معنی و مفہوم سمجھانے اور پڑھانے پر رسول اللہ ﷺ کی شدید ترین محنت صرف ہونا ٹھہر گئی تھی، خاص طور پر مکہ میں تو رسول اللہ ﷺ نے جو محنت اور ریاضت کی وہ یہی تھی کہ وہ لوگ جو اس حق کو قبول کر لیں اور اس پر ایمان لے آئیں ان کی لا الہ الا اللہ کے تقاضوں اور مطالبوں کی بنیاد پر تیاری عمل میں لائیں۔ اسی لا الہ الا اللہ پر ان کی تربیت کریں اور مرحلہ بہ مرحلہ اسی کو ان میں راسخ کر کے اس راستے میں ان کو اپنے پیروں پر کھڑا کریں۔ جس کے لیے سب سے پہلے آپ نے منتخب لوگوں پر مشتمل ایک 'ٹھوس بنیادی جمعیت' کی تربیت کی اور پھر اس کی مدد سے سب لوگوں کی......

اس لا الہ الا اللہ کا مفہوم سمجھانے اور پڑھانے اور اسکی بنیاد پر ایک جماعت کھڑی کرنے پر.. اگر اللہ کے رسولؐ کی بھی اتنی محنت صرف ہوئی تو آج اس غربت ثانیہ کے دور میں بھی دعوت کو ان دو پہلوؤں پر بے انتہا جان کھپانے کی ضرورت ہے، یعنی اسلام کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کرنا اور اس کی بنیاد پر انکی تربیت کرنا۔

اسلام کی حقیقت سے ایسے لوگوں کو آگاہ کرنا جو اسلام کے ایک حصے سے واقف ہیں اور ایک حصے سے ناواقف، مگر سمجھتے یہی ہیں کہ وہ پورے اسلام سے واقف ہیں، ان لوگوں کو اسلام کا مطلب سمجھانا کچھ ایسا آسان کام نہیں۔ نہ ہی اس پر تھوڑی محنت سے گزارا ہوگا۔ پھر اس کی بنیاد پر عملی تربیت کا کام ـــــ خاص کر منتخب عناصر پر مشتمل بنیادی جمعیت کی تربیت کا کام ـــــ اس سے بھی کہیں زیادہ محنت اور ریاضت کا متقاضی ہے۔ کیونکہ یہ تربیت ایک نہیں متعدد پہلوؤں اور میدانوں میں کی جانا مطلوب ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ انسانی نفس کو اپنے معمولات و مانوسات سے ہٹا لینا اور 'جو آج تک ہوتا آیا' سے برگشتہ کر کے بالکل ایک نئی راہ پر ڈال دینا آسان کام نہیں۔ اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ نفوس ہر ہر مطالبے پر فوری عملدرآمد کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ پھر جبکہ صرف یہی نہیں کرنا کہ مومن نفس تیار کرنے ہیں بلکہ بنیادی جمعیت کی حد تک ایسی غیر معمولی اور سربرآوردہ شخصیات کی تیاری بھی مطلوب ہے جو ایک انتہائی غیر معمولی ذمہ داری کا بوجھ بطریق احسن اٹھا سکیں۔

یہ جاننا انتہائی اہم ہے کہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کا کام کیونکر کیا جائے۔ آج جس بحران سے عالم اسلام گزر رہا ہے، ایک شدید اور سنگین بحران ہے بلکہ شاید عالم اسلام کو اپنی تاریخ میں پیش آنے والے بحرانوں میں یہ شدید ترین بحران ہے۔ پھر اسلام کو جڑ سے اٹھا کر پھینک دینے کے لیے جس طرح دشمن آج اکٹھے ہوئے ہیں شاید اتنے بڑے پیمانے پر اور اس قدر شدت سے دنیا آج تک اسلام کے خلاف کبھی اکٹھی نہیں ہوئی۔ جبکہ انسانیت کو اسلام کی ضرورت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ اس وقت تھی جب یہ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا تھا۔

جب تک ہم دعوت کے راستے میں پوری بصیرت اور دانائی سے قدم اٹھانے کے قابل نہیں ہوتے اور جب تک اس راستے میں ہم وثوق اور پختگی کے ساتھ آگے بڑھنے کی صلاحیت حاصل نہیں کر پاتے، تب تک ہوسکتا ہے ہم اپنے اصل ہدف تک پہنچنے میں کامیابی سے محروم رہیں بلکہ ہوسکتا ہے

ہماری بہت سی جدوجہد اور محنت بھی نتیجہ خیز ہونے کی بجائے اِدھر اُدھر صرف ہوتی رہے۔

'دعوت' کا موضوع ایک بڑے عرصے سے میری سوچوں پر حاوی رہا ہے اور یہ سوال بار بار میرے ذہن میں آتا رہا ہے کہ معاشرے میں دعوت کا طریق کار کیا ہونا چاہیے؟ اور دعوت کے لیے کیا انداز اختیار کیا جائے؟ خاص طور پر جبکہ میں دعوت کے لیے ہونے والے حالیہ عمل پر نظر ڈالتا ہوں تو کہیں کسی پہلو میں کمیاں کوتاہیاں نظر آتی ہیں تو کسی جانب جلد بازی اور کسی جانب انحراف۔ میں یہ سارا عرصہ سوچتا رہا ہوں کہ پچھلی نصف صدی سے دعوت کے لیے کئے جانے والے کام کا ایک بھرپور جائزہ لیا جائے تا کہ ہمارے اس دعوتی سفر میں رہ جانے والی کوتاہیوں کی تلافی ہو اور اگر ہم کہیں غلطیوں کا شکار ہوئے ہیں تو دعوتی عمل میں ان کو بار بار نہ دہرایا جائے۔ حال کو درست کرنے کے لیے ماضی سے سبق لینا اور اچھے مستقبل کے لیے حال کو درست کرنا شدید طور پر مطلوب ہے۔ یہ ایک سنجیدہ اور ناگزیر فرض ہے اور داعیوں کو اپنے سفر کے کسی مرحلہ میں بھی اس سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔

ان صفحات میں، میں اپنے وہ خیالات اور افکار پیش کر رہا ہوں جو اس عرصہ کے دوران دعوت کی بابت، میرے ذہن میں آتے رہے۔ یہ بہر حال ایک اجتہاد ہے جس میں صحیح اور غلط دونوں کی گنجائش ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مجھے درست بات کی توفیق دے.. ﴿اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ﴾[1]

**محمد قطب**

---

(۱) ھود:۸۸

## کچھ اہم اسباق

# اسلام کی پہلی کھیپ کیونکر برآمد ہوئی؟

اسلام کی پہلی کھیپ جو صحابہؓ کی صورت پردۂ تاریخ پر جلوہ گر ہوئی، اس کی پیدائش اور افزائش کے بارے میں طویل غور و خوض کرنا آج ہماری شدید ضرورت ہے۔ کیونکہ اس میں ہر ایسے شخص کے لیے کامیابی سے آگے بڑھنے کا پورا سامان ہے جو دعوت کا فریضہ انجام دینے کا آرزومند ہو، یا اِس دین کو لے کر دنیائے واقع میں تبدیلی لانے کی خواہش رکھتا ہو۔ کیونکہ اسلام کی وہ پہلی کھیپ اللہ تعالی کی خاص نگرانی میں تیار کی گئی تھی، جیسا کہ اللہ تعالی نے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِىْ﴾ (طٰہٰ:۳۹)

اسی طرح اس نسل نے بھی تاریخِ انسانی کے عظیم ترین مربی محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں پرورش پائی۔ پھر کیوں نہ ہوتا کہ یہ کھیپ بھی تاریخِ انسانی میں منفرد ترین قرار پائے۔ جسے اللہ تعالی اپنی وحی کے ذریعے چلا رہا تھا اور محمد رسول اللہ ﷺ اپنی تربیت اور رہنمائی کے ذریعے! نتیجۂ کار صحابہؓ کی اس نسل کو اپنی افزائش اور نشو و نما کے لیے تمام تر اعلی امکانات اپنی اعلی ترین صورت اور بہترین انداز میں حاصل تھے، چنانچہ امت کی تاریخ میں یہ ایک Model Lesson (نمونے کا سبق) کی حیثیت حاصل کر گیا جو کہ اساتذہ کی تربیت کرنے والا استاد اپنے طالب علم اساتذہ کو دکھانے کے لئے دیا کرتا ہے کہ وہ دیکھیں کہ سبق کیسے دیا جاتا ہے اور یہ جانیں کہ جب ان کو سبق دینا پڑے گا تو وہ کیونکر دیں گے۔

پھر اللہ کی مشیت کو یہ تقاضا بھی ہوا کہ اس دین کا کام اللہ کے بنائے ہوئے طبعی قوانین کے مطابق پایۂ تکمیل کو پہنچے نہ کہ خرقِ عادت امور کے ذریعے، جو کہ اس کی حکمت کا بھی تقاضا تھا۔ تا کہ آئندہ آنے والی نسلوں میں سے کوئی بے ہمتی دکھانے کے لئے یہ نہ کہہ سکے کہ اسلام کی پہلی نسل کی نصرت تو خرقِ عادت واقعات ہی کے ذریعے ہوتی رہی اب رسول اللہ ﷺ کے بعد خرقِ عادت واقعات اور

## معجزات کا سلسلہ کیونکر چلے!

چنانچہ اس دین میں اگر کوئی غیر بشری عنصر تھا تو وہ صرف وحی تھی جو اللہ کے پاس سے نازل ہوتی تھی۔ جبکہ وہ اب بھی باقی اور محفوظ ہے اور اس کی حفاظت خود اللہ ہی کے ذمہ ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر۔۹) رہا یہ ذکر، تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں

یہ وحی جیسے اسلام کے پہلے دور کو حاصل تھی ویسے ہی آخری دور کو بھی حاصل ہے۔ یہ اللہ کے احکامات ہیں جو اس امت کے لیے اور پوری انسانیت کے لیئے اتارے گئے ہیں اور جن میں اس دین کی حقیقت سمو دی گئی ہے اور اس ربانی منہج اور خدائی مشن کو واضح کر دیا گیا ہے جو اللہ کو انسانوں سے مطلوب ہے کہ وہ رہتی دنیا تک اور قیامت آنے تک اپنی زندگی کو اب اسی پر استوار کریں اور اپنے وجود کی پوری بنیاد اسی پر قائم کریں۔ یہ وحی چاہے وہ کتاب ہو جو اللہ کے پاس سے لفظ بلفظ اتری اور چاہے وہ 'بیان' ہو جو رسول اللہ ﷺ نے اس کتاب کی وضاحت میں سنت قولی یا عملی کے ذریعے فرمایا۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (النحل۔۴۴) اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح وتوضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیئے اتاری گئی ہے اور تاکہ لوگ (خود بھی) غور وفکر کریں

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم:۳۔۴) وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا، یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے

رہا بدر میں فرشتوں کا اترنا اور مومنوں کے ساتھ شامل جنگ ہونا تو یہ فی ذاتہ ایسی خرق عادت بات نہیں۔

کیونکہ فرشتوں کا اترنا اور انسانوں کو ثابت قدم کرنا کچھ معرکۂ بدر پر موقوف نہیں۔ مومنوں کے لیے یہ واقعہ اللہ کے حکم سے کسی بھی موقعہ پر رونما ہو سکتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۔ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (حم السجدہ۔۳۰۔۳۱) جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ نہ ڈرو، نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی، وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہوگی، یہ ہے سامانِ ضیافت اس ہستی کی طرف سے جو غفور ورحیم ہے

ہاں اس میں اگر کوئی خاص خرق عادت بات تھی تو وہ بدر میں مومنوں کا فرشتوں کو اپنے ساتھ قتال کرتے ہوئے دیکھنا تھا۔

وَمَا جَعَلَهُ اللهُ اِلَّا بُشْرٰی لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (آل عمران۔۱۲۶)

یہ بات اللہ نے تمہیں اس لیے بتادی ہے کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی قوت والا اور دانا و بینا ہے

چنانچہ یہ امتیاز ضرور تھا جو اللہ تعالی نے باقی مومنوں کی نسبت صرف اہل بدر کو عطا فرمایا مگر بات یہ بھی ہے کہ بدر دراصل کائنات کا ایک ایسا واقعہ تھا جو روز روز دہرایا جانے والا نہیں۔ یہ ﴿يَوْمُ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ﴾ (الانفال۔۴۱) تھا۔ یہ ایک تاریخ ساز دن تھا۔ بہت تھوڑے دن ایسے ہوتے ہیں کہ ایک ہی دن میں پوری تاریخ لکھ ڈالی جائے ورنہ عام طور پر تو تاریخ تھوڑی تھوڑی کر کے ہی لکھی جاتی ہے!

چنانچہ سوائے اس ایک خرق عادت واقعے کے جو اہل بدر کا امتیاز ٹھہرا، اور سوائے رسول اللہ ﷺ کے شخصی وجود کے، اسلام کے سب کے سب مراحل طبعی و دائمی قوانین کے مطابق طے ہوئے، چاہے وہ ابتدا میں استضعاف اور ناتوانی کا مرحلہ ہو، یا ابتلاء اور صبر و آزمائش کا مرحلہ یا پھر وہ تمکین جو قوت و استقرار اور شوکت و بے پروائی کے ساتھ ملی اور پھر آخر میں اسلام کا دنیا بھر میں پھیل جانا... یہ سب کچھ طبعی انداز سے ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح دور اول میں اسلام کی بنیاد پر ایک نسل تیار کی گئی اس سے حاصل ہونے والے اسباق مستقل اور دائمی ہیں۔ یہ اسباق صرف ایک بار کے لئے نہیں بلکہ یہ ہر بار دہرائے جانے کے لائق ہیں اور اس سے ملتی جلتی ہر صورت حال میں قابل عمل۔ کیونکہ یہ اللہ کے طبعی قوانین کا نتیجہ تھے نہ کہ وہ خاص خرقِ عادت واقعات جو بس ایک بار گزر جائیں تو پھر کبھی نہیں دہرائے جاسکتے۔

چنانچہ جہاں اللہ تعالی نے خود اپنی نازل کردہ کتاب میں ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ تعالی کے جاری کئے ہوئے قوانین انسانی دنیا میں کس انداز سے رو پذیر ہوئے ہیں... جب ایسا ہے تو پھر یہ حق بنتا ہے کہ ہم اسلام کے دورِ اول کے مطالعہ اور اس پر غور و خوض پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر دیں۔ اس سے نتائج اور اسباق کشید کریں اور خود اپنی دعوتی زندگی میں ہم جو اقدام بھی کریں اس میں یہ ہمارے لئے مشعلِ راہ ہو اور یہ جانچنے کے لیے کسوٹی بھی کہ آیا ہم سیدھے راستے پر استقامت کے ساتھ چل رہے ہیں یا کہیں انحراف کا شکار ہو گئے ہیں۔

اسلام کے دوراول میں جس طرح ایک پوری نسل کی پیدائش اورافزائش ہوئی،اس پرغوروخوض نے مجھے کئی اہم حقائق کے سامنے لاکھڑا کیا ہے۔پھران حقائق پرسوچ وبچار کرنے کی تب مجھے اور بھی زیادہ ضرورت محسوس ہوئی جب مختلف مواقع پر میں یہ ملاحظہ کرتا رہا کہ ہمارا حالیہ دعوتی سفر کتنے ہی پہلوؤں سے ان تقاضوں کے ساتھ میل نہیں رکھتا جو دوراول کے بارے میں غوروخوض کرنے سے ذہن میں آتے ہیں۔اور پھر جب ان تقاضوں کو اپنے اس دور میں پورا نہ کئے جانے کے طبعی نتائج اور مضمرات بھی گاہے بگاہے میرے سامنے آجاتے رہے تو اس امر کی ضرورت اور بھی شدت سے محسوس ہوتی رہی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے دوراول کے جائزہ اور حال سے اس کے موازنہ کے یہ نتائج ان صفحات میں قاری کے سامنے رکھ دوں،اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالی ہمیں غلطیوں سے محفوظ رکھے اور سیدھے راستے کی راہنمائی فرمائے۔

اسلام کے دوراول میں دعوتی سفر کا آغاز ہوا تو اس کی بابت ایک حقیقت جو پوری شدت سے سامنے آتی ہے وہ مومنوں کے لیے مکہ میں تربیتی مرحلے کے دوران ہاتھ روک رکھنے کا خدائی حکم ہے۔ان کو حکم ہوتا ہے کہ تمام تر اذیت کو وہ صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہیں اس آیت میں اللہ تعالی نے اسی حکم کی جانب اشارہ فرمایا ہے:

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ قِیۡلَ لَہُمۡ کُفُّوۡۤا اَیۡدِیَکُمۡ وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیۡہِمُ الۡقِتَالُ اِذَا فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ یَخۡشَوۡنَ النَّاسَ کَخَشۡیَۃِ اللّٰہِ اَوۡ اَشَدَّ خَشۡیَۃً وَقَالُوۡا رَبَّنَا لِمَ کَتَبۡتَ عَلَیۡنَا الۡقِتَالَ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنَاۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ قُلۡ مَتَاعُ الدُّنۡیَا قَلِیۡلٌ وَالۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لِّمَنِ اتَّقٰیقف وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا (النساء۔۷۷)

تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دو؟ اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہیے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر۔کہتے ہیں خدایا! یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟ ان سے کہو دنیا کا سرمایۂ زندگی تھوڑا ہے اور آخرت ایک خداترس انسان کے لیے زیادہ بہتر ہے

جب ظلم واذیت اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو صحابہ کرامؓ میں سے بعض نے رسول اللہﷺ سے کہا بھی کہ کیوں نہ ہم ان سے بھڑ جائیں،تب آپ نے فرمایا: **ما أمرنا بقتالهم** ''ہمیں ان سے لڑائی کرنے کا حکم نہیں ہے''[1]

---

۱) ملاحظہ ہوں اس موضوع پر کتب سیرت

کتاب اور سنت کی نصوص میں یہ بیان نہیں ہوا کہ اس حکم الٰہی کی حکمت کیا تھی۔ چنانچہ اس کی حکمت دریافت کرنا ہمارے اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا۔ اب جہاں تک اس کی حکمت دریافت کرنے کا معاملہ ہے تو غالباً اس کا آسان ترین طریقہ یہی ہے کہ ذرا کچھ دیر کے لیے یہ فرض کر لیا جائے کہ اس مرحلے میں مومنوں اور قریش کے درمیان واقعتاً لڑائی ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں بھلا اس کے کیا نتائج متوقع ہوتے؟ اس مفروضے پر سوچ بچار کرنے کے بعد ہمیں یہ جانچنے میں آسانی رہے گی کہ ان مومنوں کو اسوقت ہاتھ روک رکھنے اور کسی معرکہ آرائی سے گریز کیئے رہنے کے کیا کیا فوائد ہوئے۔

اہل ایمان اور قریش میں اگر اس وقت کوئی معرکہ رو پذیر ہو جاتا تو یہ تصور کرنا کوئی مشکل نہیں کہ ایسی حالت میں جب اہل ایمان ابھی معدودے چند اور ضعیف و ناتواں تھے، ان کو صفحۂ ہستی سے ختم کر دینا قریش کے لیئے آسان ہوتا۔ چنانچہ اس بالکل نئی اور منفرد دعوت کا کام کسی ایک ہی معرکے یا چند پے در پے معرکوں میں تمام ہو جاتا، جبکہ اس نئی دعوت نے ابھی پھلنے پھولنے کا کوئی بھی موقع نہ پایا ہوتا۔ لوگوں تک اس دعوت کی حقیقت بھی ابھی نہ پہنچی ہوتی اور نہ یہ آس پاس کے انسانوں تک رسائی حاصل کر پاتی۔

پھر چلیں یہ فرض کر لیں کہ اس معرکے میں ____ جو ابھی کسی صورت بھی برابر کا معرکہ نہ ہوتا ____ اس معرکے میں مسلمانوں کا وجود ختم نہ بھی ہوتا تب بھی ایک اور معاملہ اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے اور موجودہ دور کے واقعات کی روشنی میں یہ ہماری توجہ کا بطور خاص حق بھی رکھتا ہے۔

اس ابتدائی مرحلے میں بھلا اہل ایمان کی پوزیشن کیا تھی؟ ایک عام دیکھنے والے کی نظر میں اہل ایمان کی پوزیشن یہی تھی کہ وہ 'اقتدار کا حق رکھنے والوں' کے خلاف آمادۂ بغاوت ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اقتدار کا حق رکھنے والے کا یہ حق بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے خلاف ہونے والی مسلح بغاوت کی سرکوبی کر سکے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کی سرکوبی میں قریش نے وحشت اور بربریت کی حد کر دی تھی حتیٰ کہ معاشرے میں کچھ لوگ اس ظلم و وحشت کی وجہ سے مسلمانوں پر ترس کے مارے ان کو بعض اوقات اپنی پناہ اور امان تک دینے لگے تھے۔ لیکن پھر بھی لوگوں کی نظر میں ابھی اصولی طور پر قریش ہی اقتدار کا جواز رکھے ہوئے تھے، مومنوں کی پوزیشن ابھی یہی تھی کہ یہ اپنے بڑوں یعنی ایک صاحب اقتدار کے کہنے میں نہیں اور صاحب اقتدار کا یہ حق بھی ابھی مسلم تھا کہ وہ اپنے باغیوں کی گوشمالی کرے!

تو کیا ابھی جبکہ لوگوں کا تاثر یہی تھا اور دیکھنے والوں کی نظر قریش اور اہل ایمان کے تعلق کو ابھی اسی حوالے سے دیکھ رہی تھی کیا یہ دعوت کے فائدے میں ہوتا کہ عین اسی حالت میں اہل ایمان قریش کے ساتھ جنگ آزمائی کرتے!؟

صاف ظاہر ہے کہ نہیں!

اب دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اہل ایمان نے اللہ کے حکم پر ہاتھ روک رکھ کر کیا نتائج حاصل کئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس عمل سے بے شمار پہلوؤں پر زبردست پیش رفت ہوئی۔ ایک ایسا ماحول جہاں کوئی باعزت شخص سر اٹھا کر چلنے کے سوا چلنا ہی نہیں جانتا، جس ماحول میں جنگوں کا لامتناہی سلسلہ محض ایسی باتوں پر چل نکلتا ہے جنہیں آج ہم بالکل معمولی باتیں سمجھتے ہیں اور خون کا ایک قطرہ بہانے تک کے قابل نہیں جانتے مگر اس دور میں ان 'معمولی باتوں' پر جنگیں ہوتیں تو برسوں اور پشتوں تک تھمنے کا نام نہ لیتیں اور ان جنگوں کی آگ میں بے شمار خلقت جل جاتی، مثال کے طور پر داحس وغبراء کی جنگ[1]...... ایک ایسے ماحول میں جہاں ایک آدمی اپنی معمولی سی اہانت ہو جانے پر تلوار نکال لینا اپنا فرض جانتا۔

چنانچہ ایک ایسے ماحول میں انتہائی اعلیٰ حسب ونسب رکھنے والے لوگ ظلم واذیت کا شکار ہوتے ہیں، بلکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خاص شرفاءِ قریش میں سے ہیں، مگر وہ جواب میں ہاتھ تک نہیں اٹھاتے! یہ صرف تعجب ہی نہیں غور کرنے کی بات بھی تھی! کیونکہ یہ عرف اور ماحول سے یکسر مختلف بات تھی۔

دوسرے لفظوں میں یہ 'ماحول' کی پیدا کردہ چیز نہ تھی بلکہ معمول سے ماوراء تھی۔ ہر آدمی کے لیے یہ ایک سوال تھا کہ یہ ماحول سے یکسر مختلف چیز کیونکر ہو گئی!

---

۱) جاہلی دور کے اواخر میں پیش آنے والا ایک قبائلی جنگی سلسلہ، جو دو عرب قبیلوں عبس اور ذبیان کے مابین شروع ہوا اور اس کی ابتدا محض دو گھوڑوں کی دوڑ پر پیدا ہونے والے تنازعے سے ہوئی۔ ایک گھوڑے کا نام داحس تھا اور دوسرے کا غبراء۔ مختلف عرب قبیلے طرفین کے حلیف درحلیف بنتے گئے۔ کئی عشرے جنگ جاری رہی اور ایک خلقِ کثیر اس کے اندر کام آئی۔ بڑی مشکلوں سے کچھ لوگ بیچ میں پڑ کر اس کو ختم کرانے میں کامیاب ہوئے

پھر ظلم بڑھتا ہے.... برابر بڑھے چلا جاتا ہے اور ادھر اسی طرح صبر جاری ہے! یہ بالکل ایک نئی بات تھی جو آج تک کسی کے دیکھنے میں آئی اور نہ سننے میں! یہ کوئی 'ماحول' سے بلند و بالا چیز ہے جو ماحول سے متاثر ہونا نہیں جانتی! آخر یہ لوگ کس مقصد کیلیئے اپنے اوپر ہونے والا یہ سب ظلم اور اذیت ہنسی خوشی سہے جا رہے ہیں مگر پھر بھی اسی بات پر اڑے ہوئے ہیں جو ان کو اس ظلم اور اذیت میں دھکیل دینے کا سبب بن رہی ہے!؟ کیا یہ قبیلے کا شرف و اعزاز اپنے پاس رکھنے کی ضد ہے؟ کیا دنیا کے کسی مرتبے اور مقام کو پانے کی اڑی ہے؟ کیا یہ دنیا کی کسی خواہش یا آرزو کی تکمیل پر اصرار ہے؟

ایسی کوئی بھی بات نہیں!!! دیکھنے والوں کی نظر سے بدستور پردے ہٹ رہے تھے ان کو صورت حال آہستہ آہستہ سمجھ آرہی تھی.. اچھا تو یہ کوئی عقیدہ ہے جو ان کے قلب و ذہن میں اتر چکا ہے اور یہ اس کی خاطر سب کچھ سہہ رہے ہیں!

ایسے ماحول میں یہ تو سمجھا جا سکتا تھا کہ عقیدہ کوئی رسم ورواج قسم کی چیز ہوگی جس سے آدمی چمٹ رہے یا حتیٰ کہ اسکی خاطر آمادۂ جنگ بھی ہو جائے مگر اس کی خاطر ظلم و اذیت سہے اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دے، یہ بالکل ایک نئی بات تھی۔ رسم ورواج کے لیئے بھی کوئی اس طرح ظلم تو نہیں سہتا!

پھر ذرا اور آگے چلیں تو ایک اور نئی بات سامنے آتی ہے۔

یہ اذیت اس قدر شدت اختیار کرتی ہے کہ نوبت معاشی اور سماجی بائیکاٹ تک جا پہنچتی ہے۔ بھوک سے مار دینے تک معاملہ جا پہنچتا ہے بلکہ بعض لوگوں کو تو اس راہ میں موت بھی گلے لگانا پڑتی ہے مگر وہ اس عقیدہ سے ہٹنے کا نام نہیں لیتے!

اس ماحول میں ______ بلکہ عام طور پر کسی بھی انسانی عرف میں ______ یہ ممکن نہیں کہ لوگ کسی باطل کے لیئے ایسا ایسا ظلم سہہ لیں۔ ہو نہ ہو یہ کوئی حق ہے جو ان انسانوں کے دلوں میں گھر کر گیا ہے اور جس کی خاطر اب یہ سب تکلیف سہنے اور موت قبول کرنے کے لیئے تیار ہیں۔ بلکہ یہ حق ایسا ہے جو ان لوگوں کی نظر میں اپنے امن وسکون، آرام وچین، اپنے مرتبہ ومقام اور حتیٰ کہ اپنے آپ اور اپنی زندگی سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ دیکھنے والوں کے لیئے صورت حال بہت دھیمی رفتار سے واضح ہوتی جا رہی تھی۔

یہ سب حقائق جو کفوا أیدیکم (ہاتھ روکے رہو) کی بدولت وجود پا رہے تھے۔ اگرچہ مکہ میں موجود صورت حال کو بہت بہتر نہ بنا سکے مگر یہی حقائق بالآخر اس بات کا سبب بنے کہ مدینہ ایسی دور افتادہ بستی سے انصار اس دین کی مدد کو پہنچے!

گویا مختصر الفاظ میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اہل مکہ نے جس آگ کی تپش سہی اہل مدینہ نے بعد میں جا کر اسی آگ سے روشنی پائی اور اسی کی بدولت ان کو بارگاہ الٰہی سے ہدایت حق نصیب ہوئی!

صرف یہی نہیں جو "کفوا أیدیکم" (اپنے ہاتھ روکے رہو) کی بدولت انصار پر واضح ہوا... یہاں سے ایک اور مسئلے کی بھی گرہ کھلتی ہے اور جو کہ دعوتی عمل میں بے انتہا اہمیت رکھتا ہے۔ یہ 'جوازِ اقتدار' کا مسئلہ ہے۔

سورۃ الانعام میں، جو کہ ایک مکی سورت ہے، اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَ لِتَسْتَبِیْنَ سَبِیْلُ الْمُجْرِمِیْنَ﴾ (الانعام۔۵۵) "اور اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں تاکہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے"۔

گویا مطلب یہ ہوا کہ: ہم آیات کو کھول کھول کر واضح کرتے رہیں گے جب تک کہ مجرموں کا راستہ واضح نہ ہو جائے۔

اس حقیقت کا ایک مکی سورت میں وارد ہونا ایک واضح معنی رکھتا ہے یا یوں کہیے کہ یہ معنی ہر شخص پر واضح ہونا چاہیے۔ سو مجرموں کے راستے (سبیل المجرمین) کو واضح کر دینا قرآن کا ایک باقاعدہ ہدف ہے جو آیت میں مذکورہ لام التعلیل (ولتستبین) سے ظاہر ہے۔ پھر اس آیت کا مکی دور میں نازل ہونا یہی معنی رکھتا ہے کہ مجرموں کے راستے کو واضح کرنا اور مجرموں کی حقیقت سے نقاب کشائی دعوت کے باقاعدہ اہداف میں سے ایک ہدف ہے بلکہ دعوت کے اس ابتدائی دور کے لوازمات میں باقاعدہ طور پر شامل ہے جب ایک جماعت مسلمہ وجود پانے کے مرحلے سے گزر رہی ہوتی ہے۔

سبیل المجرمین کی وضاحت اور مجرموں کی حقیقت سے نقاب کشائی دعوت کے راستے میں کیونکر مدد و معاون بنتی ہے؟

سبیل المجرمین کے آشکار ہو جانے کا مطلب دو واضح باتیں ہیں: پہلی یہ کہ مجرم کون لوگ ہیں؟ اور دوسری یہ کہ ان مجرموں کا اختیار کردہ راستہ کیا ہے جسے اختیار کرنے سے وہ مجرم کہلانے کے

لائق ہوئے ہیں؟

تو پھر مجرم کون ہیں؟ اور ان کا طریق کار کیا ہے؟ اور آیات کے کھول کھول کر واضح کرنے کا مجرموں کی راہ کو آشکار کرنے سے کیا تعلق ہے؟

معاملہ یہ تھا کہ قرآنی آیات نے الوہیت کا مسئلہ سب سے زیادہ کھول کر واضح کیا۔ یہ وہ سب سے پہلا اور سب سے بڑا مسئلہ ہے جو پورے قرآن کا موضوع بنا اور خاص طور پر مکی سورتوں کا موضوع رہا۔ ان آیات نے کھول کھول کر یہ بیان کیا کہ وہی ایک الہ بندگی کے لائق ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہوسکتا، نہ تخلیق میں، نہ تدبیر میں اور نہ کسی چھوٹے یا بڑے معاملے میں۔ یہ آیات اس الٰہِ واحد کی صفات بتانے کے لیے پے در پے اترتی رہیں، اسکے شریکوں کی بار بار نفی کرتی رہیں تا آنکہ الوہیت کا یہ مسئلہ انتہائی واضح اور جلی کر دیا گیا حتیٰ کہ یہ ایمان لانے والوں کے لیے ہی واضح نہ تھا بلکہ کفر کرنے والوں کے لیے بھی پوری طرح واضح تھا۔ یہاں تک کہ کفار پوری طرح جان گئے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا ان سے کیا مطالبہ ہے اور آپ ان سے کس چیز پر ایمان لانے کا تقاضا کر رہے ہیں تا آنکہ خود انہوں نے، بروایتِ قرآن، یہ کہہ دیا:

اَجَعَلَ الْاٰلِہَۃَ اِلٰـھًا وَّاحِدًا اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (ص۔۵) — کیا اس (نبیؐ) نے سب خداؤں کا ایک ہی خدا کر دیا یہ تو کتنی انہونی بات ہے

یہ واضح کر دینے کے بعد کہ وہ "الہ واحد تنہا لائق بندگی ہے" لوگوں کے سامنے یہ مطالبہ رکھا گیا کہ وہ اللہ کی بلا شرکت غیرے بندگی کریں کیونکہ انکی یہ بندگی صرف ایک اسی کا حق ہے، نیز یہ کہ وہ اس کے ساتھ جن جھوٹے خداؤں کا دم بھرتے ہیں ان کو اب ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں اب وہ صرف اس شریعت کی پیروی کریں جو ان کے لیے ان کے رب کی جانب سے اتاری گئی اور اپنے سب قانون ساز خداؤں کی اتباع ترک کر دیں۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ (الاعراف۔۳) — لوگو جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو

چنانچہ اس مطالبے کی بنا پر لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک وہ فریق جو اس بات پر ایمان لے آیا کہ وہ الہ واحد تنہا لائقِ بندگی ہے معاً وہ اللہ کی بلا شرکت غیرے بندگی کرنے لگے اور اپنے رب کی جانب سے اتر آنے والی شریعت پر کار بند ہوگئے اور دوسرا مجرموں کا فریق جو اس پر ایمان لانے سے انکاری ہوا اور اس بات پر آمادہ نہ ہوا کہ وہ تنہا اللہ کی عبادت کرنے لگے اور ایک اسی کی اتاری ہوئی

شریعت پر کاربند ہو جائے۔

چنانچہ انسانی گروہوں کی یہ تقسیم جو شرعاً مطلوب تھی جب پوری طرح عمل میں آ گئی تو بھلا اب قریش کی پوزیشن کیا تھی؟

آیات کے ''کھول کھول کر'' بیان کئے جانے سے پہلے قریش اپنی قوم کے معتبر اور بزرگ تھے اور اس ناطے سے صاحبِ اختیار و اقتدار بھی۔ اور جہاں تک اہل ایمان کا تعلق تھا تو قریش کی نظر میں، بلکہ عام لوگوں تک کی نظر میں، وہ اس 'صاحبِ اختیار' کے خلاف بغاوت کرنے والے تھے۔ مگر آیات کے ''کھول کھول کر'' بیان کر دیے جانے کے بعد اور قریش کی جانب سے اس بات کا پے در پے انکار ہو جانے کے بعد کہ وہ الٰہ واحد پر ایمان کی صورت میں اللہ کی تنہا بندگی اور اس کی شریعت کی اتباع کرنے لگیں...آیات یوں کھول کھول کے بیان ہو جانے اور قریش کی جانب سے مسلسل انکار ہوتے رہنے کے بعد بھلا اب کیا صورتحال تھی؟ کیا اب بھی قریش ویسا ہی جوازِ اقتدار رکھتے تھے؟ اور کیا اہل ایمان الگ تھلگ راستہ اور ایک بالکل نئی قیادت کی اتباع کرنے کی بنیاد پر کیا اب بھی ویسے ہی باغی قرار دیئے جاسکتے تھے جو آیات ''کھول کھول کر'' بیان نہ کئے جاسکنے کی صورت میں قرار پاتے؟ یا صورتحال اب کم از کم منصف مزاج لوگوں کے دیکھنے کی حد تک بدل چکی تھی؟ ظاہری بات ہے کہ اب معاملہ بالکل ایک نئی صورت اختیار کر چکا تھا۔ قریش جیسے مانے تانے صاحبِ اختیار، اب مجرم بن چکے تھے اور ہاتھ اٹھانے کا حق اب اہل ایمان کو حاصل ہو چلا تھا!

دعوت کے سفر میں یہ ایک بہت بڑی تبدیلی تھی اور ہر حال میں مطلوب۔ یعنی یہ کہ دیکھنے والے لوگ بھی یہ جاننے لگیں کہ مجرم دراصل کون ہے اور ان کا طریق کار اور ان کے کرتوت کیا ہیں، پھر دوسری جانب وہ یہ بھی دیکھ لیں کہ حق پر کون کھڑا ہے اور حق کا راستہ کونسا ہے۔

قریش کا معاملہ خصوصاً عام 'صاحبِ اختیار' لوگوں سے بڑھ کر تھا۔ ان کے بارے میں لوگ اس وجہ سے بھی اشکال کا شکار تھے کہ قریش بیت اللہ کے رکھوالے تھے جس کی عرب حد سے زیادہ تعظیم کرتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ قریش ہی اس وقت صاحبِ ثروت اور جاہ و حشمت کے مالک تھے اور عربوں میں سب سے اونچا حسب و نسب بھی انہی کا سمجھا جاتا تھا۔

چنانچہ جاہلی پیمانوں کی رو سے قریش کو سب اعزاز حاصل تھے جو انہیں جوازِ اقتدار فراہم کئے رکھنے کیلئے کافی ہوں۔ پھر وہ اس تحریف شدہ دین کے بچے کھچے حصے کے علمبردار بھی تھے جسے وہ فخر سے ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام سے منسوب کیا کرتے تھے۔ اتنے اعزازات کے ہوتے ہوئے قریش کے ہاتھ سے ''اختیارات کا جواز'' چھین لینا ہرگز کوئی آسان کام یا دنوں میں طے پا جانے والا عمل نہ تھا۔ خاص طور پر جبکہ یہ مٹھی بھر لوگ جو ان 'جائز اختیارات کے مالک' کے کہے سے باہر ہوئے دیکھے جا رہے تھے، وہ کمزور و ناتواں تھے جن کے پاس کوئی بڑی قوت تھی اور نہ سوائے اللہ کے کسی اور بڑی طاقت کی پشت پناہی۔

ایسی صورت حال میں صرف اور صرف صحیح عقیدہ کی دعوت اور اس پر ڈٹ رہنا ہی وہ چیز تھی جو قریش کے پاس اختیار کا جواز نہ رہنے دے اور ان کو پوری طرح بے نقاب کر دے تا کہ دیکھنے والے جان لیں کہ دراصل یہ اختیار رکھنے کے حقدار نہیں بلکہ مجرم ہیں اور الٰہِ واحد پر ایمان لانے سے انکاری اور تنہا اس کی بندگی کرنے اور اسکی شریعت پر چلنے سے منکر۔

یہاں اب ہم یہ سوال کر سکتے ہیں کہ مکہ میں اہل ایمان اگر کہیں اسی مرحلہ میں قریش سے معرکہ آرائی کر لیتے تو کیا تب بھی یہ ممکن تھا کہ **سبیل المجرمین** اس انداز سے واضح ہو جاتا؟ اس وقت اگر وہ کوئی معرکہ چھیڑ لیتے جبکہ لوگوں کے ذہن پر ابھی قریش ہی کے مرتبے اور بزرگی کا بھرم قائم تھا اور ان کی نظر میں ابھی قریش ہی کو اختیارات رکھنے کا جواز حاصل تھا اور جبکہ لوگوں کی نظر میں ابھی اہل ایمان کی پوزیشن یہی تھی کہ وہ کچھ نوجوان ہیں جو اپنے بڑوں اور سرداروں کے کہنے میں نہیں...تو کیا ایسی حالت میں معرکہ آرائی ہو جانے کی صورت میں کسی کے ذہن میں یہ بات سما سکتی تھی ـــــ جیسا کہ انصار کے ذہن میں بالآخر سما گئی ـــــ کہ اس مسئلے کو جانچنے کا معیار دراصل کوئی اور ہے!؟ اس مسئلے کو جانچنے اور اس جھگڑے کی حقیقت جاننے کیلئے معیار محض یہ نہیں کہ بیت اللہ کے رکھوالے کون ہیں؟ مال و دولت اور جاہ و حشمت زیادہ کس کے پاس ہے؟ قوت زیادہ کون رکھتا ہے!؟ عرف میں کس کی کیا حیثیت ہے!؟ اور تاریخی طور پر آج تک کس کو کیا مرتبہ حاصل رہا ہے؟ بلکہ یہ کہ اس مسئلے کو جانچنے کا معیار لا الہ الا اللہ ہے!؟ ایک اللہ وحدہ لاشریک کی الوہیت پر ایمان ہے!؟ اور یہ کہ یہ ساری رسہ کشی کسی اور مقصد کے لیے نہیں ہو رہی بلکہ یہ سارا جھگڑا اللہ تعالی کے ہاں سے اترنے والی ہدایت اور شریعت کی

پیروی کا جھگڑا ہے!؟ اور یہ کہ فریقین میں اصل تنازعہ یہی ہے کہ دنیا میں بندگی کس کی ہو اور یہ کہ جب تک اس اصل جھگڑے کا فیصلہ نہیں ہو جاتا تب تک فریقین کے مابین اختلافات تھم جانا ممکن نہیں۔ گویا اب سب باتوں کا انحصار بس اسی ایک بات اور اسی ایک مسئلے پر ہے!؟

کیا ایسی صورت میں، یعنی قبل از وقت لڑائی بھڑائی کی صورت میں، یہ ممکن تھا کہ جس حق کو اہل ایمان نے گلے لگا رکھا تھا اور جس انداز سے گلے لگا رکھا تھا وہی حق اسی انداز کے ساتھ آس پڑوس کے کچھ اور لوگوں کے دلوں تک بھی ویسے ہی راستہ پا لیتا اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ تماشائیوں کے دل میں ویسی ہی جگہ کر لیتا جیسا کہ وہ انصار کے دلوں تک راہ پانے میں بالآخر کامیاب ہو ہی گیا...قریش کے ساتھ معرکہ چھیڑ لینے کی صورت میں کیا یہ سب کچھ اسی انداز سے ہو جاتا؟ فریقین میں اس وقت اگر جنگ ہو جاتی تو کیا ایسا نہ ہوتا کہ اس جنگ کی ساری گرد خود اسی مسئلے پر آ پڑتی جس کے لیے یہ جنگ کی جانا تھی!؟ حقیقتِ توحید جو کہ اس تنازعہ کی بنیاد تھی، وہ کہیں بیچ میں ہی چھپ کر نہ رہ جاتی!؟ تب یقیناً لا الہ الا اللہ کا یہ جھگڑا دیکھنے والوں کی نگاہ سے روپوش ہو جاتا اور کچھ دیر بعد اس لڑائی میں دیکھنے والوں کے لیے دیکھنے کی بس یہی بات رہ جاتی کہ کون مرا اور کس نے مارا؟ کون جیتا اور کون ہارا؟ جس لا الہ الا اللہ کی حقیقت کے لیے جنگ کی جانا تھی وہ لوگوں کی نظر میں کسی کونے کھدرے میں جا پڑی ہوتی اور ایک بالکل ثانوی اور حاشیائی حیثیت اختیار کر چکی ہوتی بلکہ بیشتر لوگوں کی توجہ تو اس طرف کو جا ہی نہ سکتی!

میرے خیال میں معاملہ واضح ہے کہ اس صورت میں کیا ہوتا....

اس سارے معاملے کا راز بس یہی تھا... کفوا أيديكم یعنی 'ہاتھ روکے رہو'

اس کی بدولت یہ ممکن ہوا کہ فریقین میں لا الہ الا اللہ ہی اصل جھگڑا بنا رہے ــــــ کہ آدمؑ سے لے کر محمد ﷺ تک ہر رسول نے اپنی قوم سے یہی جھگڑا کیا تھا ــــــ اسی کفوا أيديكم کی بدولت یہ ممکن ہوا کہ لا الہ الا اللہ کی حقیقت اپنی صاف ستھری اور اجلی نکھری صورت میں اور یہ تنازعہ اتنا نمایاں ہو کے رہے کہ اس کے ہوتے ہوئے فریقین میں اور گویا کوئی جھگڑا ہی وجود نہ رکھتا ہو۔ پھر اس مسئلے اور اس تنازعے کو اتنا وقت ملے کہ یہ ہر ایسے دل تک اپنا راستہ بنا لے جسے اللہ تعالی نے اس مرحلے میں اپنی ہدایت سے سرفراز کرنا ہو۔

پھر یہ دلوں تک راستہ ہی نہ بنائے بلکہ اسے اتنا وقت ملے کہ یہ دلوں میں گھر کر جائے اور اس پر ایمان ان میں پوری طرح راسخ ہو جائے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ ان دلوں کے بند کواڑ بھی بار بار کھٹکھٹا لے جن

کے لیئے اللہ نے ہدایت نہیں لکھ رکھی۔ ایسے ہٹ دھرموں تک بھی یہ لا الہ الا اللہ ہر شبہے، ہر ابہام اور ہر غموض سے پاک اور اجلی نکھری حالت میں پہنچ لے۔ پھر وہ پورے دھڑلے کے ساتھ اس سے کفر کرلیں جبکہ ان کے پاس کوئی شک وشبہے کی گنجائش تک باقی نہ ہو۔ یہ اتنا کھلا کفر ہو کہ اس میں کوئی ایسا شبہہ تک باقی نہ ہو کہ اس شخص نے یہ کفر کا راستہ شاید اپنی جان بچانے کے لیئے اختیار کیا ہے۔ یا یہ کہ اس نے یہ کفر اپنا مال واسباب بچانے کیلئے اختیار کر رکھا ہے۔ یا یہ کفر اس نے اپنے امن وامان کے خطرے کے پیش نظر کیا ہے۔ یا اس کفر کا سبب وہ عام سی ضد بازی یا اس کا کسی سے زچ ہو جانا ہے، جو لڑائی بھڑائی کے عمل میں ایک معمول کی بات ہوا کرتی ہے.. بلکہ ان سب باتوں کے برعکس یہ کفر ایسا ہو کہ بس لا الہ الا اللہ کا صریح اور کھلا انکار ہو، تاکہ اللہ کی تقدیر میں اس سے آگے جو مرحلہ آ رہا ہے اس کے لیے سٹیج طبعی طور پر اور پوری طرح تیار ہو..وہ مرحلہ جو کہ اللہ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے:

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (الانفال ۴۲)
تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیلِ روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیلِ روشن کے ساتھ زندہ رہے

چنانچہ لا الہ الا اللہ کا مسئلہ یوں واضح انداز میں فریقین کے مابین جو اصل تنازعہ بن گیا تو یہ کفوا أیدیکم ہی کا مرہونِ منت تھا۔ چنانچہ یہ ہاتھ روک رکھنا دعوت کے لوازمات میں شامل ہے کیونکہ دعوت کو جس جماعت اور جتھے کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ جتھا مناسب حد تک اور مناسب انداز میں اور مناسب دورانیے میں اس وقت تک وسعت نہیں پا سکتا جب تک:

☆ لا الہ الا اللہ کی بنا پر سبیل المجرمین واضح نہ ہو جائے۔
☆ اور جب تک دوسری طرف اس لا الہ الا اللہ کی بنا پر سبیل المؤمنین بھی واضح نہ ہو جائے۔

بلکہ یہ دونوں کام ہوئے بغیر آگے بڑھنے کی صورت میں دعوت کی بات ابتدا میں جن لوگوں کو سمجھ آ گئی بس وہ انہی لوگوں تک محدود رہتی ہے اور اس دعوت کو نئے لوگ ملنا بند ہو جاتے ہیں، وہ بھی اس صورت میں اگر یہ ابتدائی لوگ ویسے ہی اس معرکے اور معرکے کے ہنگاموں کی نذر نہ ہو جائیں۔

چنانچہ جب مناسب وقت اور مناسب محنت صرف کرنے کے نتیجے میں فریقین میں جاری تنازعہ واضح ہو گیا اور کفوا أیدیکم کی بدولت لوگوں کو سمجھ آنے لگ گیا تب اس دین کو مدد دینے کیلئے کہیں سے 'انصار' بھی آ گئے!

پھر جب 'انصار' آئے تو اس بنیادی جتھے کی توسیع عمل میں آئی، اب جو جتھا بڑا ہوا تو لمحوں میں تاریخ کا دھارا بدل گیا!

اس مسئلے پر ذرا ہم ابھی اور بھی رکنا چاہتے ہیں... بھلا یہ 'انصار' کون لوگ ہیں؟

کیا یہ جوش و جذبے سے سرشار قسم کے 'عوام' کا کوئی ٹولہ ہے جو بس رسول اللہ ﷺ کی شخصیت سے عقیدت اور والہانہ لگاؤ رکھے ہوئے ہے اور ان کے جذبات کو اس وجہ سے جوش آ گیا ہے کہ یہ آپ ﷺ کے ساتھ کھڑی انسانوں کی منفرد جماعت کے صبر و استقلال سے متاثر ہو گئے ہیں اور اس پر ہونے والے ظلم و تعدی کے مارے ان پر ترس کھانے پر آمادہ ہیں؟ یا پھر یہ جانباز سپاہی ہیں جو اس دین کی حقیقت کو پوری طرح سمجھ کر آگے بڑھے ہیں اور اس قیادت کے پیچھے پوری دل جمعی کے ساتھ کھڑے ہو کر مجاہدین کی صف میں شامل ہو رہے ہیں؟

ان دونوں باتوں میں کتنا بڑا فرق ہے اور دعوتی عمل کے آگے بڑھنے کے لیے یہ فرق کس قدر اہم ہے!

بلا شبہ رسول اللہ ﷺ کے لیے ان دلوں میں بے انتہا محبت اور عقیدت موجزن تھی جو آپ کی اعلیٰ انسانی صفات کو دیکھ کر دلوں میں خود بخود پیدا ہو جاتی تھی اور ایسا ہوتا بھی کیوں نہ کہ آپ کی شخصیت انسانوں میں ایک منفرد ترین نمونہ تھی اور ان لوگوں نے آج تک تاریخ میں کسی بھی بڑی سے بڑی اور دلوں کو موہ لینے والی شخصیت کے بارے میں جو سن یا پڑھ رکھا تھا وہ اس شخصیت کے سامنے کچھ نہ تھا جو بنفس نفیس ان کے سامنے تھی۔ اور پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ظلم و ستم کا شکار ہونے والے مومنوں کے لئے ترس کھانے کا جذبہ بھی ان کے دلوں میں یقیناً موجزن تھا کیونکہ جس طرح کا ظلم ان کی آنکھوں کے سامنے ان عزم و استقلال کے پیکروں پر ہو رہا تھا اس کے ہوتے ہوئے یہ جذبہ بھی ایک طبعی امر تھا.. مگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بات بھی اس امر کا تنہا باعث نہ تھی کہ وہ اس طریقے سے توحید کے اس جتھے میں آ کر شامل ہو رہیں۔ اس امر کا باعث اصل میں یہ بات تھی کہ وہ اس حقیقت پر دل و جان سے ایمان لے آ چکے تھے کہ اللہ کے سوا دنیا میں بالفعل کوئی بندگی کے لائق نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اسی اِلہِ واحد کے فرستادہ ہیں.. ان لوگوں نے پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کو رب مان لیا تھا، محمد ﷺ کو رسول تسلیم کر لیا تھا اور اسلام کو دین یعنی طریقۂ بندگی و طرزِ زندگی۔ یہ کر لینے کے بعد اب وہ اس بات پر آپ ﷺ سے بیعت کرنے

آئے تھے کہ وہ آپؐ ہی کی سنیں گے اور آپؐ ہی کی مانیں گے۔ آپؐ ہی کے ساتھ جئیں گے اور آپؐ ہی کے اشارے پر مریں گے۔

رسول اللہ ﷺ ان سے کہتے ہیں: "کیا تم میرا بچاؤ کرو گے؟" اور وہ یک آواز ہو کر کہتے ہیں: "ہم ہر اس چیز سے آپ کا تحفظ کریں گے جس سے ہم خود اپنی عورتوں اور بچوں کا تحفظ کرتے ہیں"۔ اور پھر یہ بھی کہتے ہیں: "اگر آپ ہمیں لے کر اس صحرا میں آگے بڑھنا چاہیں تو بخدا ہم یہ صحرا پار کر جائیں گے اور اگر آپ اس سمندر میں اترنا چاہیں تو بخدا ہم اس میں اتر جانے کیلئے بھی تیار ہیں"۔

یہ ایک کامل جاں بازی اور جاں نثاری تھی جو اس دعوت کو میسر آ چکی تھی!

اس دعوت میں ابھی تک 'عوام' کو ساتھ چلانے کا وقت نہیں آیا تھا۔ اس کا وقت گو آنا تھا مگر ابھی نہیں!

کیا خیال ہے اگر یہ انصار محض جذبات سے سرشار 'عوام' کا ٹولہ ہوتے جو صرف جذبۂ عقیدت اور جوشِ ہمدردی میں ساتھ آ ملے ہوتے! اس صبر آزما اور کٹھن راستے میں یہ 'جذبات' بھلا کب تک ساتھ دیتے؟ کفر سے کبھی ختم نہ ہونے والی اس جنگ میں محض جوش کیا کرتا؟ اور جب اللہ تعالی نے زیادتی کا جواب دینے کی اجازت دی تو اس موقعہ پر ہونے والی جنگ میں ان کا پایۂ استقلال کیونکر ثابت قدم رہتا؟

ہاں یہ بات کہ اللہ کے رسول ﷺ کو اس بات پر خوشی ہوتی کہ نئے نئے لوگ دعوت میں شامل ہو رہے ہیں اور اسلام کی رونق بڑھ رہی ہے، تو اس بارے میں تو واقعی کوئی شک نہیں...... اور یہ کہ مکہ میں اہل ایمان بھی ان نئے ساتھیوں کو دیکھ کر خوش ہوتے، اس بارے میں بھی کوئی شک نہیں...... مگر یہ بات کہ اللہ کے رسول ﷺ ان نئے لوگوں کو لے کر پورے وثوق اور پوری آب و تاب کے ساتھ دعوت کی راہ میں بھی آگے بڑھ لیتے، تو یہ بات البتہ ضرور محل نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے سوال کیا هل تمنعوننی؟ "کیا تم میرا بچاؤ کرو گے؟"

چنانچہ یہ سوال محض انکے ایمان کی بابت نہیں تھا۔ یہ ایمان تو وہ پوری صراحت کے ساتھ پہلے ہی قبول کر چکے تھے اور اسی کا یقین دلانے آپؐ کے پاس آئے تھے۔ اب یہ سوال تو ایمان سے بھی ایک قدم آگے کا تھا۔ یہ ایمان کے لیے جاں نثاری کا سوال تھا اور اس حق کے لیے مر مٹنے کا جسے وہ پوری طرح

سمجھ کر قبول کر چکے تھے۔

یہ انصار اگر رسول اللہ ﷺ کو محض جذباتی عوام نظر آئے ہوتے تو آپؐ کبھی انکو لے کر اس دشوار گزار راہ میں آگے نہ بڑھتے۔ کیونکہ اس دعوت کو پوری طرح سمجھ کر اس پر جان دینے پر آمادہ انسانوں کے بغیر اس مرحلے میں آگے بڑھا ہی نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ سے آنے والے انصار کو اگر ایسا نہ پایا ہوتا تو ہرگز اس راہ میں آگے نہ بڑھتے اور محض اس بات سے متاثر نہ ہوتے کہ 'جماعت بڑھ رہی ہے' اور 'دعوت پھیل رہی ہے'۔

پھر رسول اللہ ﷺ کو یہ انصار کی جاں نثاری بھی کب میسر آئی؟

ہم اس سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ مکہ میں مسلمانوں نے جس آگ کی تپش سہی انصارِ مدینہ بالآخر اسی آگ سے روشنی لینے پہنچے۔ انصار کی صورت میں اب ایسے لوگ میسر آ گئے جو رسول اللہ ﷺ کو نصرت اور دین کو قوت دینے کیلئے اپنا آپ پیش کر رہے تھے۔

انصار کا آنا اللہ کی قدرت سے تھا، یقیناً یہ درست ہے مگر یہ بھی بہرحال اللہ کی ایک سنت اور طبعی قانون کے تحت تھا۔

سب سے پہلے کچھ لوگ اپنے وجود کی صورت میں ایک دعوت کا جیتا جاگتا نمونہ بنتے ہیں۔ جس سے دعوت انسانی شکل میں ڈھلتی ہے تو معاشرے میں اس دعوت کی عملی شہادت قائم ہونے لگتی ہے۔ پھر یہ چند انسانوں کا وجود خود بخود ایک ایسا نیوکلیئس بنتا ہے جس کے گرد نئے عناصر آ کر جمع ہونے لگتے ہیں اصل نیوکلیئس (Mother Nucleus) میں جتنی جان اور کشش ہوتی ہے اتنے ہی زور سے نئے عناصر اس کے ساتھ آ چمٹتے ہیں۔ پھر زیادہ شدت سے قریب آنے والے عناصر خود اس نیوکلیئس ہی کا حصہ بننے لگتے ہیں۔ پھر جوں جوں اس انداز سے نیوکلیئس کا حجم بڑھتا ہے توں توں اس کے گرد جتھے کی رفتار بھی بڑھتی ہے.. یہ اللہ کی ایک سنت ہے اور ایک طبعی قانون ہے خواہ مادی کائنات کا معاملہ ہو یا انسانی نشاط کا۔

یہ بنیادی نیوکلیئس (Mother Nucleus) اہل ایمان کی وہ جماعت تھی جو رسول اللہ ﷺ کے گرد بالکل ابتداء میں اکٹھی ہوئی تھی اور جسے اللہ کے ہاں سے اترنے والی وحی نے یہ شکل دے دی تھی اور جسے مربی اعظم ﷺ نے اپنی جان لگا کر اور اپنا پورا زور صرف کر کے یہ نشاط بخشا تھا اور اپنے

صبر و ہمت، اپنی فراخدلی واعلیٰ ظرفی، اپنی دانائی اور بصیرت کے ساتھ اس کی نشو ونما کی تھی.. پھر باقی کا کام دشمنوں نے کیا۔ ادھر سے آزمائشیں آئیں تو یہ سونا اور بھی کندن بنا۔ ہمتوں کو اور بھی مہمیز ملی۔ عزائم کو اور بھی حوصلہ ملا اور شخصیتوں میں اور بھی نکھار آیا.. اور اللہ سے قربت اور بھی بڑھی۔

اس کفوا أیدیکم کی بدولت ہی پس اس بنیادی نیوکلیئس نے وجود پایا جس نے کچھ ہی دیر بعد تاریخ کا دھارا پھر اپنے ہاتھ میں لے لیا!

لیکن اگر مسلمان کہیں اسی وقت قریش سے آمادۂ جنگ ہو گئے ہوتے تو اس بنیادی نیوکلیئس کا وجود عمل میں آنے کا سارا کام ہی مؤخر ہو جاتا، اور پھر تاخیر کے ساتھ وجود میں آتا بھی تو اسے وہ سب خصوصیات حاصل نہ ہوتیں جو کہ اب ہوئیں۔ جبکہ اس ابہام اور غموض کی تو بات ہی نہ کریں جو ایسی کسی لڑائی کی صورت میں تنازعۂ لا الہ الا اللہ کے چہرے کو چھپا لیتا اور یہ غبارِ جنگ اس مسئلۂ باعث نزاع کو مکمل طور پر ڈھانپ لیتا۔ کیونکہ جب سارا مسئلہ ہی یہ ہو رہے کہ فریقین میں سے کون مرا اور کس نے مارا، کون جیتا اور کون ہارا تو مسئلۂ توحید تو کہیں جنگ کے شور ہی میں دبا پڑا رہ جاتا.. ایسی صورت میں اس مضبوط جتھا بندی کا عمل بھی تاخیر کا شکار ہو جاتا جو اپنی طبعی رفتار میں اس نیوکلیئس کے گرد ہو رہا تھا جو کہ ابتداء میں تشکیل دے لیا گیا تھا اور اس کی افزودگی بہترین انداز میں کر لیے جانے کے مواقع حاصل ہو گئے تھے۔

آیئے ذرا اختصار سے از سر نو جائزہ لیتے چلیں کہ کفوا أیدیکم کی بدولت کون کون سے بلند مقاصد حاصل کئے گئے۔

سب سے پہلے تو دعوت کے عمل میں بہت دور رس مقاصد حاصل کئے گئے۔ اس کی بدولت فریقین میں 'باعثِ تنازعہ' کا علی وجہ البصیرت تعین ہو گیا.. کہ یہ جھگڑا لا الہ الا اللہ کا جھگڑا ہے...... باعثِ نزاع مسئلہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو بندگی کرانے کا حق نہیں.. اس کے سوا دونوں میں کوئی اور جھگڑا نہیں۔

اس صبر کی بدولت یہ طے پا گیا کہ قریش اور اہل ایمان میں ہونے والا یہ تنازعہ کوئی زمین کا تنازعہ نہیں۔ یہ کوئی سیاسی اقتدار کی رسہ کشی نہیں (کیونکہ اقتدار کی پیش کش جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو از خود کر دی تو بھی آپ نے وہ پیش کش مسترد کر دی اور اس بات پر اڑے رہے کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ ہو گی، پھر خود اہل ایمان کی جانب سے بھی پورے عرصے کے دوران کوئی ایک بھی ایسا اقدام سامنے نہیں آیا جس سے واضح ہوتا کہ ان کے پیش نظر اقتدار تک رسائی ہے۔)

یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ کشمکش نہ تو بیت اللہ کی رکھوالی کا شرف حاصل کرنے کے لیے ہے اور نہ حاجیوں کی خدمت کا اعزاز پانے کی خاطر۔

نہ یہ مسئلہ کسی اقتصادی برتری کے حصول کا ہے کہ قریش سے وہ معاشی برتری چھین لی جائے جس کے بل بوتے پر وہ افلاس زدہ مومنوں کا اقتصادی محاصرہ روا رکھے ہوئے ہیں اور انکو بھوکا مارنے کی حکمت عملی پر کاربند ہیں۔ ایسی غربت کی حالت میں بھی مسلمانوں کے لیئے قریش کی اقتصادی برتری کا خاتمہ کوئی باعثِ توجہ مسئلہ نہیں بنا!

یہ ساری کی ساری لڑائی اور یہ تنازعہ بہت بڑے مسئلے کی خاطر ہے اور جسے ہمیشہ اولیت حاصل رہنی چاہیے.. یہ مسئلہ جو بلاشبہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے یعنی: عبادت کس کی ہوگی؟ معبود کون ہے؟ اور اسی سے پھر یہ سوال خود بخود پھوٹ پڑتے ہیں: حکم چلانے کا حق کسے ہے؟ قانون سازی کس کو سزاوار ہے؟ انسانی زندگی کے لیئے ضابطے کون بنا سکتا ہے؟ قریش کہتے ہیں کہ یہ کام ان کے اپنے اہواء و خواہشات اور ان کے آباؤاجداد کے رسم و رواج اور معاشرے کے عرف و تقلید کی روشنی میں ہوگا۔ جبکہ اہل ایمان یہ کہتے ہیں کہ اس پر صرف ایک اللہ کا حق ہے۔

پھر تربیت کی سطح پر بھی دوررس مقاصد حاصل کئے گئے۔

اس 'فراغت' کا سارا فائدہ اس طرح لیا گیا کہ ساری کی ساری محنت ہر طرف سے بچا کر صرف تربیت [1] پر صرف کردی گئی اور تربیت کے فکری، نظریاتی، عملی اور روحانی پہلوؤں پر زبردست کام کر کے اس مضبوط جتھے کی تیاری عمل میں لے آئی گئی جسے آگے چل کر پوری امت کی تربیت کا کام اپنے سر لینا تھا۔

پھر کفار کی پوزیشن متعین کرنے میں بھی یہ صورتحال بے حد معاون رہی 'جوازِ اقتدار' کا مسئلہ بھی آیات کے کھول کھول کر بیان کئے جانے اور مجرموں کے راستے کی وضاحت کردیئے جانے کے سبب حل ہوگیا۔

علاوہ ازیں اہل ایمان کے جتھے کی توسیع کا کام بھی تکمیل کو پہنچا۔ مکہ میں جس نیوکلیئس کی افزودگی عمل میں آتی رہی اس کی روشنی دیکھ کر اور اس سے روشنی پانے کے لیئے آس پاس اور دور دراز سے

---

(۱) تربیت کے عمل پر آئندہ فصل میں گفتگو ہوگی۔

نئے لوگ جان نثاری کے عزم کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ ایک خاص عرصے میں عرب کے بہترین عناصر اس دعوتی نیوکلیئس کے گرداگرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ یہ سب اللہ کی قدرت سے تھا مگر یہ اللہ کے فطری قانون کے تحت بھی تھا۔ پھر جوں جوں نئے لوگ اس دعوت کی فکری گہرائی میں اتر کر شامل ہوتے گئے توں توں اس کشمکش کا نقشہ بھی تبدیل ہوتا گیا۔ اس کے علاوہ ایک اور کام بھی ہوا جو بے انتہا اہمیت کا حامل تھا۔ یہ اللہ کے لیے تجرد کا معاملہ تھا۔

تجرد یعنی اللہ کو خوش کرنے اور اللہ کی ڈیوٹی کرنے کے علاوہ آدمی کو ہر مقصد بھول جائے اور وہ ہر ہدف ہر منزل سے بے پرواہ ہو جائے۔

اللہ کے لیے تجرد حاصل ہو جانا دعوت کا ایک اہم ترین عنصر ہے بلکہ کیا بعید کہ یہ دعوت کی سب سے بڑی ضرورت ہو۔ دعوت کے لیے میدان میں اترنے والے بنیادی جتھے کے لیے بالخصوص اور اس کا ساتھ دینے والے کارکنوں کے لیے بالعموم۔

اسلام کو دعوت کے آغاز میں، مکی مرحلے کے دوران، جو چنے ہوئے افراد حاصل ہوئے، ان افراد کے دلوں میں 'اللہ کے لیئے تجرد' بہت گہرا ہو چکا تھا۔ اور یہ تجرد اس انداز سے پیدا کرنے میں ان آیات کو خاص مقام حاصل تھا جو قرآنی وحی کی صورت میں وقفے وقفے سے اتر رہی تھیں پھر اس میں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور اسوہ کا براہ راست اثر بھی تھا جو ان کو عملی انداز میں یہ سکھانے کے لیے کافی تھا کہ اللہ کے لیئے بندگی کو خالص کیسے کیا جاتا ہے۔

جہاں تک خود رسول اللہ ﷺ کا معاملہ تھا۔ تو آپؐ کی تربیت اللہ تعالی نے خود کی تھی اور کیا ہی عمدہ کی تھی۔

آپ ﷺ جب پہلے پہل دعوت کو لے کر کھڑے ہوئے تو لوگوں کے جھٹلانے کا آپ پر شدید اثر ہو جاتا، ان کے ہر حال میں ہدایت پر آ جانے کے لیے آپ شدید بے چین ہوتے اور ان کے نہ ماننے کا آپ کو بہت زیادہ دکھ اور ملال ہوتا، یہ سب اس لیے کہ قدرتی طور پر آپ کی طبیعت میں لوگوں کی بھلائی کا جذبہ شدید طور پر موجزن تھا۔

اس دوران میں وحی آپ کو تسلی دینے اور اس غم سے بے پرواہ کرنے کے لیے اترا کرتی تھی:

قَدۡ نَعۡلَمُ اِنَّهٗ لَيَحۡزُنُكَ الَّذِىۡ يَقُوۡلُوۡنَ فَاِنَّهُمۡ لَا يُكَذِّبُوۡنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ (الانعام۔۳۳)
اے محمد ﷺ ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمھیں رنج ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ تمھیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں

وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَلَا تَكُ فِىۡ ضَيۡقٍ مِّمَّا يَمۡكُرُوۡنَ (النحل۔۱۲۷)
اے محمد ﷺ صبر سے کام کیئے جاؤ۔ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور ان کی چال بازیوں پر دل تنگ نہ کرو

آپؐ کو اس دکھ سے بے پرواہ کرنے کیلئے وحی اترتی۔ آپؐ میں کسی ایسے معجزے کے اتر آنے کی جو شدید چاہت پیدا ہو جاتی جو کسی نہ کسی طرح لوگوں کو ایمان لانے پر آمادہ کر دے، ایسے معجزے کی شدید چاہت سے بے نیاز کر دینے کے لیے وحی اترتی۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمۡ اِنۡ لَّمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٰذَا الۡحَدِيۡثِ اَسَفًا (الکھف۔۶)
اچھا تو اے محمد ﷺ تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھودینے والے ہو اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے

وَاِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكَ اِعۡرَاضُهُمۡ فَاِنِ اسۡتَطَعۡتَ اَنۡ تَبۡتَغِىَ نَفَقًا فِى الۡاَرۡضِ اَوۡ سُلَّمًا فِى السَّمَآءِ فَتَاۡتِيَهُمۡ بِاٰيَةٍ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمۡ عَلَى الۡهُدٰى فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ. اِنَّمَا يَسۡتَجِيۡبُ الَّذِيۡنَ يَسۡمَعُوۡنَ ؕ وَالۡمَوۡتٰى يَبۡعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ (الانعام:۳۵۔۳۶)
تاہم اگر ان لوگوں کی بے رخی تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا، لہٰذا نادان مت ہو"۔ دعوت حق پر لبیک وہی لوگ کہتے ہیں جو سننے والے ہیں، رہے مردے تو انہیں تو بس قبروں ہی سے اٹھائے گا اور پھر وہ (اس کی عدالت میں پیش ہونے کیلئے) واپس لائے جائیں گے

آپؐ کو اس بات پر یکسو کر دینے کے لیے وحی اترتی کہ آپکی ذمہ داری صرف اور صرف 'پہنچا دینا' ہے۔ اور نتائج سے بے نیاز ہو جانا، کہ یہ اللہ کا کام ہے آپ کا نہیں۔

اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ (القصص۔۵۶)
اے نبی ﷺ تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو ہدایت کو قبول کرنے والے ہیں

اس سلسلے میں ایک عجیب توجہ طلب بات یہ ہے کہ مکہ کے اس سارے تربیتی مرحلے کے دوران اللہ کی جانب سے کوئی ایک بھی وعدہ ایسا نہیں اترا جس میں یہ یقین دہانی کرائی گئی ہو کہ فتح و نصرت

خاص آپ ﷺ کی ذات پر ہی اترے گی بلکہ اس کے بجائے آپ کو یہ کہا جاتا رہا:

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُ هُمْ اَوْ نَتَوَ فَّيَنَّكَ فَاِ نَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (الرعد۔۴۰)

اور اے نبی ﷺ جس برے انجام کی دھمکی ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں اس کا کوئی حصہ خواہ ہم تمہارے جیتے جی دیکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمھیں اٹھالیں، بہر حال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے

یہ آپؐ کی ذات کا معاملہ تھا۔مگر جہاں تک خود اس دین کی نصرت کا تعلق تھا تو اس دین کو نصرت اور تمکین ملنے کا رسول اللہ ﷺ کو پورا یقین تھا۔ چنانچہ بخاری کی روایت میں خباب بن الارتؓ کے بقول:

> ''ہم نے رسول اللہ ﷺ سے، جبکہ آپ کعبہ کے سائے میں اپنے بردہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے، اپنی حالت زار کی شکایت کی اور کہا: آپ کیوں ہمارے لئے مدد اور نصرت کی دعا نہیں فرماتے؟ (یہ اس وقت کی بات ہے جب مکہ میں مشرکوں کا ظلم وتعدی انتہائی شدت اختیار کر گیا تھا) تب آپ نے فرمایا: *جانتے ہو تم سے پہلوں کے ساتھ کیا کچھ ہوتا رہا۔آدمی کو پکڑ کر زمین میں گڑھا کھود کر گاڑ دیا جاتا، پھر آرا لا کر اس کے سر پر چلا دیا جاتا۔جس سے اس کا جسم دولخت ہو رہتا۔لوہے کی کنگھیوں کے ساتھ آدمی کا گوشت ہڈیوں سے جدا کر دیا جاتا مگر پھر بھی وہ اپنے دین سے ہٹنے کا نام نہ لیتا۔اللہ کی قسم اللہ اپنا یہ مشن پورا کر کے رہے گا۔یہاں تک کہ آدمی اکیلا سوار ہو کر صنعاء سے حضر موت کا سفر کرے گا،اللہ کے سوا اسے راستے میں کسی کا ڈر نہ ہوگا۔اور بھیڑوں کے ریوڑ کو بھیڑیئے کے سوا کسی چور کا ڈر نہ رہے گا۔مگر تم لوگ بس جلدی کر رہے ہو''۔*
>
> (بروایت بخاری)

چنانچہ وحی میں آنے والی پے در پے ہدایات کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ کے قلب کو اس معاملہ میں مکمل تجرد اور استغنا حاصل ہو گیا کہ اس دین کی نصرت ضرور آپ کی زندگی میں ہی ہو۔آپ کو 'بلاغ'، یعنی پہنچا دینے کے لئے مکمل تجرد اور یکسوئی حاصل ہوگئی۔پھر آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو بھی ایسے ہی تجرد کی تربیت دی۔حتیٰ کہ ان کے نفوس اپنے نفس کے ہر حظ سے دستبردار ہو گئے،جیسا کہ کتب

سیرت میں واقعات سے ظاہر ہوتا ہے، اور ان سب لوگوں کو تمام یکسوئی اس کام کے لیے حاصل ہو گئی کہ وہ بندگی کو اللہ وحدہ لاشریک کے لیے خالص کر دیں۔

آخر جب اللہ نے ان کے دلوں میں جھانک کر یہ جان لیا کہ اب ان میں اللہ کے لئے پوری یکسوئی پائی جاتی ہے اور ان کو ہر قسم کی کامیابیوں کی خواہش سے تجرد حاصل ہو چکا ہے، تب جا کر ان کو زمین میں تمکین حاصل ہوئی اور.. ظلم و زیادتی کا جواب دینے کی اجازت مل گئی۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ. الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ. اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج۔۳۹،۴۰،۴۱)

اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے" اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کر ڈالی جائیں، اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہے

☆☆☆☆☆☆

# اسلام کی جو پہلی اٹھان ہوئی اس میں "تحریکی اُسوہ" کہاں ہے؟

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ طریق کار جو صحابہ کی تربیت کیلئے مکہ کے دور ابتداء میں امت کے مناسب حال تھا وہ ہماری آج کی اس صورتحال پر فٹ نہیں ہوتا۔ لہٰذا مکی دعوت اور اس کے طریق کار کو ایک تاریخی دستاویز کے طور پر تو پڑھنا چاہیۓ البتہ ایک ایسے اسوہ ونمونہ کے طور پر نہیں جس سے آج بھی باقاعدہ عملی اسباق لئے جائیں اور جس کی روشنی میں ایک عملی طریق اپنایا جائے۔

یہ معاملہ بہت زیادہ وضاحت طلب ہے۔ یہ ایک ایسا نقطہ ہے کہ اسلام کیلئے کام کرنے والے بہت سے موجود الوقت طبقوں کے راستے دراصل یہیں سے الگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب تک اس معاملے کی حقیقت بہت زیادہ واضح نہیں ہو جاتی اور اس کا پوری دقت سے جائزہ نہیں لے لیا جاتا تب تک یہی ہوتا رہے گا کہ اسلامی افکار باہم الجھتے رہیں اور کوئی مشترک اور ہمہ گیر طریقِ عمل اختیار نہ کیا جا سکے۔ جبکہ اس دین کے دشمن سب کے سب آج ایک مشترک اور یک جہت موقف اختیار کر چکے ہیں اور سب مل کر امت اسلام کو وجود سے ختم کر دینے کیلئے اس پر پل پڑے ہیں۔ ہم نہیں تو ہمارے دشمن باہم ایک دوسرے کی جتنی ہو سکے تعاون اور پشت پناہی کرتے ہیں۔ اس کے مظاہر آپ بوسنیا میں دیکھ لیں، چاہے کشمیر میں، چاہے چیچنیا میں یا زمین کے کسی بھی اور خطے میں۔

طریق عمل کا واضح ہونا بے انتہا ضروری ہے۔ اس کے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں۔

کیا ہم مکی مرحلے میں ہیں...... جہاں کا معاشرہ بالکل واضح اور کھلم کھلا مشرک معاشرہ تھا اور جہاں اہل ایمان وہ مٹھی بھر لوگ تھے جو اس نئے دین کے ساتھ ایمان لے آئے تھے اور اس وجہ سے

پورے معاشرے میں مظلوم اور اچھوت بن کر رہ گئے تھے؟ کیا ہم ایک ایسے معاشرے میں ہیں جو ہے تو مسلمان مگر اسلام سے منحرف ہے اور ہمیں اس کا نقشہ تبدیل کرکے اسے واپس اسی صورت پر لے آنا ہے جو کہ اسلام کی حقیقی تصویر ہے؟ آخر ہم کس جگہ پر کھڑے ہیں اور کس قسم کی صورتحال سے ہمارا سامنا ہے؟

یہ معاملہ جس قدر نازک اور سنگین ہے، اور جتنی اس پر لے دے ہوئی ہے اور اس بحث وتمحیص نے جس قدر اختلافِ آراء اور تفرقہ کو جنم دیا ہے اس سب کے پیش نظر ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلے کا ہر قسم کی جذباتیت اور جلد بازی سے دور رہتے ہوئے نہایت باریک بینی اور غور سے مطالعہ کیا جائے۔ اس سوال کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد ایک ایسے واضح نتیجے تک پہنچا جائے کہ نہ جذبات اس کے آڑے آئیں اور نہ پہلے سے اختیار کردہ مواقف ہمیں اس نتیجے کو اختیار یا رد کردینے پر مجبور کریں۔

پکی بات ہے کہ ہم مکی مرحلے میں نہیں! ظاہر بات ہے کہ ہم جو اس وقت دعوت کے میدان میں کام کرتے ہیں اور پورے اسلام پر عمل پیرا ہونے کی سعی کرنے والے لوگ ہیں...... ہم ظاہر ہے روزہ بھی رکھتے ہیں اور حج بھی کرتے ہیں جبکہ ہم جانتے ہیں روزہ اور حج مدینہ آکر ہی فرض ہوا تھا! سب محرمات کو محرمات ہی سمجھتے ہیں اور سب واجبات کو واجبات ہی...... صرف مکہ میں نازل ہونے والے حلال اور حرام ہی کے پابند رہنے کے ظاہر ہے کہ ہم قائل نہیں!

پکی بات ہے کہ ہم مدنی مرحلے میں بھی ہرگز نہیں! ظاہر ہے اسلام کی دعوت کو زمین میں کہیں بھی تمکین حاصل نہیں۔ عالم اسلام کے ایک بے انتہا بڑے حصے میں اللہ کی شریعت کو انسانی زندگی کے فیصلے کرنے کا کہیں حق حاصل نہیں۔ یہی نہیں بلکہ اسلام کی اصل دعوت لے کر اٹھنے والوں کی تواضع کال کوٹھڑیوں سے ہوتی ہے اور یا پھر پھانسی کے تختوں پر۔ اور نہیں تو ان پر دائرۂ حیات تو بہرحال تنگ ہے ہی۔

تو پھر آج ہم کس جگہ کھڑے ہیں؟ کونسا منہج اور طریق کار ہمارے دور کے مناسب حال اور ہمارے معاشرے کے مناسب مقام ہے؟ کیا وہ منہج جو رسول اللہ ﷺ کو مکہ میں اختیار کرنے کا حکم ملا تھا؟ یا وہ منہج جو رسول اللہ ﷺ کو مدینہ میں اختیار کرنے کا حکم ملا تھا؟ یا پھر وہ اس سے مختلف کوئی طریق کار ہے جو بس ہمارے اپنے اجتہاد پر موقوف ہے نہ اس کے لئے کوئی قاعدہ ہے اور نہ ضابطہ!؟

یہ بہرحال ایک مسئلہ ہے اور بے انتہا اہم مسئلہ ہے جو ہم سے بہت ہی معین اور نشان زد جواب چاہتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

ہماری صورتحال اور مکی معاشرے کی صورتحال میں بہت سے پہلوؤں سے کھلا کھلا فرق پایا جاتا ہے۔اس فرق کی بنا پر بہت سے لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ہماری صورتحال کی مکی معاشرے سے یکسانیت کا مفروضہ درست نہیں۔

ظاہر ہے کہ مکہ میں لوگ اس بات کے سرے سے اور مطلق طور پر انکاری تھے کہ عبادت صرف اور صرف ایک ہی خدا کی کی جائے، حتیٰ کہ قرآن نے ان لوگوں کا اس بات سے حیران ومتعجب ہونے کا ذکر کیا ہے کہ عبادت اور بندگی کیلئے ایک ہی خدا رہ جائے۔

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهاً وَاحِداً إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ — کیا اس شخص نے سب خداؤں کا ایک ہی خدا کر دیا۔کتنی عجیب بات ہے یہ (ص:۵)

جبکہ ہماری صورتحال یہ ہے کہ پورے عالم اسلام میں ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اور یہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ اللہ کے ساتھ اور خدا بھی پوجے جائیں۔

ظاہر ہے مکہ میں لوگ موت کے بعد زندگی کا کھلا اور مطلق انکار کرتے تھے۔حتیٰ کہ قرآن نے عقیدہ آخرت پر بھی مکہ والوں کا حیران ومتعجب ہونا ذکر کیا ہے:

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَى رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ (7) أَفْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِباً أَمْ بِهِ جِنَّةٌ — منکرین لوگوں سے کہتے ہیں: ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہوگا اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے؟ نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے جنون لاحق ہے (سبأ:۷،۸)

جبکہ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ بیشتر طور پر ہم زندگی بعد از موت، جزاوسزا، حساب، جنت اور دوزخ پر ایمان رکھتے ہیں، اگر یہاں کوئی تھوڑی تعداد ایسے ملحد لوگوں کی پائی جاتی ہے تو بہرحال وہ کوئی اتنے نہیں کہ جن کے پیش نظر پورے معاشرے کا حکم بدل جائے......

ظاہر ہے مکہ میں لوگ محمد ﷺ کی نبوت اور رسالت ہی کے سرے سے منکر تھے، جیسا کہ قرآن نے اس بات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

| | |
|---|---|
| وَعَجِبُوا أَن جَاءَهُم مُّنذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكَافِرُونَ هَذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ (ص:٧) | یہ اس بات پر متعجب ہیں کہ ایک ڈرانے والا خود انہی میں سے آ گیا، منکرین کہنے لگے کہ یہ ساحر ہے سخت جھوٹا ہے |

اور یہ بھی کہ:

| | |
|---|---|
| أَأُنزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِن بَيْنِنَا (ص:٨) | کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کر دیا گیا؟ |

جبکہ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ملحد لوگوں کی ایک قلیل تعداد کو چھوڑ کر......ہم نبی ﷺ کی نبوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے جو اس نے اپنے رسول پر اتارا ہے، نہ کہ کسی بشر کا کلام اور نہ ہی گزرے بسرے لوگوں کی کہانیاں۔

کوئی شک نہیں کہ یہ سب کی سب باتیں بالکل حقیقت ہیں......

لیکن آیئے ذرا اس معاملے کو ایک اور جہت سے بھی دیکھتے چلیں۔

سوال یہ ہے کہ اسلام دراصل آیا کیوں تھا؟

اسلام آخر اسی لئے تو آیا تھا کہ بندے اور خدا کے درمیان سے سب واسطے ہٹا دیئے جائیں اور بندے اور خدا کے درمیان پرستش اور پکار و بندگی کا براہ راست تعلق قائم کر دیا جائے......

| | |
|---|---|
| وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُواْ لِي وَلْيُؤْمِنُواْ بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (البقرہ:١٨٦) | میرے بندے تم سے میرا پوچھیں تو بتاؤ میں قریب ہی ہوتا ہوں، کوئی پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ پس وہ بھی میری بات کو گلے لگائیں اور مجھ پر یقین رکھیں...... شاید کہ وہ راہ راست پالیں |

مگر صوفیت نے لوگوں کے عقائد کے ساتھ کیا کیا؟ مرید کے فکر و احساس کی دنیا میں 'شیخ' کا ایک مجسمہ کھڑا کر دیا جو بندے اور خدا کے درمیان ایک واسطے کی حیثیت رکھتا ہے مرید اللہ کو اس کے اسماء حسنیٰ میں سے کسی نام کے ساتھ پکارنے تک کی اجازت نہیں رکھتا جب تک کہ اسے شیخ کا اذن نہ ہو! شیخ دلوں کے بھید تک جان لیتا ہے! ہر دل کی حالت دیکھ کر وہ اس کیلئے خدا کا کوئی ایسا نام تجویز کرے گا جو اس کیلئے مناسب ہو۔ یہ فیصلہ بھی شیخ کرے گا کہ اللہ کا کوئی نام جو مرید کو اس کی جانب سے عطا ہوا اللہ کو اس نام سے پکارنے کی میعاد کب ختم ہو جائے گی! شیخ کی بڑائی کا اقتدار دلوں پر قائم رہنا چاہیئے چاہے اسے مرے ہوئے ہزار سال کیوں نہ گزر جائیں! دلوں پر شیخ کا اقتدار ایسا لازوال ہے کہ موت بھی اس میں

حائل نہیں ہوسکتی۔اس کی قبر اور درگاہ سے تبرک پانا، اس کے پاس جا جا کر دعائیں کرنا، مدد کی فریاد، حاجت روائی کی التجائیں...... یہ سب مرید کے دل میں شیخ کیلئے پائے جانے والے اخلاص کی محض علامات ہیں......اور اللہ تک تقرب حاصل کرنے کے یقینی ذرائع بھی!

کیا یہ بات قرآن میں ذکر ہونے والی مشرکوں کی اس بات سے کوئی بہت زیادہ مختلف بات ہے؟

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى (الزمر:٣)
کہ ہم تو ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرادیں"

پھر کیا یہ واضح شرک نہیں؟

اسلام دراصل آیا کیوں تھا؟

اسلام آخر اسی لئے تو آیا تھا کہ انسان کا بنایا ہوا ہر قانون اور ہر ضابطہ کالعدم کر کے ایک اللہ کا قانون اور اس کی شریعت قائم کردی جائے۔اور یہ بات ظاہر ہے عقیدہ کے اصل الاصول سے تعلق رکھتی ہے:

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (المائدۃ:٤٤)
ورجو لوگ اللہ کی نازل کردہ شریعت کی رو سے فیصلے نہ کریں وہی لوگ دراصل کافر ہیں

اسلام نے تو نفاق کی بھی یہ علامت مقرر کردی کہ کوئی شخص اللہ کے فیصلے سے روگردانی کرنے اور جان چھڑانے کی کوشش کرے:

وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِّنْهُم مِّن بَعْدِ ذَلِكَ وَمَا أُوْلَئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ وَإِن يَكُن لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ أَفِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ بَلْ أُوْلَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (النور:٤٧-٥١)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسول پر اور ہم نے اطاعت قبول کی، مگر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ (اطاعت سے) منہ موڑ جاتا ہے۔ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں، جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ اور رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق کترا جاتا ہے۔البتہ اگر حق ان کی موافقت میں ہو تو رسول کے پاس بڑے اطاعت کیش بن کر آجاتے ہیں۔کیا ان کے دلوں کو (منافقت کا) روگ لگا ہوا ہے؟ یا یہ شک میں پڑ گئے ہیں؟ یا ان کو یہ خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کرے گا؟ دراصل بات یہ ہے کہ ظالم تو یہ لوگ خود ہیں۔ایمان والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے معاملات کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں

اسلام نے تو صاف صاف یہ بھی ٹھہرا دیا تھا کہ اللہ کی شریعت کی بجائے کسی انسان کے بنائے ہوئے قانون ودستور پر چلنا دراصل اس انسان کو خدا تسلیم کرنا ہے۔ اس میں اور غیر اللہ کی پوجا پاٹ میں ذرہ بھر کوئی فرق نہیں۔

اتَّخَذُواْ أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُواْ إِلاَّ لِيَعْبُدُواْ إِلَـهاً وَاحِداً لاَّ إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ (التوبۃ:۳۱)

ان لوگوں نے اپنے احبار اور رہبان کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور اسی طرح مسیحؑ بن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ وہ کہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں۔ پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں

مگر پھر سیکولرزم نے عالم اسلام میں قائم انسانی زندگی کے نظام اور قانون کے ساتھ کیا کیا؟ سرزمین اسلام میں کتنی حکومتیں اور کتنے نظام ایسے ہیں جو آج اپنے فیصلے اللہ کی نازل کردہ شریعت سے کرواتے ہیں؟ سیکولرز بانیں اللہ کی شریعت کے بارے میں کیا کچھ کہتی ہیں؟ کیا یہ واضح شرک نہیں؟

دوبارہ اسی سوال پر آجاتے ہیں؟ اس صورتحال پر کیا حکم لگایا جائے؟

عالم اسلام کی آج جو صورتحال ہے اس پر حکم لگانے میں واقعی ایک بہت بڑا اشکال پایا جاتا ہے۔ یہ اشکال جہاں سے پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ لوگ اپنے جس عقیدے کا اعلان کرتے ہیں وہ وہ نہیں جس پر عملاً انکا معاشرہ قائم ہے۔ یہ دونوں چیزیں باہم متعارض ہیں اور یہ تعارض بھی ایک شدید تعارض ہے۔ اعلانیہ عقیدہ کچھ ہے تو معاشرہ بالکل کسی اور چیز پر قائم۔ اعلانیہ عقیدے اور عملی نظام کے مابین یہ جو تعارض ہے اس تعارض پر حکم لگانے میں بھی اختلاف آراء ہے کہ کیا یہ کفر کی وہ قسم ہے جو انسان کو ملت سے خارج کردینے والی ہے یا اس سے کمتر کفر کی کوئی صورت جو کہ دین سے انسان کو خارج نہیں کرتی؟

البتہ یہ بات طے ہے کہ یہ اشکال صرف اس معاملے میں ہے کہ لوگوں پر حکم کیا لگایا جائے؟

بہت برسوں سے میری یہی رائے رہی ہے کہ لوگوں پر حکم لگانے کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہونا چاہیئے جو ہم دعوت کے میدان میں کام کرنے والوں کو مصروفِ بحث رکھے۔ ہمیں اس مسئلے میں الجھ کر نہیں رہ جانا چاہیئے۔ نہ ہی اس مسئلے پر اختلاف اور تفرقے کو ہوا دینی چاہیئے۔ اس پر بحث ومناظرہ درست ہے اور نہ اس کی بنا پر گروہ بندی۔ دیانت داری سے کوئی فریق اس مسئلے میں جو رائے اپناتا ہے اسے اپنانے دی جائے اور ہر آدمی اس معاملے میں اپنی راہ چلے۔

ایک تھوڑی تعداد کو چھوڑ کر لوگوں کی ایک بڑی اکثریت شرک میں تو پڑی ہوئی ہے، اس میں تو خیر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، چاہے وہ اعتقاد کا شرک ہو، چاہے پوجا اور پرستش کا شرک ہو اور چاہے حاکمیت یعنی نظام اور قانون کا شرک۔ ہاں البتہ یہ بات کہ یہ اکثریت شرک میں پڑنے کی بنا پر مشرک بھی ہوگئی ہے، ایک اور مسئلہ ہے۔ کیونکہ ہر وہ شخص جو شرک میں پڑ گیا ہو اس پر یہ حکم لگانا درست نہیں کہ وہ مشرک بھی ہو گیا ہے تا آنکہ کچھ متعین شروط اس شخص کی بابت پوری نہ ہو جائیں اور کچھ موانع جو کہ اس شخص پر حکم لگانے میں شرعاً رکاوٹ سمجھے جاتے ہیں، ختم نہ ہو جائیں۔

اس ضمن میں امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

> ''میں ان پر یہ بات واضح کرتا رہا ہوں کہ سلف اور ائمہ دین سے اس بارے میں جو کچھ منقول ہے کہ جو آدمی 'فلاں بات کرے یا کہے وہ کافر ہو جاتا ہے'، تو یہ بات بھی بالکل درست اور برحق ہے مگر اطلاق اور تعین میں فرق بھی ضروری ہے[1] یہ اطلاق اور تعیین بنیادی اور اصولی عقائدی مسائل میں سے وہ پہلا مسئلہ ہے جس میں اس امت کا اولین نزاع ہوا تھا۔ چنانچہ وعیدِ عذاب کی بابت قرآن کی نصوص مطلق ہیں مثلاً قرآن کی یہ آیت:
>
> ان الذین یاکلون اموال الیتامی ظلماً
>
> ''کہ وہ لوگ جو ظلم و زیادتی سے یتیموں کا مال ہڑپ کر جاتے ہیں''۔
>
> چنانچہ سب معاملات میں جو کچھ منصوص یا منقول ہوا وہ مطلق طور پر ہی ہوا ہے کہ 'جو کوئی ایسا کام کرے گا وہ یہ کہلائے گا یا یہ سزا پائے گا'۔ یعنی یہ سب کچھ ایک مطلق اور عمومی انداز سے ہی مروی ہوا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی معاملہ سلف سے منقول ان اقوال کا بھی ہے کہ 'جو شخص ایسا کہے گا اس کا یہ حکم ہوگا' مگر جہاں تک کسی خاص متعین شخص کا

(۱) یعنی قاعدہ بیان کرنے کے انداز میں یہ کہنا کہ فلاں بات کہنے یا کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے...... اور یہ بات کہ کوئی متعین شخص جس نے یہ بات کہی ہے اس خاص شخص کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ کافر بھی ہو چکا ہے...... ان دونوں باتوں میں فرق ہے اول الذکر کو علماء عقیدہ کی اصطلاح میں کفرِ مطلق کہا جاتا ہے اور ثانی الذکر کو کفرِ معین۔ ان دونوں باتوں کیلئے اطلاق اور تعیین کے لفظ بھی مستعمل ہیں...... مترجم

معاملہ ہے تو اس کے حق میں وعید کا حکم کسی بنا پر ٹل بھی سکتا ہے خواہ وہ توبہ کر کے ہو، خواہ ایسا اس وجہ سے ہو کہ زندگی میں اس نے کچھ ایسی نیکیاں کر لی ہوں جو برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ خواہ ایسا ہو کہ اسے کچھ مصائب پہنچے ہوں، جو گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں، یا کسی ایسی شفاعت کی بنا پر جسے اللہ قبول کر لے، ایسا ہو...... اب تکفیر بھی دراصل وعید ہی کے باب سے ہے۔ چنانچہ کوئی شخص اگر کفر کی کوئی بات کرتا ہے تو اگرچہ اس کی وہ بات دراصل رسول ﷺ کی تکذیب ہے مگر ایسا کہنے والا شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے جو ابھی نیا نیا مسلمان ہوا ہو یا کہیں دور دراز کی ایسی بستی میں رہا ہو جہاں اسے علم نہ پہنچا ہو۔ سو ایسا شخص دین کی کسی ایسی بات کا انکار کر دے جس کے انکار سے آدمی ویسے تو کافر ہو جاتا ہے مگر یہ آدمی کافر قرار نہ دیا جائے گا کیونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شخص نے دین کی کوئی نص سن ہی نہ رکھی ہو، یا سنی ہو مگر اس کے نزدیک وہ پایہ ثبوت کو نہ پہنچتی ہو یا اس کے ہاں اس نص کا کسی اور نص سے تعارض لازم آتا ہو جس کی وجہ سے وہ اس نص کی تاویل کرنا ضروری سمجھتا ہو...... اگرچہ رہے گا پھر بھی وہ غلط ہی"۔ (۱)

امام ابن تیمیہؒ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"کتاب اور سنت میں مذکور وعید کی نصوص اور ائمہ دین سے منقول تکفیر اور تفسیق وغیرہ سے متعلق نصوص کا کسی خاص متعین شخص کے حق میں ثابت ہو جانا بجائے خود لازم نہیں آ جاتا تا آنکہ اس متعین شخص کے حق میں سب شروط پوری اور موانع ختم نہ ہو جائیں...... چاہے اصول کی بات ہو اور چاہے فروع کی"۔ (۱)

ایک تیسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"ان کو کافر اور مخلد فی النار قرار دینے کے معاملے بھی علماء کے ہاں دو مذہب پائے جاتے ہیں، جو کہ دراصل امام احمد سے منسوب دو روایات ہیں۔ امام احمد کے یہ دونوں قول خوارج اور حروریہ و رافضہ وغیرہ کے بڑے بڑے بدعتیوں کے بارے

---

(۱) مجموع الفتاویٰ جلد ۳ صفحہ ۲۳۰-۲۳۱ (۲) مجموع الفتاویٰ جلد ۱۰ صفحہ ۳۷۲

میں ہیں۔ صحیح موقف یہی ہے کہ خوارج وغیرہ کے یہ اقوال جو کہ واضح ہے کہ رسول ﷺ کے لائے ہوئے دین کے صریح منافی ہیں اور اسی طرح ان کے وہ افعال جو کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں اور جو کہ اہلِ ایمان پر ظلم اور عدوان ڈھانے کی قبیل سے ہیں...... ان کے یہ سب اقوال اور افعال کفر ہی ہیں۔ اس بات کے دلائل میں نے کئی اور مقامات پر واضح کیے ہیں۔ مگر ان لوگوں میں سے کسی شخص کو متعین کر کے کافر کہنا اور اسے مخلد فی النار قرار دینا البتہ اس بات پر موقوف ہے کہ آیا اس خاص شخص کے بارے میں تکفیر (کافر قرار دیئے جانے) کی سب شروط پوری ہوتی ہیں اور آیا کوئی ایسی بات تو نہیں پائی جاتی جو اس کے کافر قرار پانے میں مانع ہو۔

"چنانچہ ہم یہی کریں گے کہ وعد و وعید اور تکفیر (کافر قرار پانے) اور تفسیق (فاسق قرار پانے) سے متعلق نصوص کو ہم مطلق ہی رکھیں گے اور اس مطلق اور عمومی حکم کو ایک متعین شخص پر اس وقت تک فٹ نہیں کریں گے جب تک اس کے بارے میں قانونِ شریعت کے سب تقاضے پورے نہ ہو جائیں اور ان تقاضوں سے متعارض کوئی بنیاد باقی نہ رہے۔ میں نے یہ اصول 'القاعدة فی التکفیر' میں مفصل انداز سے واضح کیا ہے"[۲]

چنانچہ آج دعوتی اور تحریکی لائحہ عمل میں ہمیں جو مسئلہ درپیش ہے اس کی کنجی یہیں سے دستیاب ہو جاتی ہے۔

چنانچہ یہ تو واضح ہے کہ آج لوگوں کی ___ ایک چھوٹی تعداد کو چھوڑ کر ___ ایک بڑی اکثریت شرک میں تو پڑی ہوئی ہے اور یہ شرک اسی شرک جیسا (اکبر) ہے جو کہ جاہلیت کے دور میں ہوا کرتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان سب لوگوں کا جو شرک میں واقع ہوئے ہیں مشرک قرار پانا البتہ ضروری نہیں۔ ویسے بھی دعوتی عمل میں ہمیں جس بات سے غرض ہے وہ ہے حقیقت ایمان کا بیان، نواقض ایمان (وہ باتیں جن سے آدمی مسلمان نہیں رہتا) کا بیان اور لوگوں کو اس بات کی دعوت کہ وہ جس شرک میں پڑے ہوئے ہیں ___

---

(۱) مجموع الفتاویٰ جلد ۲۸ صفحہ ۵۰۰-۵۰۱

قطع نظر اس سے کہ وہ حکم شرعی کی رو سے اس کے مرتکب ہو کر مشرک قرار پاتے ہیں یا غیر مشرک ___ اس شرک سے وہ بہر حال نکل آئیں۔ جس بات سے اس وقت ہمیں اس دعوتی عمل میں غرض ہونی چاہئے وہ ہے اس بات کی دعوت کہ لوگ صحیح اسلام پر آ جائیں اور صحیح اسلام کی ہی دنیائے واقع میں ___ نہ کہ صرف دنیائے آرزو یا محض خواب وخیال کی دنیا میں ___ ترجمانی کریں اور صحیح اسلام پر ہی عمل پیرا ہوں۔

ہمیں اس بات سے کوئی غرض ہونی ہی نہیں چاہئے کہ ہم کسی شخص کو کہیں کہ تم مشرک ہو یا اس کے بارے میں لوگوں کو بتائیں کہ وہ مشرک ہے۔ ہمیں جس بات سے غرض ہے اور جو کہ ہمارا فرض منصبی ہے وہ یہ بتا دینا ہے کہ تم جو کر رہے ہو یہ شرک ہے اور حکمت ودانائی اور موعظہ حسنہ کے ذریعے اسے یہ دعوت دینا ہے کہ وہ اس شرک سے نکل آئے اور اسلام کی حقیقت کو اپنا لے۔

یہ تو ہوا اس صورتحال کے حوالے سے جس سے آج لوگوں کی اکثریت دوچار ہے اور ان فرائض کے حوالے سے جو ہم پر اس صورتحال کی بابت عائد ہوئے ہیں۔

مگر ایک دوسرے پہلو سے دیکھئے تو عالم اسلام کی آج صورتحال جیسی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ تھوڑی بہت استثنا کے ساتھ، عالم اسلام کے بڑے حصے میں جتنے نظام قائم ہیں آج اسلام کی صحیح دعوت سے برسر جنگ ہیں اور حقیقت اسلام کے داعیوں کو ایمان اور نواقض ایمان (جن باتوں سے آدمی مسلمان نہیں رہتا) کے بیان کی اجازت نہیں دیتے۔ خاص طور پر نواقض اسلام کے بیان کی زد جہاں غیر اللہ کے قانون ونظام کو چلانے پر پڑتی ہو وہاں تو حقیقت اسلام کے بیان کی اجازت تک نہیں۔ حقیقت اسلام کے داعیوں کی راہ میں جگہ جگہ جیلیں، کال کوٹھڑیاں اور پھانسیوں کے تختے نصب ہیں جو ہر ایسے شخص کو اپنی زد میں لینے کیلئے بے چین ہیں جو لا الـہ الا اللہ کی اس حقیقت سے معاشرہ کو آگاہ کرنا چاہتا ہے، جس حقیقت کے ساتھ لا الہ الا اللہ دراصل پہلے پہل اترا تھا۔

تو پھر دعوت کیلئے مناسب لائحہ عمل کیا ہو؟ اور ہم کس چیز کی دعوت دیں؟ دعوت میں کس چیز پر زور دیں اور دعوت میں ہم جس ہدف تک پہنچنا چاہتے ہیں اس تک پہنچنے یا اس کے قریب ہونے کیلئے کونسے وسائل اختیار کیے جائیں؟

اگر ہم اپنے گردوپیش کی صورتحال کا صحیح تصور کر لیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہم ان اشکالات سے نکل آنے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں جو ان اقوام پر حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعے حجت قائم کرنے

سے پہلے بعض شرعی احکام لگانے اور فتوے صادر کر دینے سے لازم آ جاتے ہیں...... اگر ہم یہ دونوں کام کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہم اپنے آپکو اپنے دعوتی فرائض کے حوالے سے ایک ایسی صورتحال کے خاصا قریب پاتے ہیں جو دعوت اسلامی کو مکی مرحلے میں درپیش تھی۔ مکی مرحلے کے قریب نہ کہ مکمل طور پر اس کے مماثل۔ کیونکہ کئی سارے پہلوؤں سے ان دونوں میں بہت سے فرق بہرحال پائے جاتے ہیں۔

ہمارے واقع اور مکی مرحلے کے واقع میں عملی طور پر جو فرق سمجھا جائے گا وہ یہ کہ لوگوں پر حکم لگانے اور ان کے خلاف کافر یا مشرک ہو جانے کا فتوی صادر کرنے میں ہمارے اور مکی واقع میں واضح فرق ہے البتہ خود وہ صورتحال جو آج ہمیں درپیش ہے اس کے شرک قرار پانے اور مکی مرحلے کی صورتحال کے شرک سمجھے جانے میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ فرق افراد کے مشرک قرار پانے میں ہے نہ کہ افراد کے فعل کو شرک سمجھا جانے میں، شرک کا پایا جانا یہاں بھی ہے اور وہاں بھی تھا البتہ لوگوں کا مشرک قرار پانے کا معاملہ ضرور مختلف ہے۔ اب دعوت کے لئے کیا منہج اپنایا جائے، اس کا انحصار شرک کے کسی جگہ پائے جانے پر ہے نہ کہ اس بات پر کہ وہاں لوگوں کو پکارا کیا جائے۔ شرک معاشرے میں اگر بے انتہا پھیلا ہے تو دعوت کا منہج اور لائحہ عمل کی بابت خود بخود یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسے مکی دعوت سے کتنا قریب ہونا چاہیئے، کہ اسی کی روشنی میں دعوتی ہدف تک رسائی کیلئے موثر ترین وسائل اور ذرائع اختیار کئے جانے کی ضرورت بھی آشکار ہو جاتی ہے۔

چنانچہ یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دعوت کے معاملے میں اسلام کی نسل اول کی اقتدا اختیار کرنے کا معاملہ اس سے کہیں وسیع تر ہے جتنا کہ بادی النظر دکھائی دیتا ہے اور یہ کہ بہت سارے پہلوؤں سے فرق ہونے کے باوجود بہت سے بنیادی امور ایسے ہیں جن میں آج بھی اسی دور سے رجوع کرنا لازم آتا ہے۔ لہٰذا مکی دور کا بغور مطالعہ کرنا اور کھلی آنکھوں سے اس کا بار بار مشاہدہ کرنا اب بھی فرض ٹھہرتا ہے۔ اسی سے ہمیں دعوت کی راہ میں آگے بڑھنے کا راستہ ملے گا اور یہیں سے اللہ کے فضل سے دین کے فہم اور بصیرت کی بند گرہیں کھلیں گی۔

☆☆☆☆☆☆☆

آج اگر ہم امت اسلام کے احوال دیکھیں ___ جیسا کہ واقعی دیکھنے کا حق ہے ___ تو ہمیں ایسے بے شمار انحرافات نظر آئیں گے جو کہ پچھلے چودہ سو سال کے دوران پیدا ہوئے اور لوگوں کو رفتہ رفتہ

حقیقتِ اسلام سے دور لے جانے کا سبب بنتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اسلام آج دوسری بار اسی غربت واجنبیت کا شکار ہو چکا ہے جس کی رسول اللہ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی:

بدأ الاسلام غريبا و سيعود غريباً كما بدأ (اخرجه مسلم) اسلام شروع میں تھا تو اجنبی تھا۔ عنقریب یہ پھر اسی طرح اجنبی ہو رہے گا جیسا کہ ابتداء میں تھا

اگر ہم ان انحرافات کا جائزہ لیں اور یہ جائزہ لینا ہمارا فرض بنتا ہے کیونکہ امت کے وجود کو لاحق مرض کی تشخیص کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں اور ایک صحیح تشخیص ہو جانے پر ہی اس بات کا تمام تر انحصار ہے کہ اس کی درستی کیلئے علاج تجویز ہو تو کیا ہو...... سو اگر ان انحرافات کا جائزہ لیں تو یہ بات کھلے گی کہ یہ انحراف صرف کردار اور رویے ہی میں نہیں بلکہ اسلام کے بنیادی مفہومات تک میں آ چکا ہے۔ اور یہ کہ اسلام کے سب کے سب مفہومات آج انحراف کا شکار ہو چکے ہیں۔ حتی کہ لا الـــــہ الا اللہ کا مفہوم بھی۔ بلکہ تو یہ انحراف شروع ہی لا الـــہ الا اللہ کا مفہوم غلط ہونے سے ہوا ہے۔ پھر عبادت کا مفہوم، تقدیر اور قضا و قدر کا مفہوم، دنیا اور آخرت کا مفہوم، تہذیب کا مفہوم، تربیت کا مفہوم، جہاد کا مفہوم [1] انحراف کا شکار ہونے سے کچھ بھی نہ بچا۔

اب جب ایسا ہے تو پھر ابتداء کہاں سے کی جائے؟ کیا لا الہ الا اللہ کا مفہوم درست کئے بغیر اور لوگوں پر اس کی حقیقت واضح کئے بنا کوئی چارہ کار ہے؟ کیا کاروبارِ زندگی کو راست بنیاد پر اور اسلام کی اساس پر قائم کیا جا سکتا ہے جب تک کہ لوگوں کے قلب و ذہن اور فکر و شعور میں لا الـــــہ الا اللہ کا فہم اور ادراک درست نہ کر لیا جائے؟ فکر و شعور میں حق کا ادراک گہرا اترنا ہے اور پھر اس ادراک کو دلوں میں ایک وجدان اور ایک برقی رو کی صورت دھارنا ہے جو دنیائے واقع میں ہر جامد چیز کو متحرک کر دینے کیلئے کافی ہو اور عملی رویہ و سلوک کو مطلوبہ رخ اور جہت دے سکے...... اصلاح کا یہی طریق کار ہے۔

آیئے ذرا دیکھیں کہ شعور و ادراک کی دنیا میں اس لا الہ الا اللہ کا مفہوم کس خرابی کا شکار ہوا۔

لا الـہ الا اللہ کا مفہوم یوں سمجھئے سکیڑ کر رکھ دیا گیا۔ یہاں تک کہ اب یہ محض ایک کلمہ ہو کر رہ گیا جسے بس زبان سے ادا کر دیا جاتا ہے۔ ایک اندوہناک اکثریت کی زندگی میں اس لا الہ الا اللہ کو اب کچھ

---

(۱) اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو ہماری (محمد قطب) تالیف: مفاهيم ينبغي أن تصحح

نہیں کرنا۔حتی کہ اس کلمہ کو اب شرک کے راستے میں رکاوٹ تک نہیں بننا، چاہے وہ عقیدے کا شرک ہو، چاہے پوجا اور پرستش کا شرک اور چاہے حکم وقانون کا شرک۔

ہمارے آج کے اس واقع میں اور بعثت نبوی کے وقت کے جاہلی واقع میں اگر کوئی فرق ہے تو یہی کہ تب لوگ کھلا کھلا شرک کرتے اور یہ کہنے کیلئے بھی تیار نہ تھے **لا الہ الا اللہ** کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، مگر ہمارے آج کے اس واقع میں ایک تھوڑی تعداد کو چھوڑ دیں تو اکثریت زبان سے کہتی ہے **لا الــہ الا اللہ** کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، مگر بعینہ اسی وقت شرک کی کسی ایک قسم میں یا شرک کی سبھی اقسام میں بھی پڑ چکی ہوتی ہے۔

جب ایسا ہے تو آج ہم اس بات کے شدید ضرورتمند ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اس منہج سے ملتا جلتا منہج اپنائیں جو آپ ﷺ نے مکہ میں اس وقت اپنایا تھا جب شرک عام تھا۔کیونکہ اس بات کی جتنی ضرورت اس وقت تھی اتنی ہی ضرورت آج بھی ہے کہ لوگوں پر **لا الــہ الا اللہ** کی حقیقت واضح کی جائے اور اس کی حقیقت کو پھر سے لوگوں کی عملی اور معاشرتی زندگی میں ڈھال دیا جائے۔

میں سمجھتا ہوں یہ مہم کوئی آسان اور مختصر مہم بھی نہیں۔اس مہم کی دشواری اور اس میں جان کھپانے کی ضرورت اس مہم سے کم نہیں جو دور اول میں اسلام کی غربت ختم کرنے کیلئے سر کی گئی تھی۔بلکہ اسلام کی اس غربت ثانیہ کو ختم کرنے کا چیلنج اس لحاظ سے شاید اس سے بھی کہیں بڑا ہے کیونکہ اسلام کی غربت اولی کو ختم کرنے کیلئے رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس موجود تھے جو کہ اسوہ بھی تھے اور ذریعۂ الہام بھی......

دور اول کی مشکل یہ تھی کہ تب ایک اڑیل قوم سے واسطہ تھا جو آباؤ اجداد کی راہ سے ایک انچ ہٹنے کیلئے تیار نہ تھی۔

| | |
|---|---|
| فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْماً لُّدّاً (مریم:۹۷) | پس اے محمدؐ ہم نے اس کلام کو تمہاری زبان پر آسان کر دیا، تا کہ تم پرہیز گاروں کو خوشخبری دو اور ضدی اڑیل لوگوں کو ڈرا دو |
| وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللّهُ قَالُواْ بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لاَ يَعْقِلُونَ شَيْئاً وَلاَ يَهْتَدُونَ (البقرۃ:۱۷۰) | ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کئے ہیں ان کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انہیں کی پیروی کئے چلے جائیں گے؟ |

البتہ اس دوسری بار کی غربت اسلام کے خاتمہ کیلئے اصل چیلنج یہ نہیں ہوگا کہ ہم لوگوں سے لا اله الا الله کہلوا لینے میں کامیاب ہو جائیں۔ یہ تو وہ صبح شام کہتے ہیں! بلکہ اس مہم کی اصل مشکل یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ لا الـه الا اللهصرف زبان سے ادا کر دینے سے وہ مسلمان ہو چکے ہیں اور یہ کہ حقیقت اسلام بھی بس یہ لفظ کہہ دینے کے ساتھ ہی خود بخود ان پر چسپاں ہوگئی ہے اب ان کا عملی رویہ کچھ بھی ہو اور اس لا الـه الا الله کو غیر معتبر کر کے رکھ دینے والے خواہ وہ کتنے ہی کام کریں اور عملی زندگی میں اس لا اله الا الله کے تقاضوں کو جتنا چاہے پائمال کریں بس اب وہ مسلمان ہیں۔ اور اگر آپ ان سے یہ کہیں کہ لا الـه الا الله کے کچھ صاف اور واضح واضح تقاضے ہیں جنہیں پورا نہ کیا جائے تو انسان کا مسلمان ہونا معتبر نہیں ہوتا بلکہ ان تقاضوں کو پورا نہ کرنے کی صورت میں خود لا اله الا الله کی زبان سے ادائیگی اس کو الٹا پھنسا دیتی ہے اور اسے مرتد تک قرار دلوا سکتی ہے تو وہ کبھی آپ کی بات پر یقین نہ کریں گے اور کہیں گے کہ یہ بات تو ہم نے کبھی سنی تک نہیں۔

لوگوں کی اکثریت آج فکر ارجاء (ایک گمراہ فرقہ کے افکار) کی آلودگی میں پڑ چکی ہے۔ فکر ارجاء جو کہ یہ کہتا ہے کہ جو شخص کلمہ گو ہے بس وہ مومن ہے چاہے اسلام کے اعمال میں سے کسی ایک عمل کی ادائیگی بھی وہ زندگی بھر نہ کر پایا ہو۔ فکر ارجاء جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان بس نبی کی تصدیق کر دینے کا نام ہے یا یہ کہ بس یہ تصدیق اور اقرار سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور یہ کہ عمل ایمان کے معنی اور مفہوم میں ہی شامل نہیں اور یہ کہ دین کے منافی اعمال اور اقوال جتنے بھی ہوں اور جس قسم کے بھی ہوں بس وہ صرف 'گناہ' کہے جا سکتے ہیں اور یہ بھی کہ: لا يضـر مع الايمان معصية "ایمان ہے تو گناہ جیسا بھی ہو ہمارا کچھ نہ بگاڑ پائے گا"!

لوگوں کو فکر ارجاء کی اس آلودگی سے پاک اور ان کو ایمان کے اسی صحیح مفہوم پر واپس لے آنا جس پر سلف صالحین رہے ہیں اور جس کی رو سے ایمان قول بھی ہے ایمان اعتقاد کا نام بھی ہے اور ایمان عمل بھی ہے...... یہ کام ہی دراصل اس دور کے 'غرباء' کے کرنے کا اصل کام ہے...... وہ غرباء جن کو خود رسول اللہ ﷺ نے بے پناہ اجر کی خوش خبری دے رکھی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

طوبیٰ للغرباء — خوش خبری ہو (آخر دور کے ان لوگوں کو جو) اجنبی اور عجیب وغریب (نظر آئیں گے)

ایک روایت کے الفاظ میں، فرمایا:

**فطوبیٰ للغرباء یصلحون ما أفسد الناس من سنتی** (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن)

خوش خبری ہو (اس دور کے ان لوگوں کو جو) اجنبی اور عجیب وغریب (نظر آئیں گے) کہ لوگوں نے میرے راستے کو جس طرح خراب کردیا ہوگا یہ اس کو سنوارنے اور نکھارنے میں لگے ہونگے

تربیت کے بارے میں ہم ایک علیحدہ فصل میں الگ سے بات کریں گے۔ یہاں ہم یہ طے کرنا چاہتے ہیں کہ اس وقت دعوت کا نقطۂ آغاز دراصل یہ ہے کہ آج کے معاشروں پر **لا الہ الا اللہ** کی حقیقت واضح کی جائے جس پر کہ اسلام کی غربت ثانیہ کے اس دور میں بے انتہا دھول پڑ چکی ہے، اسلام کی وہ حقیقت کہ جس سے جب پردہ اٹھایا جاتا ہے تو لوگ حیران اور متعجب ہونے لگتے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس پر بھی اتفاق ہو جائے کہ **لا الہ الا اللہ** کے تقاضوں کی بنیاد پر لوگوں کی تربیت کرنا تو خیر اس سے بھی بڑی بات ہے صرف **لا الہ الا اللہ** کی حقیقت لوگوں پر واضح کرنا ہی کوئی آسان اور مختصر مہم نہیں، یہ صرف اتنا کام نہیں کہ لوگوں کو کچھ 'معلومات' فراہم کر دی جائیں یا ایک آدھ خطبے یا ایک آدھ درس اور تقریر یا ایک آدھ کتابچے کے ذریعے ہو جانے والا کام نہیں۔ یہ ایک مسلسل اور پر مشقت کام ہوگا۔ اس کو پورے زور سے بڑے صبر اور استقلال کے ساتھ کیا جاتا رہنا ہوگا۔ اس کو سوچ اور فکر میں گہرا اتارنے کیلئے انسانی نفس کے سبھی گوشوں کا احاطہ کرنا ہوگا۔ ذہن و فکر سے عقیدہ ارجاء کی آلودگی کو کھرچ کھرچ کر اتارنا ہوگا۔ لادین اور سیکولر افکار کی جو دبیز تہیں اسلام پر جم گئی ہیں اس سے اس کا دمکتا چہرہ صاف کرنا ہوگا۔ پرانے دور کا فکرِ ارجاء اور نئے دور کا سیکولرزم...... یہ دونوں فتنے محض دھول نہیں جو اسلام کے اصل چہرے کو ایک بڑی اکثریت کے فکر و ذہن کی دنیا میں چھپا چکی ہے بلکہ یہ زنگ ہے جو فکر و عمل کی دنیا میں بھی بہت گہرا اتر چکا ہے۔ عقیدے کی دیواروں کو کھا چکا ہے۔ عقیدے کے مفہومات کے اندر بہت دور تک جا چکا ہے۔ یہ عقیدے کو اس کی اصل قوت اور فاعلیت سے محروم کر چکا ہے جو اس عقیدے کو معاشرے میں اس وقت حاصل تھی۔ جب یہ اللہ کے ہاں سے نازل ہوا تھا اور جب اس کی حقیقت اجلی اور نکھری نظر آتی تھی...... اس زنگ کو اتارنا محض کچھ گرد و غبار جھاڑنے والی بات نہیں۔ یہ واقعتاً ایک پیچیدہ کام ہے اور ایک بہت بڑی اور زبردست مہم۔

پھر یہ بات طے ہو جانا بھی ضروری ہے کہ اس مہم میں کسی قسم کی جلد بازی...... چاہے وہ جلد بازی اس خیال سے ہو کہ اسلام کی حقیقت ایک بدیہی امر ہے اور خود ہی بہت واضح ہے جس پر کوئی لمبی

چوڑی محنت کرنے کی ضرورت نہیں یا یہ جلد بازی یہ سوچ لینے سے آئے کہ اسلام کی حقیقت واضح کرنے پر جتنی کچھ محنت ہو چکی اور جتنا کچھ پڑھا پڑھایا گیا، بس وہ کافی ہے یا یہ جلد بازی اس وجہ سے ہو کہ ہمارے پاس کرنے کے اور بہت سے کام ہیں اور ہمیں اتنے بڑے بڑے چیلنج درپیش ہیں کہ اتنا وقت نہیں کہ لا الہ الا اللہ کے بنیادی تقاضوں پر لوگوں کی تربیت تو کیا لا الہ الا اللہ کی حقیقت پڑھانے کیلئے ہی سر جوڑ کر بیٹھ جایا جائے......غرض یہ جلد بازی چاہے کسی وجہ سے ہو اس سے کچھ ہاتھ آنے کا نہیں...... یہ جلد بازی دعوت کی کوئی خدمت نہ کرے گی اور دعوت کا ثمر آور ہونا بھی اس راہ سے کبھی ممکن نہیں۔

اسلام کی نسل اول اور دور اول کی اقتداء کرنے کا جو مقدمہ ہم نے بیان کیا ہے اس میں دیکھنا یہ ہے کہ وہ مرکزی اور اساسی بات کیا ہے جس کی ہمیں اقتداء کرنی ہے۔ یہ بات واضح ہو جانے کیلئے ایک بہترین ذریعہ خود قرآن ہی ہے۔ اسلام اور لا الــہ الا اللہ کی حقیقت کا بیان ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر قرآن پوراز ور صرف کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تمام تر توجہ کا محور یہی ایک مسئلہ نظر آتا ہے۔ آپ ﷺ کے پیش نظر اور خود قرآن کے پیش نظر بھی یہی بات نظر آتی ہے۔ اور پھر اس لا الــــہ الا اللہ کی بنیاد پر انسانوں کی تربیت پایہ تکمیل تک پہنچانا تو اس سے بھی بڑی بات ہے۔ زمانۂ تنزیل اور خود رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے زیادہ سال یہی ایک مسئلہ لے گیا حتی کہ آپ ﷺ کی محنت اور جدوجہد پر بھی اسی ایک مسئلے کا حق سب سے بڑھ کر رہا۔

اگر ہمارا یہ خیال ہو کہ قرآن مجید کی مکی سورتوں کی تمام تر ترکیز کا محور اور بار بار تکرار کا موضوع لا الہ الا اللہ کی حقیقت کا بیان اس وجہ سے تھا کہ ابتدائے اسلام میں قرآن کے مخاطب جو لوگ تھے وہ مشرک تھے......تو ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ آج جو لوگ اس دعوت کے مخاطب ہیں وہ بھی سب کے سب مشرک نہیں تو ان کی اکثریت کسی نہ کسی انداز سے شرک میں پڑی ہوئی ضرور ہے اور یہ کہ یہ لوگ جس شرک میں پڑے ہیں اس کی نوعیت اس شرک سے بہت مختلف نہیں جس میں عرب کے مشرکین پڑے ہوئے تھے......خواہ وہ اعتقاد کا شرک ہو، خواہ پوجا اور پرستش کا شرک ہو اور خواہ حاکمیت (حکم وقانون) کا شرک۔

لیکن اس سے بھی بڑھ کر جو چیز ہمیں یاد رکھنی چاہئے وہ یہ کہ اس مسئلے پر ہمیشہ اتنا زور دینے کی ضرورت بس اسی وجہ سے نہیں ہوا کرتی کہ دعوت کے مخاطب لوگ مشرک ہوں یا شرک میں پڑے ہوئے ہوں بلکہ خود مومن بھی اسی مسئلے کی مسلسل اور بار بار یاددہانی کے ضرورت مند ہوا کرتے ہیں اور

اسی کے تقاضوں کی بنیاد پر ہی ان کی تربیت ہونا ہوتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن اترنے کے دوران جب مسلم جماعت ایک بھرپور انداز سے وجود پا چکی تھی، اس جماعت کو زمین میں قوت اور تمکین بھی حاصل ہو چکی تھی، بلکہ اس لا الــه الا الله کی خاطر وہ کئی جنگی معرکے بھی لڑ چکی تھی، تب بھی قرآن میں لا اله الا الله پر بات کی جاتی رہنا موقوف نہ ہوا تھا۔ یہ سورت ''نساء'' ہے جس میں اللہ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ آمِنُواْ بِاللّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَى رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِيَ أَنزَلَ مِن قَبْلُ وَمَن يَكْفُرْ بِاللّهِ وَمَلاَئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلاَلاً بَعِيداً (النساء:١٣٦)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل کی ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخرت سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا

مدنی سورتوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی آیات بکثرت نازل کیں جو اسلام کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی ہدایات کو لا اله الا الله اور اس کے تقاضوں کے ساتھ جوڑنے کیلئے آتی رہیں:

قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاء وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاء وَتُعِزُّ مَن تَشَاء وَتُذِلُّ مَن تَشَاء بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىَ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ تُولِجُ اللَّيْلَ فِي الْنَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الَمَيَّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَن تَشَاء بِغَيْرِ حِسَابٍ لاَّ يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاء مِن دُوْنِ الْمُؤْمِنِينَ (آل عمران:٢٦،٢٨)

کہو! خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے، حکم و اقتدار دے اور جس سے چاہے، چھین لے۔ جسے چاہے، عزت و تمکنت بخشے اور جسے چاہے، ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے دست اختیار میں۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں۔ جاندار میں سے بے جان کو نکال لاتا ہے اور بے جان میں سے جاندار کو۔ جسے چاہتا ہے، بے حساب رزق دیتا ہے اور مومنین اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور دوست نہ بنائیں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَطِيعُواْ اللّهَ وَأَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلاً (النساء:٥٩)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے

قرآن میں اس کی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ **لا الہ الا اللہ** کوئی ایسا سبق نہیں جو ایک بار پڑھ لیا تو پھر اور اسباق کی جانب رخ کیا جائے۔ بلکہ جیسا کہ اس سے پہلے میں اپنی کسی اور کتاب میں کہہ چکا ہوں **لا الـــــہ الا اللہ** ایک ایسا سبق ہے جسے پڑھا جائے تو پھر ہر نئے سبق کے ساتھ ہر بار پھر پڑھا جائے اور قیامت تک یہ امت بس اسی سبق کو دہراتی رہے...... کہ اس امت کا ہمیشہ یہی موضوع رہنا ہے

☆☆☆☆☆☆☆

## لوگوں پر لا الہ الا اللہ کی حقیقت واضح کرنے کا طریق کار کیا ہو؟

وہی جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی کتاب میں متعین کر دیا ہے:

| | |
|---|---|
| ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (النحل:۱۲۵) | اے نبی! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت (موعظہ حسنہ) کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے۔ |

یہ واضح ہو جانا ضروری ہے کہ حکمت اور موعظۂ حسنہ یہ نہیں کہ لوگوں کو ان کی غلطیاں اور ان کے انحرافات کی سنگینی کچھ کم کر کے بتائی جائے۔ یا لوگوں کے جذبات کو تھپکیاں دی جائیں تا کہ وہ ہم سے خوش ہو جائیں اور پھر ہماری بات تسلیم کرنے لگیں۔

حکمت اور موعظۂ حسنہ سے اللہ کی جو کوئی مراد ہو سکتی ہے اس سے سب سے زیادہ واقف خود اسی کے رسول کو ہونا چاہئے جسے کہ یہ حکمت اور موعظہ حسنہ کا حکم سب سے پہلے اور براہ راست ملا۔ تو پھر آپؐ نے یہ فرض کیسے ادا کیا؟ کیا آپؐ نے لوگوں سے شرک کے معاملے پر کسی گول مول رویے اور کسی لاگ لپیٹ سے کام لیا؟ کیا آپ نے اس بات سے کوئی اجتناب برتا کہ لوگوں کو، جس عقیدے اور جس راستے پر وہ ہیں، اس کی صاف صاف اور کھلی کھلی حقیقت نہ بتا دیں؟

رسول اللہؐ کو صرف حکمت اور موعظہء حسنہ ہی کا حکم تو نہ تھا۔ یہ آیت بھی تو آخر آپ پر ہی اتری تھی!

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (الحجر:۹۴) اے نبی جو تمہیں حکم دیا جارہا ہے اسے بابانگ دہل بیان کردو۔

یہاں مشرکین رسول اللہ ﷺ کی شکایت لے کر آپ کے چچا ابوطالب کے پاس آتے ہیں اور آ کر کہتے ہیں:

''اس نے ہماری عقل اور ہماری سمجھ بوجھ کا مذاق اُڑایا ہے۔اس نے ہمارے خداؤں کی توہین کی ہے اور ہمارے باپ دادا کی تکفیر''۔

رسول اللہ ﷺ کا عرب جاہلیت کے ساتھ اس صریح انداز میں مڈ بھیڑ کرنا دراصل اس حکمت اور موعظۂ حسنہ ہی کا تقاضا تھا جس کا کہ آپؐ کو قرآن میں حکم ملا تھا۔

دعوت کے اس مرحلے میں حکمت سے ایک بڑی مراد دراصل یہ تھی کہ اس مرحلے میں وہ اپنے ہاتھ روکے رہیں۔ مشرکین کے ساتھ قبل از وقت کوئی معرکہ نہ چھیڑ لیں اور یوں مشرکوں کو طیش دلا کر تشدد اور زیادتی کیلئے خود سے کوئی وجہ جواز فراہم نہ کردیں .... مگر حقائق کو بلاکم وکاست اور ڈنکے کی چوٹ بیان کرنے کا کام بہرحال ہونا چاہیئے۔

یہیں سے ہم ایک اہم نقطے تک پہنچتے ہیں جس کا اپنے اس دور حاضر کے مسائل سے گہرا تعلق ہے۔ یہ واضح ہونا ضروری ہے کہ اِسلام کے اِس دور اولین میں ہمارے لئے نمونہ کہاں پوشیدہ ہے۔مسئلہ یہ ہے کہ کیا یہ ہمارے لئے مناسب تھا یا ہے کہ موجودہ حالات میں برسر اقتدار طبقوں کے ساتھ ہم کسی مسلح تصادم کی راہ اختیار کرلیں؟

رہی یہ بات کہ برسر اقتدار طبقے جن کا اقتدار اللہ کی شریعت پر قائم نہیں .... یہ برسر اقتدار طبقے، ہم کچھ نہ بھی کریں تو وہ ہم پر ظلم اور جارحیت پھر بھی اور ہر حال میں کریں گے، تو اِس بات کی تو ہمیشہ ہی توقع رکھنی چاہیئے، کیونکہ یہ اللہ کی ایک ابدی سنت ہے۔ایسا آج تک ہوا ہی نہیں کہ جاہلیت کا اقتدار کبھی لا الہ الا اللہ کی دعوت سے راضی ہوگیا ہو یا حتی کہ اس سے عارضی متارکۂ جنگ پر ہی آمادہ ہوا ہو چاہے اس متارکۂ جنگ کا مطالبہ کسی وقت خود لا الہ الا اللہ کی دعوت کی جانب سے ہی کیوں نہ ہوا ہو!

جب شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا:

وَإِن كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنكُمْ آمَنُواْ بِالَّذِيَ أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يْؤْمِنُواْ فَاصْبِرُواْ حَتَّى يَحْكُمَ اللّهُ بَيْنَنَا وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ (الأعراف:٨٧)

اگر تم میں سے ایک گروہ اس دعوت پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں، ایمان لے آیا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لایا، تو صبر کے ساتھ دیکھتے رہو، یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے، اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے

تو قوم کے (ملأ) برسراقتدار طبقوں نے اس التوائے جنگ کی پیشکش کو بڑی لاپروائی سے ٹھکرا دیا اور اِسی بات پر مصر ہوئے کہ اہل ایمان کو یا تو بستی سے نکال دیا جائے اور یا پھر وہ اپنا دین چھوڑ دیں:

قَالَ الْمَلأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُواْ مِن قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُواٌ مَعَكَ مِن قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِينَ (الاعراف:٨٨)

اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، اس اے شعیب، ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی اس بستی سے نکال کر رہیں گے، یا پھر تم لوگوں کو ہماری ہی ملت میں واپس آنا ہوگا۔ شعیب نے جواب دیا کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں؟

آج کی جدید جاہلیتوں میں، جو کہ اپنے آپ کو آزاد اور جمہوری کہتی ہیں، ہر طبقے اور ہر دعوت کو آزادی حاصل ہے سوائے اس ایک طبقے اور ایک دعوت کے جو کہ لا الہ الا اللہ کی دعوت ہے۔ ہماری بات کو ثابت کرنے کیلئے، الجزائر میں جو ہوا وہی بہت کافی ہے، جہاں اسلام پسندوں نے، قطع نظر اس سے[1] کہ ان کا ایسا کرنا غلط تھا یا درست، جاہلیت کے دیے ہوئے قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کی، جاہلیت کی لگائی ہوئی شرط کو پورا کرتے ہوئے بیلٹ باکس بھی بھر دیے اور اکثریت بھی لے کر دکھا دی..... مگر کیا دیکھتے ہیں جاہلیت اپنے ہی دیے ہوئے اصولوں کو پہچاننے سے انکار کر دیتی ہے، جبکہ اس کے یہ اصول کہنے کیلئے سب طبقوں اور منشوروں کیلئے یکساں طور پر دستیاب ہیں اور جس کو بھی کچھ تبدیلی لانی ہے اس کو یہی راستہ اختیار کرنے کی ہدایت ہوتی ہے مگر بات اسلام پسندوں کی آتی ہے تو جاہلیت کا جواب ہوتا ہے:

**لنخرجنکم...... أو لتعودن** ''ہم تمہیں نکال کر رہیں گے یا پھر تمہیں اپنی ملت چھوڑ کر آنا ہوگا''!

اس سوال کی کوئی گنجائش نہیں کہ آیا ایسا کوئی طریقہ ہے جسے اختیار کرنے سے جاہلی اقتدار اسلام کی دعوت پر غضبناک ہونا موقوف کر دے۔ اس پر سوچنا وقت کا ضیاع ہے۔ ہم نے جو سوال رکھا ہے بس وہ یہ ہے کہ کیا ہمارے لئے مناسب تھا یا ہے کہ موجودہ حالات میں برسراقتدار طبقوں کے ساتھ ہم از خود کسی مسلح تصادم کی راہ اختیار کر لیں؟

اس سوال کا جواب دینے کیلئے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ اُمت کی نشأۃ اولیٰ یعنی اسلام کے دوراول سے اس معاملے میں ہمیں کیا سبق ملتا ہے اور جس پر کہ پچھلی فصل میں ہم کچھ گفتگو کر بھی آئے ہیں۔ ابتداءً یہ سوال ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کفار کی جارحیت کا مسلح جواب دینے کی اجازت کب دی اور یہ کب کہا:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ (الحج:٣٩) اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے

## ہاتھ اُٹھانے کی اجازت اُس وقت ملی جب یہ کام تکمیل پا چکے تھے:

۱) لا الہ الا اللہ کے تنازعہ کا واضح کیا جانا ....

۲) اقتدار کا جواز رکھنے کا مسئلہ آشکار ہو جانا ....

۳) دعوت کے حامل جتھے کی مضبوط معاشرتی بنیادوں پر تیاری ہوئی ہونا ....

۴) انصار کے آنے کے ساتھ اس جتھے کی توسیع ہونا ....

۵) اس جتھے کی نہایت اخلاص اور تجرد کی بنیاد پر تربیت ہونا ....

اب ذرا دیکھ لیجئے اس وقت اِن امور میں سے کون کون سے کام اور کس حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچ پائے ہیں:

☆☆☆☆☆☆☆

۱) کیا لا الہ الا اللہ کے مسئلے کی پوری وضاحت ہو چکی؟ عوام کی سطح پر تو خیر بڑی بات ہے کیا خود اسلام کے داعیوں پر بھی یہ لا الہ الا اللہ کی حقیقت واضح ہے؟

کیا اِسلام کے داعیوں پر آج یہ واضح ہے کہ اللہ کی شریعت کے ماسوا قانون چلانا شرک کی وہ قسم ہے جو آدمی کو دائرۂ ایمان سے خارج کر دیتی ہے؟ اور یہ کہ اس قانون کو ماننا بھی اسی طرح دائرۂ ایمان سے خارج کر دینے والا شرک ہے؟ اور یا پھر معاملہ ایسا ہے کہ اسلام کے داعیوں کے مابین ابھی یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے؟ کچھ اس کے قائل ہیں اور کچھ اِسے محلِ نظر جانتے ہیں!!

---

(۱) اس پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔

لوگوں پر فتویٰ لگانے کی بات الگ رکھ دیجئے۔ اس مسئلے پر یہاں گفتگو کی گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔ ہم ہمیشہ ہی اس بات کی اہمیت واضح کرتے رہے ہیں کہ لا الہ الا اللہ کی حقیقت بیان کرنے کا کام چھوڑ کر لوگوں پر فتویٰ لگانے میں پڑ جانا اس وقت ہمارے کرنے کا کام نہیں۔

دراصل یہ دونوں الگ الگ مسئلے ہیں۔ یا یوں کہیے یہ دونوں مسئلے الگ الگ رہنے چاہئیں۔ لا الہ الا اللہ کی حقیقت کا بیان اور لوگوں پر فتوی لگانے کا کام۔ ایک مسئلہ خالصتاً تعلیمی اور دعوتی ہے۔ حقائق کے کھلے کھلے بیان سے متعلق ہے...... کیونکہ یہ حقائق اسلام کے دوسری بار غربت واجنبیت کا شکار ہو جانے کے باعث لوگوں پر واضح نہیں رہے اور ہم داعیوں کے پاس یہ خدا کی امانت ہے جسے بلا کم وکاست اور کچھ چھپائے بغیر لوگوں تک پہنچا دینا ہم پر فرض ہے اور ان حقائق کے واضح نہ ہونے ہی کے باعث لوگ اِن سے اجنبیت اور بے یقینی کا اظہار کرتے ہیں...... جبکہ دوسرا مسئلہ ایک بات کو لوگوں پر لاگو کرنے سے متعلق ہے۔ لوگوں پر حکم لگانے سے پہلے اولاً تو یہ ضروری ہے کہ ان پر حجت قائم کر دی جائے۔ ان پر پوری شرح وبسط کے ساتھ مسئلے کو بیان کر دیا جائے۔ ان کے ذہن میں اس پر کوئی الجھاؤ باقی نہ رہنے دیا جائے، اور ہر ایسے شبہے کا ازالہ کر دیا جائے جس کا پردہ ہو جانے سے حق کا کوئی پہلو چھپا رہ گیا ہو اور جس کے سبب لوگوں سے اِسلام کی حقیقت اوجھل رہنے لگی ہو۔

ہم یہ سوال پھر دہراتے ہیں: کیا اللہ کی شریعت کو چھوڑ کر کوئی اور قانون چلانے کا مسئلہ ____ عوام کی بات جانے دیجئے ____ خود داعیوں پر بھی کیا واضح ہے یا ابھی وہ اس اشکال سے باہر نہیں آ سکے کہ عبداللہ بن عباسؓ کے قول: کُفْرٌ دُونَ کُفْرٍ (کہ یہ کفر تو ہے مگر وہ کفر نہیں جس سے آدمی دائرہ اِسلام سے خارج ہو جاتا ہے) عبداللہ بن عباسؓ کے اس قول کی رو سے ہمارے ان نظاموں کا حکم بدستور کفر وشرک ہی ہے یا کہیں نرمی کی گنجائش ہے!؟ جس چیز کے بارے میں عبداللہ ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ یہ کُفْرٌ دُونَ کُفْرٍ ہے (یعنی کفر تو ہے مگر وہ کفر نہیں جس سے آدمی دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے) وہ قانون سازی کا عمل نہیں۔ وہ اللہ کی شریعت کو چھوڑ کر کوئی اور قانون چلانا نہیں۔ عبداللہ ابن عباسؓ کی مراد بالکل کچھ اور ہے اور وہ یہ کہ کوئی قاضی یا حاکم صرف کسی ایک خاص مقدمے میں شریعت کے خلاف فیصلہ صادر کر دیتا ہے، چاہے وہ جہالت سے ایسا کرے، یا کسی تاویل کی وجہ سے، یا کسی مفاد کی ترغیب میں آ کر، یا رشوت لے کر یا ہوائے نفس کی بنا پر، تو ایسا شخص کفر کا ارتکاب تو کرتا ہے مگر اس کفر کا ارتکاب نہیں جو

اسے دائرہ اسلام سے خارج کر دے۔ ایسا شخص تو عبداللہ بن عباسؓ کی مراد ہی نہیں جو اپنے اس خلافِ شریعت فیصلے کو ملک کے طول وعرض میں ایک حکمِ عام اور ایک واجب الاتباع قانون کا درجہ بھی دے دے۔

ایک ایسا قاضی یا جج جس کے پاس ایک رنگے ہاتھوں شراب پیتے شخص کو پکڑ کر لایا گیا ہو، اس کا جرم ثابت ہوتا ہو، منہ سے شراب کی بدبو آ رہی ہو مگر پھر بھی وہ اُس پر حد نہیں لگاتا کیونکہ وہ اس کے اہل خانہ سے رشوت کھائے بیٹھا ہے، اور اس وجہ سے وہ اس کیس میں کوئی باریکیاں اور نکتے نکال کر بیٹھ جاتا ہے اور یوں کوئی نہ کوئی حجت کر کے مجرم پر شریعت کا حکم لاگو کرنے سے راہ فرار اختیار کر جاتا ہے تو وہ ایک فاسق قاضی تو ہوگا مگر وہ اس فسق کی بنا پر کافر نہیں ہوگا.... ہاں البتہ جس دن وہ یہ کہنے لگے کہ شراب پینا کوئی جرم ہی نہیں یا یہ کہ جرم تو ہے مگر اس پر یہ کوڑوں کی حد نہیں لگے گی بلکہ اسے کوئی اور سزا دی جائیگی تو تب وہ شخص کافر ہی کہلائے گا اور اس کا کفر بھی وہ ہوگا جو اسے ملت سے خارج کر دے۔ کیونکہ اس نے اس فیصلے کی رو سے ایک حکمِ عام اور ایک قانون صادر کیا ہے جو کہ شریعت سے براہ راست متصادم ہے۔ ایسے شخص کے کافر ہونے پر سب کے سب فقہا کا اتفاق ہے۔

جب تاتاریوں نے یاسق (توشۂ چنگیزی) کو قانون کے طور پر چلایا اور یاسق جس کے بارے میں امام ابن کثیر کہتے ہیں:

> یاسق (توشہ چنگیزی) کچھ احکام اور قوانین کا مجموعہ ہے۔ اس کے کچھ احکام وقوانین قرآن سے ماخوذ ہیں، کچھ انجیل سے، کچھ تورات سے اور کچھ ایسے ہیں جو چنگیز خان نے خود وضع کئے۔

سورہ مائدہ کی اس آیت:

| | |
|---|---|
| أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ (المائدۃ:۵۰) | کیا یہ جاہلیت کا قانون چاہتے ہیں۔ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے اور قانون دینے والا کوئی نہیں ہے |

سورہ مائدہ کی اس آیت کے تحت امام ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> آیت میں اللہ تعالیٰ ایسے شخص کا انکار فرماتا ہے جو اللہ کے حکم وقانون سے خروج کرے جبکہ اللہ کا حکم وقانون خیر ہی خیر ہے اور ہر برائی کا خاتمہ کرتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر نکیر فرماتا ہے جو اللہ کے حکم وقانون کو چھوڑ کر ان دوسری آراء

واصطلاحات کو اپناتا ہے جو انسانوں نے آپس میں اپنے لئے مقرر ٹھہرا لی ہیں اور جن پر اللہ کی شریعت سے کوئی سند نہیں، جیسا کہ اہل جاہلیت بھی اپنی گمراہیوں اور جہالتوں کو بنیاد بنا کر اپنا قانون چلاتے تھے اور جن کا مصدر ان کی اپنی ہی اہواء وآراء ہوتی تھیں، اور جیسا کہ یہ تاتاری اپنے شاہی قوانین وفرامین چلاتے ہیں اور جن کا ماخذ ان کے بادشاہ چنگیز خان کا وضع کیا ہوا یاسق (توشہء چنگیزی) ہے اور جو کہ مختلف قانونی احکام کا مجموعہ ہے جو مختلف شریعتوں سے لئے گئے ہیں جن میں یہودیت، نصرانیت اور اسلام اور دوسری شریعتیں سب آتی ہیں .... اور اس کے بہت سے قوانین خود اس کے اپنے ہی فکر و ہویٰ سے لئے گئے ہیں... اور یوں یہ یاسق (توشہء چنگیزی) اس کی اولاد میں ایک قانون اور دستور کا درجہ پا چکا ہے اور اِسے وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو لاگو کرنے پر مقدم رکھتے ہیں .... سو جو شخص ایسا کرتا ہے وہ کافر ہے۔ اس سے قتال واجب ہے تا آنکہ وہ اللہ اور رسول کے قانون کی جانب پھر نہ آئے اور تا آنکہ وہ ہر چھوٹے اور بڑے معاملے میں اللہ اور رسول کے قانون کے مطابق فیصلے نہ کرنے لگے۔ (ملاحظہ فرمایئے تفسیر ابن کثیر جلد۲، ص ۶۸)

اب ظاہر ہے کہ امام ابن کثیرؒ کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس قول کا بہت اچھی طرح علم تھا جس کا ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں۔ مگر امام ابن کثیر کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس قول کی بنا پر دیکھ لیجئے کوئی بھی اشکال نہ ہوا کیونکہ امام ابن کثیر اپنے علم وفقہ کی بدولت ان دو باتوں کا علمی فرق جانتے ہیں: ایک یہ کہ کسی ایک خاص مقدمے میں ما انزل اللہ کے برخلاف فیصلہ کر دینا اور دوسرا یہ کہ ما انزل اللہ کے برخلاف ایک باقاعدہ قانون چلانا۔

اس مسئلے پر شیخ مفتی محمد بن ابراہیم بن عبداللطیف آل الشیخ [1] جن کی غزارتِ علم اور بیانِ حق کی ایک دنیا شہادت دیتی ہے، نے بہت زبردست گفتگو کی ہے۔ چنانچہ مفتی محمد بن ابراہیمؒ تفسیر ابن کثیر کی مذکورہ بالا عبارت درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

دیکھ لیجئے اللہ تعالیٰ نے خلافِ شریعت حکم چلانے والوں پر کیا کیا فرد جرم عائد کی ہے: کفر، ظلم اور فسق۔ ناممکن ہے کہ شریعت کے ماسوا قانون چلانے والے کو اللہ کافر کہے اور وہ کافر نہ ہو۔ لازماً وہ کافر ہے چاہے وہ کفر عملی کی بنا پر کافر ہو، چاہے کفر اعتقادی کی بنا

پر۔اور جو عبداللہ ابن عباسؓ کا قول اس آیت کی تفسیر میں بروایت طاؤس وغیرہ وارد ہوا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حاکم بغیر ما انزل اللہ کفر کا مرتکب تو ہوتا ہے چاہے یہ وہ اعتقادی کفر ہو جو ملت سے خارج کر دیتا ہے اور چاہے وہ عملی کفر ہو جو ملت سے خارج نہیں کرتا۔ جہاں تک پہلی قسم یعنی کفر اعتقادی کا تعلق ہے تو اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں:

### کفر اعتقادی کی پہلی صورت:

یہ کہ حاکم بغیر ما انزل اللہ اس بات کا انکار کرے کہ اللہ اور رسول کا حکم ہی برحق ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کا بھی یہی مفہوم ہے، اسی مفہوم کو امام ابن جریرؒ نے اختیار کیا ہے، اور وہ یہ کہ کوئی شخص اللہ کی نازل کردہ شریعت کے ایک حکم کا سرے سے انکار ہی کر دے، اس مسئلے پر اہل علم میں کوئی بھی نزاع نہیں۔ چنانچہ اہل علم کے ہاں متفق علیہ اصول ہے کہ جو شخص اصول دین میں سے کسی چیز کا انکار کرتا ہے، یا حتی کہ فروع دین میں سے بھی کسی اجماعی مسئلہ کا انکار کر دیتا ہے، یا رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے کسی ایک حرف کا بھی انکار کر دیتا ہے تو ایسا شخص کافر ہے اور اس کا کفر وہ ہے جس سے وہ ملت سے خارج ہو جائے۔

### کفر اعتقادی کی دوسری صورت:

یہ کہ وہ شخص جو اللہ کی شریعت کے ماسوا قانون چلاتا ہے اس بات کا انکار تو نہ کرے کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم وقانون ہی برحق ہے، مگر یہ اعتقاد رکھے کہ رسول کے ماسوا کسی کا حکم وقانون رسول کے حکم وقانون سے بہتر یا مکمل تر یا لوگوں کے معاملات ومسائل اور وقت کی ضروریات پوری کرنے کے لحاظ سے مناسب اور جامع تر ہے۔ خواہ وہ (شریعت کے ماسوا قانون کو شریعت سے بہتر) مطلق طور پر سمجھے یا جدید حالات اور دور حاضر کے نئے مسائل کے حوالے سے، ایسے شخص کے بارے میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں کہ وہ کافر ہے کیونکہ یہ مخلوق کے بنائے ہوئے احکام کو جو محض ذہن وفکر کی پراگندگی ہے خدائے دانا وقابل صد ستائش پر ترجیح دیتا ہے۔ زمانہ کتنا بھی تبدیل ہو جائے اور حالات واقعات میں کتنا بھی ارتقاء آ جائے، اللہ اور رسول کا حکم فی ذاتہ

تبدیل نہیں ہوتا، جبکہ انسانی زندگی کا کسی دور میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ بھی ایسا نہیں جس کا بہترین حل کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں موجود نہ ہو، خواہ نصِ ظاہری کی صورت میں ہو یا استنباط کی صورت میں یا کسی اور شکل میں، یہ الگ بات کہ کوئی اس کا علم پا لیتا ہے اور کوئی نہیں پاتا ....

کفر اعتقادی کی تیسری صورت:

کہ وہ یہ تو اعتقاد نہ رکھے کہ کوئی اور قانون اللہ اور رسول کی شریعت سے بہتر ہے، البتہ یہ اعتقاد رکھے کہ وہ اور شریعت یکساں ہیں۔ کفر اعتقادی کی پچھلی دونوں صورتوں کی طرح یہ شخص بھی کافر ہے اور ملت سے خارج۔ کیونکہ یہ اپنے اس اعتقاد کی رو سے مخلوق اور خالق کو ایک مرتبے پر رکھتا ہے اور اللہ کے اس فرمان سے تعارض اور عناد کا مرتکب ہوتا ہے کہ لیس کمثله شيء کہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں بلکہ وہ ان اور آیات سے بھی عناد برتتا ہے جن سے اللہ رب العزت کا کمالِ حکمت میں یکتا ہونا اور مخلوق کی مماثلت سے مبرا ہونا ثابت ہے خواہ یہ اللہ کا اپنی ذات میں یکتا ہونا ہو یا صفات میں یا افعال میں ہو یا مخلوق کے معاملات و مسائل کے فیصلے کرنے میں۔

کفر اعتقادی کی چوتھی صورت:

کہ وہ یہ اعتقاد تو نہ رکھے کہ کوئی دوسرا قانون اللہ اور رسول کی شریعت سے بہتر ہے حتی کہ یہ اعتقاد بھی نہ رکھے کہ یہ دونوں یکساں ہیں البتہ یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ اور رسول کی شریعت کے برخلاف قانون چلانے کی گنجائش ہے۔ اس کا بھی وہی حکم ہے جو پچھلی تینوں صورتوں کا ہے۔ کیونکہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اللہ اور رسول کے فیصلے کے خلاف فیصلہ کر دینا جائز ہے جبکہ اس کا حرام ہونا دین کی صحیح اور صریح اور قطعی نصوص سے ثابت ہے۔

---

(۱) سعودی عرب کے سابق مفتی عام اور وہاں کے یکے از کبار علماء

**کفر اعتقادی کی پانچویں صورت:**

جو کہ کفر اعتقادی کی باقی سب صورتوں سے زیادہ سنگین اور زیادہ عام ہے اور جو کہ شریعت سے تصادم اور شرعی قوانین کو نظر انداز کرنے میں سب سے بڑھ کر ہے اور جو کہ اللہ اور رسول سے مقابلہ اور شرعی قوانین کی ہمسری کرنے میں سب سے نمایاں ہے۔ شرعی نظامِ عدل کے بالکل متوازی اس کی اپنی قانون سازی، اپنی تحقیق و آراء، اپنے اصول، اپنے فروع، اپنے قانونی قیاس، اپنے استنباطات، اپنے استدلالات، اپنا نفاذ، اپنے دلائل، اپنے مراجع اور اپنے وثائق اور کتب ہیں۔ چنانچہ جس طرح شرعی عدالتوں کے قانونی مراجع اور علمی حوالے اور وثائق ہوتے ہیں جن کا سب کے سب کا ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول ہوتا ہے، اسی طرح ان عدالتوں کے بھی اپنے قانونی مراجع اور اپنے علمی حوالے اور وثائق ہیں جن کا، سب کے سب کا، ماخذ قانون ہے جو کہ مختلف شریعتوں اور متعدد قانونی نظاموں کا ایک ملغوبہ ہے مثلاً فرانسیسی قانون، امریکی قانون، برطانوی قانون اور شریعت سے منسوب بعض جدت پسند بدعتیوں کے مذاہب و افکار وغیرہ۔

**کفر اعتقادی کی چھٹی صورت:**

وہ روایتی رسوم جنہیں قبائلی سردار اور علاقائی جرگوں کے بڑے اپنے فیصلوں کی بنیاد بناتے ہیں جو کہ آباء و اجداد سے چلی آئی روایات اور رسومات ہوتی ہیں جنہیں یہ لوگ علاقائی یا قبائلی رواج بھی کہتے ہیں۔

**رہی کفر کی دوسری قسم:**

جس کا ایک حاکم بغیر ما انزل اللہ شخص مرتکب ہوسکتا ہے تو یہ وہ قسم ہے جو انسان کو ملت سے خارج نہیں کرتی۔ پیچھے یہ بات گزر چکی کہ آیت **ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون** "جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں" کی عبداللہ بن عباسؓ نے جو تفسیر کی ہے اس میں کفر کی یہی قسم آتی ہے جیسا کہ عبداللہ بن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہ

> كُفْرٌ دُونَ كُفْرٍ یعنی کفر ہے مگر بڑے کفر سے کمتر قسم کا کفر ہے۔اسی طرح عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول لیس بالکفر الذین تذھبون الیہ ''یہ وہ کفر نہیں جو تم مراد لیتے ہو''.... تو وہ یہی ہے کہ قاضی اپنی کسی خواہشِ نفس کی بنا پر کسی مقدمے میں اللہ کی شریعت سے ہٹ کر فیصلہ کر دے جبکہ اس کا اعتقاد بدستور یہی رہے کہ حق تو اللہ اور رسول کا حکم ہی ہے اور یہ تسلیم بھی کرے کہ اُس نے غلط کیا ہے اور حق سے پہلو تہی کر بیٹھا ہے۔چنانچہ اس فعل کی بنا پر وہ جس کفر کا مرتکب ہوتا ہے گو وہ ملت سے خارج نہیں ہوتا، پھر بھی اس کا یہ گناہ ایک عظیم ترین معصیت ہے اور زنا، شراب نوشی، چوری اور جھوٹی قسم اٹھانے ایسے کبائر سے زیادہ بڑا گناہ۔ کیونکہ ایک ایسی نافرمانی جسے اللہ اپنی کتاب میں کفر کہہ دے کسی بھی ایسی نافرمانی سے سنگین تر ہے جسے اللہ نے کفر نہیں کہا۔
>
> اللہ سے دُعا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اس بات پر مجتمع کر دے کہ وہ برضا و تسلیم کتاب اللہ سے اپنے فیصلے کروائیں۔ وہی کارساز مطلق ہے اور وہی اس بات پر قادر۔

☆☆☆☆☆☆☆

سو کیا یہ مسئلہ خود داعیوں پر بھی واضح ہے یا معاملہ ایسا ہے کہ جو لوگ اِسلام کی دعوت دینے جا رہے ہیں خود ان میں بھی کچھ ابھی تک اس مسئلے میں اشکالات رکھتے ہیں۔کبھی کوئی اشکال عبداللہ بن عباسؓ کے قول کی بنا پر ان کے ہاں پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی کوئی اشکال فکرِ ارجاء کے سبب، جو کہ ایمان کو عمل سے الگ کر دینے پر یقین رکھتا ہے اور جس کے ہاں عمل ایمان پر اثر انداز نہیں ہوتا چاہے کوئی عمل لا الہ الا اللہ کے براہ راست اور صریحاً منافی ہو جس کی ایک مثال اللہ کی شریعت کے ماسوا قانون چلانا ہے!؟

پھر اگر عقیدہ کے ایک ایسے بنیادی مسئلے پر اسلام کے بعض داعیوں تک کے ہاں اشکالات پائے جاتے ہیں تو پھر عوام الناس سے آپ کیا توقع کریں گے؟ کتنی بڑی جدوجہد ہماری منتظر ہے!!! تا آنکہ عقیدے کے اس مسئلے میں عوام الناس کے ذہن سے سب اشکال اور شبہے جاتے رہیں اور تا آنکہ وہ حق کو واضح اور جلی طور پر دیکھنے کے قابل ہوں نہ یہ کہ حق کی بات سن کر وہ تعجب اور حیرت کا اظہار کرنے لگیں۔

یہ ابھی حاکمیت کا ایک مسئلہ ہے جبکہ یہاں صرف یہی ایک مسئلہ نہیں جسے لا الہ الا اللہ کے بنیادی مفہومات کے ضمن میں عوام الناس پر واضح کرنے اور نکھارنے کی ضرورت ہے۔حقیقت یہ ہے کہ

لا الہ الا اللہ کے مسئلے کو ذہنوں میں بٹھانے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ان بہت سی اور گمراہیوں کو بھی ذہنوں سے محو کر دیا جائے، جنہوں نے وطنی، قومی، سماجی اور عدل وانصاف اور مساوات سے متعلق مسائل میں لا الہ الا اللہ کی حقیقت کو دھندلا کر رکھا ہے اور جو کہ دعوتی عمل کے آگے بڑھنے پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔

بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایسے مسائل کی کمی نہ تھی جنہیں معاشرے میں کھڑا کر کے آپ عوام الناس کا ایک مجمع اکٹھا کر سکتے تھے......

آپ کے دور میں سلطنتِ فارس جزیرہ نمائے عرب کے ایک بڑے حصے پر قابض تھی۔ جزیرۂ عرب کا ایک اور بڑا حصہ رومیوں کے زیر تسلط تھا۔ رسول اللہ ﷺ عربوں کی قومی حمیت کو جگا سکتے تھے اور اس کے نتیجے میں عوام کے ایک جم غفیر کو اپنے گرد اکٹھا بھی کر سکتے تھے تا آنکہ جب لوگ آپ کے گرد مجتمع ہو جاتے اور آپ کی قیادت پر اعتماد کر لیتے تو آپ ان سے لا الہ الا اللہ کا اقرار کروا لیتے!

آپ کے دور میں سماجی مسئلہ انتہائی ناگفتہ بہ تھا۔ امیر مالدار انتہائی حد تک مالدار تھے اور غریب نادار بے انتہا غریب۔ کوئی اس بات پر سوچتا تک نہ تھا کہ مالداری کی کوئی حد ہو یا یہ کہ کم از کم غریبوں کو سود کی چکی سے ہی رہائی دلوائی جائے یا امیروں کی حد سے بڑھی ہوئی دولت کا کچھ حصہ غریب ناداروں کو کسی طرح دلوایا جائے تا کہ ان کا معیار زندگی کچھ بلند ہو۔ رسول اللہ ﷺ معاشرے میں بآسانی یہ مسئلہ کھڑا کر سکتے تھے اور اس کے نتیجے میں یہ یقینی تھا کہ غربت کی چکی میں پسے ہوئے محروم طبقے آپ کے ارد گرد مجتمع ہو جائیں۔ تب آپؐ اُن کو ایک مضبوط جتھے کی شکل دے کر قریش کے متکبر سرداروں سے بھڑوا دیتے۔ قریش کے تکبر اور جبروت کو خاک میں ملا دیتے اور اس محاذ آرائی کے جوش میں اپنے ہم رکاب لوگوں سے ____ بڑے آرام کے ساتھ ____ لا الہ الا اللہ کہلوا لیتے!!

اس کے علاوہ بھی بے شمار مسائل ایسے تھے جنہیں کھڑا کر کے بڑے آرام سے عوام الناس کا ایک بڑا مجمع ساتھ لگایا جا سکتا تھا اور لوگوں میں جوش وجذبے کی ایک روح پھونکی جا سکتی تھی اور ان میں ایک سرگرمی عمل پیدا کر لینے اور ان کی کمان حاصل کر لینے کے بعد اُن کو اسلام کی ڈگر پر لے آیا جا سکتا تھا۔ ایسے سیاسی اور سماجی مسئلے ہمیشہ لوگوں کی توجہ زیادہ لے لیتے ہیں اور لوگوں کو کہیں زیادہ آسانی سے متحرک اور مجتمع کر لیتے ہیں۔ لوگ ایسے انقلابی نعرے بلند کرنے والی ایک بے لوث اور حوصلہ مند قیادت کے

پیچھے بڑے آرام سے ہو لیتے ہیں اور ان پر اپنی تمام تر عقیدت نچھاور کرنے اور ایک جذباتی انداز میں اِن کی پیروی کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔

مگر رسول اللہ ﷺ نے ___ وحی کی ہدایات پر چلتے ہوئے ___ مکہ کے مرحلۂ تربیت کے دوران کوئی ایسا مسئلہ کھڑا نہ کیا۔ بلکہ ان تمام مسائل کو پس پشت ڈال کر صرف ایک ایسا مسئلہ کھڑا کیا جس کے باعث آپ نے صرف وڈیروں کی نہیں بلکہ عوام کی بھی دشمنی مول لئے رکھی! صرف 'اُسی' مسئلے پر بات کی جو عوام اور خواص سب کو آپ کا دشمن بنا دے! پھر اسی مسئلے پر ڈٹ گئے اور آخر وقت تک اور آخری حد تک اسی ایک مسئلے پر مصر رہے تا آنکہ اللہ کی توفیق سے آہستہ آہستہ کچھ دلوں کے کواڑ اس دعوت کیلئے کھلنے لگے اور پھر جو آئے تو وہ مخلوق میں سے ___ رسولوں کے بعد ___ سب سے برگزیدہ انسان مانے گئے!!!

یہ محض اس لئے نہیں تھا کہ یہ سب کے سب سیاسی اور سماجی مسائل کسی قوم کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ بالکل نہیں۔ اسلام کی اس تحریک نے ان سب مسائل میں سے آخر کون سا مسئلہ حل کئے بغیر چھوڑا؟ مگر اصل بات یہ ہے کہ وہ سب سے بڑا مسئلہ جو اللہ کے منہج میں بھی اور قوموں کی زندگی میں بھی ام المسائل کہلانے کے لائق ہے وہ لا الہ الا اللہ کا مسئلہ ہے جس پر دنیا سے لے کر آخرت تک ہر جگہ انسانی زندگی کے ایک کامیاب منہجِ عمل کا تمام تر دار و مدار اور انحصار ہے۔ اور اس لئے بھی کہ ___ اللہ کے منہج میں ___ انسانی زندگی کے تمام تر مسائل اس لا الہ الا اللہ سے ہی برآمد ہونے چاہئیں۔ انسانی زندگی کے تمام تر مسائل اسی لا الہ الا اللہ سے جڑے رہنے چاہئیں اور یہ کہ انسانی نشاط کے ہر میدان میں صدقِ نیت، اخلاص اور تجرد لوجہ اللہ کی جو ضرورت ہوا کرتی ہے وہ صرف اور صرف اسی لا الہ الا اللہ سے پوری ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدائی منہج کو تقاضا ہوا کہ ہر اور مسئلے سے پہلے اسی لا الہ الا اللہ کی حقیقت کو ذہنوں میں گہرا اتارنے پر ہی اپنے رسول کا تمام تر زور صرف کروا دیا جائے اور یہ کہ اس مرحلے میں، کہ جب دین کے حامل اس بنیادی جتھے کی تیاری عمل میں آ رہی تھی، ہر اس شبہے اور اشکال کو دور کر دیا جائے جو اس لا الہ الا اللہ کی حقیقت پر پردہ کئے ہوئے ہو .... تا کہ اللہ تعالیٰ کی معاشرے میں علی وجہ البصیرت اور خالص ترین عبادت ہونے لگے .... ایسی خالص عبادت جس کا مقصد صرف اللہ وحدہ لا شریک کو خوش کر دینا

ہو۔ یوں جب لا الہ الا اللہ کی یہ حقیقت دلوں میں گھر کر گئی بلکہ یوں کہیے جب دلوں میں اس کے علاوہ کوئی اور حقیقت ہی نہ رہی اور فکر و ذہن جب دنیا کے ہر اور مسئلے سے بے فکر و بے نیاز ہو گئے تب کرۂ ارض کے سب مسائل، جو قوموں کی زندگی میں اہم ہوا کرتے ہیں، اس لا الہ الا اللہ کے ساتھ ایک ایک کر کے جوڑ دیئے گئے کہ اب یہ ڈر باقی نہ رہا تھا کہ ذہنوں میں یہ مسائل کہیں خلط ملط ہو جائیں اور دل کی دنیا میں کوئی چیز اپنی مطلوبہ اہمیت سے بڑھ جائے۔ کیونکہ اس بات کا سب سے زیادہ خدشہ اسی مرحلے میں ہوا کرتا ہے جب اسلام کو لے کر چلنے والی جماعت کی بنا ڈالی جا رہی ہو۔ اگر اسی مرحلے میں مسائل کی ترتیب کسی خلل کا شکار ہو جائے تو پھر دنیوی مفادات رفتہ رفتہ اپنے آپ کو منوائے بغیر رہتے ہیں اور نہ شیطان کو چپکے سے ذہنوں تک راہ پانے میں کوئی دقت پیش آتی ہے۔

تو کیا لا الہ الا اللہ کی حقیقت اور اہمیت آج خود داعیانِ اسلام پر بھی واضح ہے؟ کیا ان کی لوحِ ذہن پر پائے جانے والے مسائل کی ترتیب میں لا الہ الا اللہ کے مسئلے کو اس کی اصل جگہ اور اصل مقام دے دیا گیا ہے؟ عوام الناس کے قلب و ذہن کو متاثر کرنے کا مسئلہ تو خیر ابھی زیر بحث ہی نہ لائیں، کیا اسلام کی دعوت دینے والے طبقے بھی اس منزل کو سر کر چکے ہیں کہ خود ان کے فہمِ دین اور ان کی اپنی دعوت میں اللہ کی خالص بندگی کرنے اور کرانے کی بات سب مسائل میں سرفہرست آ چکی ہو؟ کیا خود ان کی دعوت میں قومی، وطنی، سماجی اور عدل و مساوات سے متعلقہ مسائل اس بنیادی مسئلے کے ساتھ کہیں خلط ملط تو نہیں؟ آج تو یہ حال ہے کہ کتنی ہی اسلام کی داعی جماعتوں کی ایک بڑی محنت اسلام کی اشتراکی یا جمہوری اقتدار کو نمایاں کرنے اور اسلام میں پارلیمانی روایات کے ثبوت دینے پر ہی ہو رہی ہے!

☆☆☆☆☆☆☆

۲) **کیا جوازِ اقتدار کا مسئلہ واضح کر دیا گیا؟** ہمارا مطلب ہے عوام پر نہیں بلکہ خود داعیوں پر بھی کیا یہ مسئلہ واضح ہے؟

جوازِ اقتدار کا آخر ہم کیا مفہوم لیتے ہیں؟

اسلام کی اس غربت ثانیہ کے دور میں ____ خصوصاً جب سے عالم اسلام کے ایک بڑے حصے میں اسلامی شریعت کو حکمرانی سے بے دخل کر دیا گیا ____ ہم اسلام کے دیئے ہوئے معیار تک بھول گئے اور ان کی جگہ مغرب کے دیئے ہوئے معیار قبول کر بیٹھے، خاص طور پر سیاست شرعیہ کے باب میں۔

مغرب نے ہمیں یہ سبق پڑھایا کہ جوازِ اقتدار رکھنے کا معیار بس یہ ہے کہ جو بھی انتخابات کا میدان جیت لے......سواِس معیار کی رو سے جو بھی سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرے وہ جائز اقتدار کا حق رکھے گا اور مسند اقتدار پر فائز ہونا ایسے ہی شخص یا پارٹی کا حق منصبی ہوگا۔

اب یہاں ایک تلخ قسم کی تبدیلی کو ذرا ایک لمحے کیلئے نظر انداز کر دیجئے جو مغرب کے دیئے ہوئے اس معیار میں خود مغرب کو اس وقت کرنا پڑ گئی جب الجزائر کے انتخابات میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے والے اسلام پسند نکل آئے! مغرب کے حوالے سے مختلف مواقع پر ہم یہ دیکھنے کے اب عادی ہو چکے ہیں کہ جس مسئلے کا فریق مسلمان ہوں وہاں دوہرے پیمانے برت لینے میں حرج نہیں اور یہ اس لئے کہ مغرب اپنے اصولوں اور معیاروں پر گہرا یقین رکھتا ہے، فریق مخالف کے ساتھ شائستگی اور حقوق انسانی کے احترام کی ہمیشہ ہی مغرب کو بڑی فکر رہتی ہے!!

مغرب کے اس طرح کے بعض مواقف کو ذرا ایک لمحے کیلئے جانے دیجئے۔ آیئے ذرا اسلام پسندوں سے دریافت کرتے ہیں کہ اس مسئلے میں اسلام کا معیار بھی کیا یہی ہے؟

فرض کیجئے کوئی شخص یا کوئی پارٹی یا کوئی پولٹ بیورو یا کوئی کونسل یا جو بھی کوئی سیاسی ادارہ ہو، انتخابات میں ایک بڑی جیت حاصل کر لیتا ہے، فرض کر لیجئے رائے دہندگان کے سو فیصد ووٹ لے لیتا ہے مگر قانون اللہ کا نہیں چلاتا.... کیا اللہ کے دین میں وہ اقتدار کا کوئی ذرہ بھر بھی جواز رکھتا ہے!؟

اسلام کے اس غربتِ ثانیہ کے دور میں یہ دو باتیں ہمارے ذہنوں میں کہیں خلط ملط ہو کر رہ گئی ہیں۔ حکمران کے چناؤ کا طریقہ ایک اور چیز ہے اور وہ طریقہ اور نظام جس سے لوگوں پر حکومت کی جائے بالکل ایک اور چیز ہے ....

عالم اسلام میں جب کبھی اسلام کا اقتدار تھا، تب سیاست شرعیہ کے بارے میں فقہائے کرام ان شروط اور امور کو زیر بحث لاتے رہے جن کا حاکم میں پایا جانا ضروری ہے، فقہاء اسلام نے اس ضمن میں آزاد بیعت پر بحث کی، شوریٰ پر بات کی، حکومت اور اقتدار سے متعلق دوسرے سب امور پر گفتگو کی حتی کہ فقہ میں نظریۂ ضرورت تک پر سیر حاصل بات ہوئی اور اس بات کی پوری وضاحت ہوئی کہ کبھی حالات ناگہانی ہی ہو جائیں اور اضطرار کی مجبوری لاحق ہو جائے تو وہ کون کون سی شروط ہیں جن کے مطالبے میں شریعت کی رو سے نرمی کی جا سکتی ہے یہاں تک کہ نظریۂ ضرورت کے ضمن میں فقہاء نے یہ تک کہا کہ

کوئی اقتدار پر بزور قبضہ کر لے تو بھی اس کی سمع اور اطاعت واجب ہے .... مگر جو چیز کبھی فقہاء کے سان گمان تک میں نہ آ سکتی تھی وہ یہ کہ کوئی حکمران اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کی جگہ اپنا قانون چلائے اور وہ پھر بھی مسلمانوں کا جائز حکمران کہلائے!!

چنانچہ حکومت اور اقتدار رکھنے کیلئے وہ بنیادی ترین شرط جو اسلام لگاتا ہے اور جو کبھی اور کسی بھی صورت میں ساقط نہیں ہوتی وہ یہ ہے کہ حکم وقانون صرف اور صرف اللہ کی اتاری ہوئی شریعت پر قائم ہو۔ ابھی ہم پیچھے پڑھ بھی آئے ہیں کہ ایک ایسا حاکم جو ما انزل اللہ کے مطابق حکومت نہیں چلاتا بلکہ شریعت کے برخلاف قانون اور نظام چلاتا ہے، اس پر امام ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں کیا فتوی صادر کیا ہے۔

تو کیا یہ مسئلہ، عوام الناس کی بات جانے دیجئے، خود داعیانِ اسلام پر بھی واضح کیا جا چکا ہے .... یا پھر ہماری ساری بحث وگفتگو فی الحال انتخابات کے گرد ہی گھومتی ہے کہ آیا انتخابات آزادانہ ومنصفانہ تھے یا دھاندلی ہوئی ہے؟ اور یہ کہ انتخابات میں ہمیں کتنی سیٹیں حاصل ہوئی ہیں؟ اور یہ کہ پارلیمان میں ہمیں مزید کتنی نشستیں درکار ہیں؟!!

یہ خیال کہ پارلیمنٹ میں اگر ہمیں اکثریت حاصل ہو جائے تو شریعت قائم کرنے کیلئے ہمارا راستہ صاف ہو جائے گا۔ آخری درجے کی حد تک سادگی کہلانے کے لائق ہے۔ الجزائر میں جو ہوا وہ یہ بات ثابت کرنے کیلئے بہت کافی ہے۔

مگر اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ اقتدار تک پہنچنے کیلئے ہمارا ____ اصولاً ____ اس راستے کو منتخب کرنا اور پھر اس راستے سے اللہ کی شریعت کو نافذ کرنے کی کوشش کرنا، خود اسلام ہی کی ایک بڑی خلاف ورزی ہے۔ کیونکہ اس کی رو سے، یہ طے کرنے کیلئے کہ کس قسم کی حکومت ہو، مرجع اور اتھارٹی لوگ ہونگے (حکمران کے چناؤ کے طریق کار پر اس وقت بات نہیں ہو رہی) سو لوگ اگر اسلام کا انتخاب کرتے ہیں تو اسلام حکومت کرے گا اور لوگ اگر کچھ اور کا انتخاب کرتے ہیں تو وہ 'اور' حکومت کرے گا! کیا واقعتاً اسلام یہی کہتا ہے!؟

اگر ایسا ہے تو اللہ کے اس فرمان کو پھر ہم کہاں رکھیں گے؟

| | |
|---|---|
| وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ (الأحزاب:۳۶) | کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے |

لوگوں سے کسی چیز کی پابندی اور اطاعت کروانے کا جواز اس بات سے وجود نہیں پاتا کہ آیا انسانوں کو وہ بات منظور ہے یا نا منظور، جبکہ وہ انسان خیر سے مسلمان بھی کہلاتے ہوں .... جب تک وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تب تک وہ خود بخود اور آپ سے آپ اس بات کے پابند ہیں کہ اپنی ہر چھوٹی اور بڑی بات کا فیصلہ اللہ کی شریعت سے کروائیں، بصورتِ دیگر ان کا دعوائے ایمان کالعدم ہو جائے گا۔ اگر وہ اللہ کی شریعت سے روگردانی کر کے کسی اور شریعت اور قانون کا رخ کرتے ہیں تو پھر ان کے ایمان کے دعوے کی کوئی حقیقت ہی باقی نہیں رہے گی اگرچہ وہ بدستور نمازیں پڑھیں، روزے رکھیں اور مسلمانی کا اپنے تئیں بھرپور زعم رکھیں:

وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِّنْهُم مِّن بَعْدِ ذَلِكَ وَمَا أُولَئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ (النور: ۴۷-۴۸)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسول پر اور ہم نے اطاعت قبول کی، مگر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ (اطاعت سے) منہ موڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ اور رسول کی طرف، تاکہ رسول ان کے آپس کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق کترا جاتا ہے

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيماً (النساء: ۶۵)

نہیں، اے محمدؐ! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ دنیائے واقع میں اسلام کی فرمانروائی کبھی ہو ہی نہیں سکتی جب تک اس پر پختہ ایمان رکھنے والی ایک ایسی قوم پیدا نہیں کر لی جاتی جو اللہ کی شریعت کی فرمانروائی پر آخری حد تک بضد ہو اور اس کے ماسوا ہر شریعت اور قانون کے چلنے کا سوال تک پیدا نہ ہونے دے۔ اور اس بات پر غیر متزلزل یقین رکھے کہ اللہ کی شریعت کو چھوڑ کر کسی اور شریعت کو قبول کر لینا ایسا واضح ترین کفر ہے جو انسان کو ملتِ اسلام سے خارج کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔

پھر یہ بھی ایک اتنی ہی کھلی حقیقت ہے کہ اس قسم کا ایمان رکھنے والے لوگ اس وقت معاشرے میں بہت تھوڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں جنہیں جاہلیت بڑے آرام سے دبا لیتی اور اپنی راہ سے ہٹا لیتی ہے۔

جب یہ ایک حقیقت ہے تو پھر اس کا تقاضا ہے کہ ہم اس مسئلے کو واضح کرنے کیلئے اپنا پورا زور صرف کر دیں اور لوگوں پر اسلام کی یہ حقیقت روشن کر دینے کیلئے اپنا فرض پورا کریں کہ کسی انسان کے دعوائے ایمان کی ہرگز کوئی حقیقت نہیں اگر وہ اللہ کی شریعت کے سوا کسی اور قانون کو قبول کر لے۔ لہٰذا ہمارا اولین فرض یہی بنتا ہے کہ لوگوں کی اس حقیقت اسلام کے تقاضوں کے تحت تربیت کرتے رہیں اور اس وقت تک کرتے رہیں جب تک اس حقیقت اسلام پر تربیت پانے والے ایمانی جتھے کو معاشرے میں اتنی قوت اور پذیرائی حاصل نہیں ہو جاتی کہ وہ معاشرے کی قیادت اور انضمام امور اپنے ہاتھ میں کر لے۔ آج کے اس دور میں دعوت کی یہ مہم واقعتاً اسی قدر بڑی ہے اور اس مہم کا اتنا بڑا حجم ہر داعی پر واضح ہو جانا چاہئے خواہ اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے کتنا ہی وقت لگے۔ دعوت کی مہم یہ بہرحال نہیں کہ لوگوں سے بیلٹ بکسوں کے ذریعے استصواب رائے لیا جائے کہ وہ مسلمان بن کر رہنا چاہتے ہیں یا نہیں۔

تو کیا یہ مسئلہ، عوام الناس کی بات جانے دیجئے، داعیان اسلام کے قلب و ذہن میں بھی واضح ہو چکا ہے؟ یا پھر وہ اس حقیقت سے پھسل کر لاشعوری طور پر جمہوری معیار اپنا چکے ہیں جن کی رو سے حکومت اور اقتدار کی نوعیت کا فیصلہ کرنے کیلئے حرف آخر ____ کم از کم ظاہری طور پر (۱) ____ عوام ہوتے ہیں نہ کہ عوام کو پیدا کرنے والا خدا جو اختیارات کا بلاشرکت غیرے مالک و مختار ہے۔

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ (الأعراف: ٥٤) خبردار رہو! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے

جاہلیت اور اسلام کی راہیں بس یہیں سے الگ ہوتی ہیں!

☆☆☆☆☆☆☆

## ۳) کیا معاشرتی تبدیلی کی بنیاد بننے والے ایمانی جتھے کی تیاری عمل میں آ چکی ہے؟

سب سے پہلے تو یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر لا الہ الا اللہ کی حقیقت بھی ابھی پوری طرح واضح نہیں کی جا سکی، جیسا کہ پیچھے ہم بیان کر آئے ہیں اور اگر جوازِ اقتدار کا مسئلہ خود داعیانِ اسلام پر بھی ابھی واضح نہیں ہو سکا، تو یہ فرض کیسے کر لیا جائے کہ معاشرتی تبدیلی کی بنیاد بننے والے ایمانی جتھے کی تیاری ____ اپنی مطلوبہ صفات کے ساتھ ____ عمل میں لائی جا چکی ہے!؟

(۱) جمہوری ڈرامے میں عوام کو وہم سا ہو جاتا ہے کہ واقعتاً وہی طاقت کا اصل سرچشمہ ہیں۔ جبکہ اقتدار فی الواقع سرمایہ داری کے پاس رہتا ہے۔ جہاں تک اسلامی نقطہ نظر ہے تو اس کی رو سے اقتدار خواہ فی الواقع عوام کے پاس ہو یا سرمایہ دار ٹولے کے ہاتھ میں رہے، دونوں صورتوں میں وہ ما انزل اللہ کی حکمرانی نہیں۔

معاشرتی تبدیلی کی بنیاد بننے والے جس ایمانی جتھے کی یہاں ضرورت ہے اور جو کہ بنیادی طور پر کسی ملک میں اسلام کے ان داعیوں سے تشکیل پاتا ہے جو معاشرے میں ایک وسیع پیمانے پر دعوت اور قیادت کا فرض انجام دینے کیلئے تیار کئے گئے ہوں.... معاشرے پر اثر انداز ہونے والا ایک ایسا ایمانی گروہ ان دو بنیادی عناصر سے وجود پاتا ہے:

حقیقتِ اسلام کا عمیق فہم اور گہری بصیرت، اور دین کے حقائق اور فرائض کے تقاضوں پر ایک شعوری اور عملی تربیت۔

پیچھے ہم اس بات کا جائزہ لے آئے ہیں کہ جہاں تک حقیقتِ اسلام کے ایک عمیق فہم اور گہری بصیرت کا تعلق ہے تو اس میں ہمیں کہاں کہاں رخنوں کا سامنا ہے اور یہ کہ سب سے پہلے تو اسلام کے دو بہت بنیادی مسائل، لا الہ الا اللہ کی حقیقت اور جوازِ اقتدار کا مسئلہ ہی داعیان اسلام پر بہت واضح نہیں۔ اسلام کے دیگر اہم مسائل کی تو بات ہی رہنے دیجئے جن پر ویسے ہم آگے چل کر گفتگو کرنے والے ہیں اور جو کہ تحریکی منہج سے تعلق رکھنے والے مسائل ہیں۔ رہ گیا تربیت کا معاملہ تو وہ فہم وبصیرت کے مسئلے سے بھی کہیں سنگین تر ہے اور اس میں پایا جانے والا نقص اس سے بھی کہیں بڑا ہے۔

اگر ہم ابتدائے اسلام کے دور میں ذرا واپس چلے جائیں جب اس امت کی پہلے پہل تعمیر ہوئی تھی تو ہم پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ فکر ایک ایسے ایمانی گروہ کی تیاری کی تھی جو معاشرے پر اثر انداز ہونے کیلئے انتہائی مضبوط بنیادوں پر تربیت پا چکا ہو اور اس کو ان فکری وعملی بنیادوں میں شدید ترین رسوخ حاصل ہو اور وہ ایمان، اخلاق، فکر، نظریات، سلوک، وجدان اور عمل .... ہر میدان میں اعلیٰ ترین مرتبے پر فائز ہو۔

درست کہ صحابہ جیسی کوئی جماعت قیامت تک دوبارہ وجود میں نہیں آ سکتی ــــــ اگرچہ اسلام کا کوئی بھی دور اور کوئی بھی نسل ایسے افراد سے بالکلیہ خالی نہیں رہی جو فکر وعمل کی اس بلند سطح کو چھو لیں ــــــ مگر اس کے باوجود ہمارے لئے اسوہ اور نمونہ اسلام کی اسی پہلو پود میں ہے جو فکر اور عمل کی سب وادیوں میں اسلام کی اس حقیقت کو ایک طبعی انداز میں لے کر آگے بڑھی۔ صحابہ میں ہمارے لئے اسوہ اور نمونہ یہی بات ہے کہ معاشرے پر اثر انداز ہونے کو جو لوگ آگے بڑھیں وہ فکر وعقیدہ میں رسوخ رکھنے، بہترین سلوک اور زبردست عملی کردار رکھنے میں ممکنہ حد تک بلند ترین سطح پر فائز

ہوں اور جہاں تک ان کا بس چلے وہ معاشرے میں حقیقت اسلام کی واضح ترین نمائندگی اور خالص ترجمانی کی اہلیت رکھیں۔ کیونکہ دعوت کو انہی کے کاندھوں پر کھڑی ہونا ہے اور لوگوں کو اسلام کا فکری اور عملی نمونہ انہی کی شخصیات سے لینا ہے اور پھر جبکہ یہ بھی صرف انہی کی جدوجہد پر منحصر ہے کہ فکر وعمل کی دنیا میں اسلام کی حقیقت پر پڑے ہوئے دبیز پردے چاک ہوں اور اسلام کی حقیقت اس غربت ثانیہ کے ملبے تلے سے باہر نکال لائی جائے.... بالکل اسی طرح جس طرح اسلام کی غربت اولی کو ختم کرنے کا فرض اُس وقت کے اعلیٰ انسانوں کی ایک باصلاحیت جمعیت نے ہی انجام دیا تھا۔

تربیت کے موضوع پر اگرچہ ہم ایک پورا باب الگ سے مخصوص کریں گے مگر پھر بھی یہاں اتنی بات کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے:

یہ جان لیا جانا اشد ضروری ہے کہ آج کے معاشروں کو تبدیل کر دینے کیلئے اس وقت جس قسم کی انسانی جمعیت درکار ہے وہ ایک خاص بلکہ بہت ہی خاص قسم کے انسانوں کی جمعیت ہے۔ اس وقت ہم تاریخ کے جس موڑ پر کھڑے ہیں وہاں معاملہ ایسا ہرگز نہیں کہ کسی بھی معیار کے لوگ مل جائیں تو بس کام چل جائے۔ اس وقت ایک بہت ہی خاص معیار درکار ہے کیونکہ آج کے معاشروں پر اثر انداز ہونے والے لوگوں کو ایک بہت ہی غیر معمولی اور ایک عدیم النظیر مشن کو پورا کرنا ہے۔ آج کے معاشروں پر اثر انداز ہونے والوں کو انتہائی غیر معمولی رکاوٹوں کا سامنا کرنا ہے۔ آج کے معاشروں کو اسلام کے نقشے پر تبدیل کرنے والوں کو ایک ایسی اتھاہ دشمنی اور ایک ایسے عالمی منصوبہ ساز دشمن سے پالا پڑے گا اور ایسی ایسی سازشوں اور عالمی وارداتوں سے سامنا ہوگا کہ جن کی تاریخ میں کبھی کوئی مثال مل ہی نہیں سکتی۔ البتہ بغض اور کدورت اسی درجے کی ملے گی جو جاہلیت کی جانب سے اسلام کے دور اول کے دوران دیکھنے میں آئی تھی.... تاریخ کے اس مشکل ترین اور کٹھن ترین کام کو سرانجام دینے کیلئے اور ان پہاڑ جیسی رکاوٹوں کو عبور کرنے اور دشمنی کی ان گھناؤنی اور غیر معمولی اشکال کا سامنا کرنے کیلئے یہ سوچنا ہرگز درست نہ ہوگا کہ فہم وبصیرت اور تربیت کا جیسا بھی کوئی معیار ہو، بس کام چلانا ہے اور وہ چل جائے گا۔

باوجود اس کے کہ فہم وبصیرت اور تربیت کی اس مطلوبہ سطح کو پہنچنا ایک بے انتہا پر مشقت کام ہے مگر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کے بغیر بہرحال کوئی چارۂ کار نہیں۔ نہ ہمارے پاس اس کا کوئی متبادل ہے اور نہ ہم اس کے ضرورت مند ہونے سے بے نیاز رہ سکتے ہیں۔ اس دین کو آج کے اس دور میں لے

کر چلنے کے جو بھی کوئی تقاضے ہیں ان تقاضوں سے آنکھیں چرانا اور ان تقاضوں کو ادا کرنے میں غفلت اور بے دلی برتنا وہ اصل غلطی ہے جس کی قیمت یہ امت اور امت کا دینی طبقہ ایک عرصے سے دے رہا ہے۔ اسی غفلت اور بے دلی کے سبب یہ نوبت آئی کہ دنیا کی سب قومیں ہم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں جس طرح بھوکے کھانے کے تھال پر ٹوٹ پڑتے ہیں .... ایک غیر معمولی جدوجہد ناگزیر ہے۔ ایک غیر معمولی جہد کے بغیر اب اس غفلت اور ادبار کی قیمت نہیں چکائی جا سکتی جس کا سایہ اس امت پر دو سو سال تک پڑا رہا اور جس کا موقعہ تکا کر دشمن اپنا کام کر گیا اور اب وہ اس اُمت کو پچھاڑ کر اس کے سینے پر چڑھا بیٹھا ہے اور اس پر سے ملنے کیلئے تیار نہیں۔

اگر اسلام کی نسلِ اول کو، جبکہ ان میں رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس موجود تھے اور ان پر وحی اترتی تھی، اسلام کی غربت اول کے خاتمہ کیلئے ایک غیر معمولی جدوجہد کرنا پڑی تھی .... تو پھر ہم تو، جبکہ ہم میں رسول اللہ ﷺ بھی بنفس نفیس موجود نہیں اور ہمارے قدم ہر موقع پر درست پڑتے رہنے کیلئے ہم پر براہ راست وحی اترنے کا بھی کوئی انتظام نہیں ہم تو اس بات کے کہیں زیادہ ضرورت مند ہیں کہ اللہ سے مدد مانگ کر ایک اعلیٰ ترین اور انتہائی غیر معمولی جدوجہد کرنے کیلئے آگے بڑھیں اور اللہ سے، جو کہ بزرگ و برتر اور قادر مطلق اور نہایت مہربان ہے، صبح شام دعا بھی کریں کہ وہ ہماری اس محنت اور جہد میں برکت ڈال دے اور اپنی خاص عنایت سے ہمارے قدم درست پڑتے رہنے کا بس اپنی ہی جناب سے بندوبست کر دے اور اسلام کی غربت ثانیہ کا خاتمہ کرانے کا یہ شرف ہمارے نصیب میں لکھ دے۔

اس غیر معمولی جدوجہد کا سب سے اہم اور سب سے ضروری میدان ایک ہی ہے اور وہ ہے اس ایمانی جتھے کی تیاری جسے معاشرے پر اثر انداز ہونا ہے۔ مگر اسلام کیلئے اس وقت جو کام ہو رہا ہے اور دینی تحریکوں کو آئے دن جو ٹھوکریں لگتی ہیں اس سے یہ پوری طرح واضح ہے کہ ہم کہیں پر جلد بازی کا شکار ہو رہے ہیں اور اس وجہ سے اپنے دینی فرائض کو ان کی صحیح ترتیب کے ساتھ لے کر آگے نہیں بڑھ رہے اور یہ کہ ہم نے دین کو لے کر چلنے والے طبقے کی تربیت اور تیاری کے اس اہم ترین مسئلے کو وہ اہمیت نہیں دی اور اس پر وہ محنت اور جہد نہیں کی جو کہ دراصل اس کا حق ہے بلکہ بیشتر اوقات تو ہم اس بات کا ادراک تک نہیں کر پاتے کہ معاملہ کسی تربیت اور تیاری کا متقاضی ہے اور اگر ہے تو کس درجے اور نوعیت کی تربیت اور تیاری مطلوب ہے!

☆☆☆☆☆☆☆

۴) **کیا معاشرے پر اثر انداز ہونے والی اس جمعیت کی ایک معقول حد تک توسیع ہو چکی ہے، جہاں وہ اس حجم کو پہنچ جائے جو آج کے معاشروں کو تبدیل کر دینے کیلئے کم از کم حد تک مطلوب ہے!؟**

اگر تو اس سے ہماری مراد ایک عوامی رو اور عوامی سطح کے ایک تحریکی عمل سے ہے تب تو بلاشبہ ہمارے اس سوال کا جواب اثبات میں ہوگا اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ توسیعِ جمعیت کا یہ کام انجام پا چکا ہے جس کی پشت پر پچھلی کوئی نصف صدی سے ایک لگا تار عوامی دعوتی عمل اور ان شہیدوں کا خون ہے جو دین کیلئے وقتاً فوقتاً اپنی جانیں قربان اور اپنا خون نچھاور کرنے کیلئے آگے بڑھتے رہے اور پھر اس توسیع جمعیت میں تیزی کا ایک بڑا سبب جاہلیت کی خود اپنی حماقتیں ہیں جو وہ مسلم نوجوانوں کو شہید کرنے، جیلیں بھرنے، سزائیں اور جلاوطنیاں دینے کی صورت میں اس سارا عرصہ کرتی آئی ہے اور یہ اللہ کی ایک سنت ہے جس کا ادراک کرنے میں ہر دور ہی کے طاغوت ناکام رہتے ہیں اور وہ یہ کہ جس دین اور جس دعوت کیلئے خون دیا جاتا رہے وہ کبھی نہیں مرتی! طاغوت یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ زیادہ لوگوں کی جان لے لیں، زیادہ جیلیں بھر لیں، زیادہ سزائیں اور جلاوطنیاں کر لیں تو وہ دعوتِ اسلام کا کام تمام کر دیں گے اور اسی بات کو وہ اپنے لئے اصل چیلنج اور اپنی جیت کا اصل میدان بھی سمجھ لیتے ہیں، مگر یہی بات خدا کی قدرت سے اہل ایمان کو چھانٹ دینے کا سبب بنتی ہے اور جوں جوں مومن اپنے ایمان میں پختہ ہوتے چلے جاتے ہیں توں توں وہ کفر کے خاتمے کا باعث بنتے جاتے ہیں:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ

(آل عمران: ۱۳۹-۱۴۱)

دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ تم میں سے سچے مومن کون ہیں، اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا ہے جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں ــــ کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں ــــ اور وہ اس آزمائش کے ذریعہ سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا ہے۔

سو یہ تو درست ہے کہ ایک عوامی عمل میں توسیع ہوئی ہے اور یہ عوامی سطح کا دینی عمل قسما قسم انداز میں پورے عالم اسلام کے اندر پھیل گیا ہے اور اس کے ساتھ عالمِ اسلام کے اب ہزاروں، لاکھوں نوجوان آ ملے ہیں، جو پیدا تو جاہلیت کے سائے میں ہوئے مگر اللہ کو منظور تھا کہ یہ نوجوان اپنے لئے اسلام ہی کا راستہ منتخب کریں جس کی بڑی وجہ ایک طرف اسلام کے داعیوں کی سرگرمی تھی تو دوسری طرف جاہلیت کی خود اپنی حماقتیں۔ مگر اس کثرتِ تعداد کا اصل مطلوبہ تحریکی عمل کے لحاظ سے کتنا وزن ہے؟ اصل سوال صرف یہ ہے۔

یہ بات کہ وہ داعیانِ اسلام جن کی یہ پذیرائی ہوئی، اس بات پر خوش اور مطمئن ہیں کہ کام بہت بڑھا اور پھیلا ہے، تو اس میں تو خیر کوئی شک نہیں.... مگر یہ بات کہ یہ عوام الناس حقیقتِ اسلام کی ترجمانی میں معاشرے کے اندر وہی کردار ادا کر رہے ہوں جو انصار نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کیلئے اپنے معاشرے کے اندر کیا، تو یہ معاملہ ضرور محلِ نظر ہے اور قابل بحث بھی!

سب سے پہلے تو ہم یہ دریافت کریں گے کہ یہ عوام الناس جو اسلامی جماعتوں سے جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں کیا یہ عوامی جذبات تب بھی باقی رہیں گے اگر جاہلیت کی حماقتوں کا رخ خود ان کی جانب پھر گیا اور جب جاہلیت لوگوں کو دینی قیادتوں کی تائید اور حمایت کرنے پر پھانسیاں دینے اور قید و بند اور جلاوطن کرنے لگے اور جب لوگوں کو یہ نظر آنے لگے کہ اسلامی جماعتوں اور قیادتوں کی حمایت کرنے پر ان کو زندگی کا چین کھو دینا اور اذیتیں اور عبرتناک سزائیں سہنا پڑیں گی؟ کہیں اُس وقت یہ بات تو نہیں کہہ دی جائیگی کہ ہماری دوستی اتنی دور تک نہیں جاسکتی اور تب کہیں اسلامی قیادتوں اور جماعتوں سے عوام کی راہ الگ تو نہیں ہو جائیگی!؟

حتی کہ اگر ہم یہ بھی فرض کرلیں کہ یہ اسلام پسند طبقے کسی ایک ملک میں اقتدار حاصل کر لیتے ہیں اور پھر یہ انہونی بات بھی فرض کرلیں کہ عالمی جاہلیت ان کے ساتھ جنگ کرنے نہیں آتی، حتی کہ اقتصادی جنگ اور جدید انداز کی کوئی اور جنگ بھی اس نوزائیدہ اسلامی اقتدار کے ساتھ نہیں چھیڑتی، بس یہ اسلامی حکومت ریڈیو پر گانے بجانے پر پابندی لگا دیتی ہے اور ٹی وی پر بے حیا مناظر ختم کر دیتی ہے اور بازاروں میں بے پردگی کو ممنوع ٹھہرا دیتی ہے.... تو کیا یہ جذباتی عوام جو اسلامی پارٹیوں کی حمایت میں نعرے لگاتے رہے تھے اب بھی اسی جوش سے یہ حمایت جاری رکھیں گے یا پھر عوام کے کم از کم بعض

طبقے بے دلی دکھانے لگیں گے اور پکار اُٹھیں گے کہ یہ خوامخواہ کی سختی ہے!!

تو پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ یہ عوام الناس پہلے ایک خاص حد تک تربیت پالیں !؟ تا کہ یہ فرائضِ اسلام کی ادائیگی کے اس کٹھن مشن میں ایک سپاہیانہ کردار ادا کریں اور کم از کم اتنا تو نہ ہو کہ وقت آنے پر یہ عوام ہی فرائضِ اسلام سے راہ فرار تلاش کرنے لگیں اور عین اس وقت جب دشمن سے مڈبھیڑ ہو یا جب ملک کے طول وعرض میں اسلامی احکام کا نفاذ ہو تو عوام کو ساتھ لے کر چلنا ہی اس وقت کا سب سے بڑا چیلنج بن جائے!

اور پھر دوسرا سوال یہ ہے کہ عوام الناس کی تربیت آخر کرے گا کون؟ اگر وہ بنیادی جتھا جسے معاشرے پر اثر انداز ہونا اور معاشرے کو سرتا پیر تبدیل کرنا ہے.... آج کے یہ اسلام پسند گروہ اور جماعتیں اگر خود بھی پوری تربیت نہیں پا سکیں اور عوام کی سطح پر اپنے کام کو پھیلانے میں تربیت کا معیار برقرار رکھنے کی صلاحیت بھی حاصل نہیں کر سکیں تو ایسی صورت میں عوام الناس میں ایک زوردار انداز سے جذبۂ عمل پھونک دینے میں اگر کامیابی حاصل کر بھی لی جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں لوگ جذبات میں آ کر اٹھ کھڑے ہوتے اور آگے بڑھنے پر آمادہ ہو بھی جاتے ہیں تو ان کو تربیت دینے والے عین اس وقت اور موقعہ پر کہاں سے ملیں گے!؟

☆☆☆☆☆☆☆

۵) رہ گئی بات اللہ کی خاطر اخلاص اور تجرد کی مطلوبہ سطح کو پہنچنے کی تو یہ ایک نازک موضوع ہے! نہ تو ہمیں یہ زیب دیتا ہے کہ اس حوالے سے کسی دوسرے پر تنقید کریں اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ ہم خود اپنی پارسائی کا دعویٰ کریں صرف ایک اللہ وحدہ لاشریک ہی دلوں کے حال اور بھید جانتا ہے۔

يَعۡلَمُ خَآئِنَةَ الۡأَعۡيُنِ وَمَا تُخۡفِى الصُّدُورُ (غافر:۱۹) وہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں

البتہ اتنی بات اس حوالے سے پھر بھی ہم کہیں گے کہ اسلامی گروہوں میں آپس کا لڑائی جھگڑا اور مخاصمت اور گروپ در گروپ تقسیم جیسے ناپسندیدہ مظاہر جو آئے روز دیکھنے میں آتے ہیں وہ بہرحال ایک خطرناک چیز کے وجود پر دلالت کرتے ہیں اور وہ یہ کہ جو لوگ اس وقت دعوت کے میدان میں سرگرم عمل ہیں ان میں اسلامی اخوت کے حوالے سے ایک بڑا تربیتی نقص ہے اور یہ کہ

اللہ کیلئے اخلاص اور تجرد کے حصول میں اور جذبۂ بے لوثی رکھنے میں بھی کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے۔

اختلاف ہو جانا فی ذاتہ عیب نہیں، البتہ اختلاف کے کچھ آداب اور ضوابط ضرور ہونے چاہئیں تاکہ یہ صرف اختلاف رہے نہ کہ کسی ایک رائے یا کسی ایک ہوائے نفس یا کسی ایک شخص یا کسی ایک گروہ کیلئے تعصب اور حزبیت۔ صحابہ میں اختلاف ضرور ہوا مگر صحابہ بٹ نہیں جایا کرتے تھے۔ ان دو باتوں میں جو فرق ہے بس وہی اصل توجہ طلب مسئلہ ہے۔ جب ہم اللہ کیلئے اخلاص اور حق کیلئے تجرد رکھتے ہوئے اختلاف کریں گے تو بلاشبہ ہمارے درمیان آپس کے لڑائی جھگڑے، مخاصمت اور تقسیم اور ٹولہ بندی کا امکان بہت کم ہوگا۔ تب حزبیت اور جماعت بندی کا یہ مظہر بھی بہت کمزور پڑ جائیگا جو آج کے تحریکی عمل میں ایک بڑی سطح پر دیکھنے میں آ رہا ہے اور جو کہ ہمیشہ اس بات کا پیش خیمہ بنتا ہے کہ آدمی کسی ایک رائے یا کسی ایک فکر یا کسی ایک قائد یا کسی ایک جماعت یا کسی ایک طریق کار کیلئے شعوری یا لاشعوری طور پر تعصب رکھنے لگے۔

یقیناً اتحاد بھی فی ذاتہ مطلوب نہیں کہ چاہے وہ ایک غلطی پر اکٹھ کی صورت میں ہو بس ہو ضرور۔ ایک غلطی پر اکٹھے ہو جانا دعوت کی کوئی خدمت نہیں۔ اور غلطی پر ڈٹ جانا مصلحت کی بجائے مفسدت اور اسلام کیلئے فائدہ مند ہونے کی بجائے مضرت رساں ہے۔ لیکن حق بیان کرتے ہوئے اگر اخلاص لوجہ اللہ اور تجرد اور بے لوثی کا جذبہ کارفرما ہو تو اس بات کا امکان کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ دل جڑے رہ جائیں لیکن اگر اس میں کمی رہ جائے تو پھر تالیفِ قلوب کی نسبت اس بات کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے کہ بیان حقِ اور غلطیوں کی نشاندہی کا فرض تو ضرور پورا ہو مگر دلوں میں دراڑیں پڑی رہیں!

بات کا خلاصہ یہ ہے کہ دعوت کا راستہ چلنے میں ہم عجلت پسندی کا شکار ہوتے رہے ہیں اور جلد پہنچنے کا جذبہ کچھ بہت ہی بنیادی اور اساسی قسم کے اقدامات کو مختصر یا نظر انداز کر دینے کا سبب بنتا ہے اور یہ کہ ہمارے سامنے اب بھی ایک طویل سفر پڑا ہے جس کی ساری مسافت ایک طبعی رفتار سے طے کئے بنا کوئی چارۂ کار نہیں...... تا آنکہ ہم اللہ کے ہاں تمکین فی الارض کے بالفعل مستحق ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہمارے لئے تمکین فی الارض کا راستہ خود ہی واضح کر دیا ہے:

| | |
|---|---|
| هُوَ الَّذِیَ أَیَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِینَ وَأَلَّفَ بَیْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِی الأَرْضِ جَمِیعاً مَّا أَلَّفَتْ بَیْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَـكِنَّ اللّهَ أَلَّفَ بَیْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِیزٌ حَكِیمٌ یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِینَ یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِینَ عَلَى الْقِتَالِ (الأنفال: ٦٢-٦٥) | وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعہ سے تمہاری تائید و مدد کی اور مومنوں کے دل آپس میں جوڑ دیئے۔ تم روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے، یقیناً وہ بڑا زبردست اور دانا ہے<br>اے نبی، تمہارے لئے اور تمہارے پیرو اہل ایمان کیلئے تو بس اللہ کافی ہے<br>اے نبی، مومنوں کو جنگ پر ابھارو.... |

ایک ہی سورت کی چار آیات میں آگے پیچھے چار شروط بیان کر دی گئیں۔ اللہ کی نصرت اور تائید اترنے کیلئے چار بنیادی شروط کا ذکر کر دیا گیا:

۱) یہ کہ سچے ایمان کے حامل لوگ پائے جائیں،

۲) یہ کہ ان کے دل باہم جڑے ہوں،

۳) یہ کہ وہ اللہ کیلئے تجرد پا چکے ہوں، اور

۴) یہ کہ جب جہاد کے حالات تقاضا کریں تو وہ قتال کی آخری حد تک جانے کیلئے تیار ہوں۔

ان شروط کی روشنی میں آج جب ہم موجودہ دعوتی عمل پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس میدان میں ہم نے کچھ راستہ طے ضرور کیا ہے مگر اسے طے کرنے میں ہم کچھ جلدی بھی کر بیٹھے ہیں!

☆☆☆☆☆☆☆

## معاصر تحریکوں میں

# عجلت پسندی

## آ جانے کے اسباب اور عواقب

بنیادی طور پر تین باتیں دور حاضر کی اسلامی تحریکوں میں جلد بازی کے آ جانے کا سبب بنی ہیں:

۱) اس بات کا دقیق جائزہ نہ لیا جانا کہ اس وقت مسلم اقوام کا حقیقتِ اسلام سے فاصلہ کس قدر ہے۔

۲) عوام میں اسلام کی خاطر پائے جانے والے جوش وخروش سے دھوکہ کھا جانا اور یہ سمجھ بیٹھنا کہ یہ مہم پُر مشقت ضرور ہے مگر اس میں منزل کا آ جانا بہت دور نہیں۔

۳) اس بات کا ___ کافی اور پیشگی ___ اندازہ نہ ہونا کہ دشمن کا ردعمل کیا ہو سکتا ہے اور اس کی جانب سے کیا کیا کچھ چال چلی جا سکتی ہے۔

جلد پسندی کے ان تینوں اسباب کی ہم کچھ وضاحت کریں گے۔

نصف صدی پیشتر جب اسلام کی دعوت عام ہونا شروع ہوئی تب مسلم اقوام کی صورتحال کے تمام پہلو ابھی کھل کر واضح نہ ہو پائے تھے۔ اسلام کے ظاہری اعمال کے کچھ بقایا جات ایک دیکھنے والے کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر سکتے تھے کہ مسلم اقوام میں اسلام کا ابھی بہت کچھ باقی ہے...... جبکہ معاملہ یہ تھا کہ استعمار کی فکری یلغار مسلم معاشروں میں اوپر کی سطح پر ابھی اس حد کو نہیں پہنچی تھی جتنی کہ اب دیکھی جا سکتی ہے۔ معاشرے میں دین کے 'روایتی مظاہر' دراصل اسلامی تہذیب کے بقایا جات تھے مگر یہ اس نقب پر ابھی پردہ کئے کھڑے تھے جو اس فکری یلغار کی صورت میں معاشرے کو اندر سے لگ چکا تھا۔ چنانچہ صورتحال اپنی اصل حقیقت کے ساتھ ابھی نظر نہ آ رہی تھی۔

جہاں تک اس فکری یلغار کا تعلق ہے تو وہ تو اسی وقت سے شروع ہو چکی تھی جب عالم اسلام کے ممالک مغرب کے مقبوضہ جات بنے اور عالم اسلام میں لوگ مغرب کی مادی اور سائنسی ترقی کو دیکھ دیکھ کر مبہوت ہونے لگے کیونکہ مسلمان زندگی کے ہر میدان میں حد درجہ پسماندہ تھے۔ پھر اصل کام اس تعلیمی اور ابلاغی نظام نے کیا جو اس یلغار کو دلوں اور دماغوں میں گہرا کر گیا اور جس کے نتیجے میں بڑی تدریج کے ساتھ ہر نئی نسل فکری اور عملی طور پر اسلام سے دور ہونے اور مغرب کے نئے 'دین' کو اپنانے میں پہلی نسل سے دو ہاتھ آگے ہو جاتی رہی...... مگر آج سے ساٹھ ستر سال پہلے جب دعوت اسلامی کا ایک بڑی سطح پر آغاز ہوا تو ابھی صورتحال ایسی ہی تھی کہ مغرب زدگی کے اس عمل نے عوامی اور معاشرتی سطح پر ابھی یہ سب گل نہیں کھلائے تھے جو بعد میں دیکھنے میں آئے۔ یہ وہ دور تھا جب برہنہ ہونا ابھی صرف بڑے خاندانوں کی بیگمات تک محدود تھا۔ متوسط طبقے کی خواتین اس برہنگی سے ابھی بڑی شرم محسوس کرتی تھیں۔ گو اخبارات و جرائد میں تصویروں اور خبروں اور افسانوں کی صورت میں یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر اور پڑھ پڑھ کر ان میں بھی بڑی خاموشی سے اس چیز کی خواہش کروٹ ضرور لینے لگی تھی۔ یہ تو تھی متوسط اور خاصی حد تک پڑھے لکھے طبقے کی بات۔ پھر جہاں تک عام گلی محلے کی بیٹیوں کا معاملہ تھا وہ تو اس برہنگی سے ہول کھاتی تھیں اور اس بات کو انتہائی لچر جانتی تھیں۔

یہ وہ دور تھا جب کسی لڑکے اور لڑکی میں محبت کا معاملہ اگر کبھی ہو جاتا تھا___ اور وہ بھی ایسی محبت جسے آج کے ادب میں 'معصوم' کہا جاتا ہے___ تو وہ حیا سے مر جانے کی بات ہوتی تھی۔ اپنے تعلق کو آخری حد تک چھپانے کی ضرورت محسوس نہ کرنے والی لڑکی حد درجہ بیچ جانی جاتی تھی! یہ وہ دور تھا جب کتب اور جرائد میں مغربی فکر مغربی شخصیات کے نام سے ہی پھیلایا اور شائع کیا جاتا تھا اور فحش ادب لکھنے والے اگر مقامی ہوتے بھی تھے تو وہ اسے اپنے فرضی نام سے شائع کرنا مناسب سمجھتے تھے۔ تھیٹر، سینما، ریڈیو سب کچھ تھا، یہ سب کچھ اس فکری یلغار کو آگے بڑھانے میں مدد بھی دیتا تھا مگر اس صنعت نے مقامی سطح پر ابھی بہت زیادہ وہ ترقی نہیں کی تھی اور اس کی تاثیر بھی ابھی بالکل ابتدائی قسم کی تھی۔

مختصر یہ کہ معاشرے کے ظاہری بگاڑ میں ابھی وہ شدید تیزی نہیں آئی تھی جو اس سے کچھ دیر بعد دیکھنے میں آئی۔ پھر خاص طور پر اس نے جو آخری زقند بھری وہ تو سب کچھ ہوا ہی دوسری جنگ عظیم کے بعد۔

یہ تو تھا اس بگاڑ کے بیرونی مظاہر کا معاملہ۔ دوسری جانب ہماری 'مشرقی روایات'___ کم از کم ظاہری حد تک___ ہنوز قائم تھیں اور دیکھنے والے کو یہ فریب دینے کیلئے کافی تھیں کہ ہماری یہ روایات اس فکری یلغار کے سامنے جس طرح اس سے نصف صدی پہلے کھڑی تھیں ویسے ہی نصف صدی بعد بھی کھڑی رہ جائیں گی۔ یہ فریب ہوتا بھی کیوں نہ لوگوں کی بڑی تعداد ابھی نمازی تھی۔ حتی کہ بڑے دارالحکومتوں میں بھی جو کہ اس فکری یلغار کا گڑھ ہوا کرتے تھے لوگ مسجدوں میں بڑی تعداد میں آتے تھے۔ رمضان میں چھوٹے بڑے سب روزے رکھتے۔ بے روزہ بھی کسی کے سامنے کھانے پینے کی جرات نہ کرتا۔ شادی ہمیشہ والدین کی جان پہچان سے بلکہ انہی کے ہاتھوں انجام پاتی۔ خاندانی روابط قابل رشک تھے۔ یہ وہ دور تھا جب خاندان کے سربراہ کی سنی جاتی اور گھر کے بڑوں کی مانی جاتی تھی۔ بچے بچیاں جوان ہو کر بھی روایات سے نہیں نکلتے تھے۔ اگر کوئی اپنی خاندانی اور معاشرتی روایات سے پیر باہر رکھتا تو لوگ کم از کم بھی اس سے منہ پھیر لینے اور اس کو شدید برا جاننے کی ضرورت محسوس کرتے۔ ابھی یہ شہروں کا حال تھا۔ دیہات میں تو جیسے ابھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ نسلوں سے جو طرز زندگی چلا آتا رہا دیہات میں ابھی وہ من وعن باقی تھا۔ دیہات کے لوگ 'شہروں کی بے راہ روی' سے گھن کھاتے تھے اور 'پرانا زمانہ' گزر جانے پر حسرت سے آہ بھرتے تھے۔

ایسے مظاہر کو بادی النظر دیکھنے والے سے بہت سے حقائق روپوش رہ سکتے تھے!

کوئی تھوڑی دیر سے نہیں، عرصہ دراز سے اسلام واقعی روایات کا ایک مجموعہ بنا کر رکھ دیا گیا تھا۔ یہ روایات اسلام کی حقیقی روح سے خالی تھیں۔ یوں بھی قوموں کی زندگی میں ایک خاص مرحلے میں جا کر روایات سے وابستگی اس نوبت کو پہنچ جاتی ہے کہ دیکھنے والے کو پہلی نظر میں یہ لگتا ہے کہ لوگ واقعی دین کی حقیقت پر قائم ہیں۔ لیکن روایات اگر کسی شعوری بنیاد پر قائم نہیں تو کچھ عرصے بعد یہ ایک ایسے درخت کی طرح سوکھنا اور سکڑنا شروع ہو جاتی ہیں جسے جڑوں سے غذا ملنا بند ہو گیا ہو۔ روایات اور مظاہر بھی ایک ایسا ہی درخت ہے جسے فکر اور شعور کی غذا کافی مقدار میں نہ ملے تو ایک طرف یہ سوکھنا اور سخت لکڑی بننا شروع ہو جاتا ہے تو دوسری طرف اسے اپنا پورا پھیلاؤ برقرار رکھنے میں بھی شدید دشواری پیش آتی ہے۔ پھر بھی روایات کے اس درخت کا بھرم صدیوں تک رہ سکتا ہے اگر معاشرے میں نیچے کی سطح پر کوئی زوردار بھونچال یا فضا میں کوئی طوفان نہ آجائے۔ اب ایک ایسے درخت کا کھڑا رہنا یا کھڑا نہ رہنا بہت اہم سوال نہیں رہ جاتا جس کا ڈھ جانا بہرحال ٹھہر گیا ہو۔ اس درخت کو

تو آخر کار مٹی خود کھا جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کسی اور فکری یلغار کی شدت اسے 'وقت' سے پہلے گرا دیتی ہے۔

عالم اسلام کے ساتھ جو معاملہ ہوا وہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ عالم اسلام پر مغرب کی فکری یلغار کے جو ہتھوڑے برسے اور جو کہ بڑی شدت اور بڑی بے رحمی سے برسائے گئے، ان کا ہدف ہماری یہاں کی روایات نہیں بلکہ ان کا اصل ہدف درحقیقت اسلام تھا۔ روایات کے پیچھے وہ دراصل اسلام کو ملیا میٹ کر دینا چاہتے تھے۔ ان کے پیچھے واقعی اسلام اپنی روح کے ساتھ ہوتا تو صورتحال مختلف ہوتی مگر خالی روایات ان ضربوں کا بھلا کہاں تک مقابلہ کرتیں جو بڑی منصوبہ بندی سے اور ایک لگاتار انداز میں اور بہت ہی بے دردی کے ساتھ سو سال تک برسائی جاتی رہیں۔

ساٹھ ستر سال میں یہ منظر نامہ حیران کن حد تک تبدیل ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ قوم جو ان شہروں اور ان دیہات میں ساٹھ ستر سال پہلے بستی تھی، گویا وہ سب کی سب کہیں کو سدھار گئی اور اس کی جگہ گویا یہاں کوئی اور قوم آ بسی ہے جن کے آپس میں صرف نام ملتے ہیں۔ پرانے جسے 'بے راہ روی' کہتے تھے وہ یہاں 'ترقی پسندی' اور 'روشن خیالی' بن کر ہر طرف پھیل گئی۔ زہریلے سانپ کا زہر جس طرح جسم میں پھیلتا ہے اسی تیزی سے یہ زہر معاشرے میں ہر طرف پھیل گیا۔ اب وہ وقت نہیں جب برہنگی بڑے خاندانوں کی بیگمات کا خاصہ سمجھا جائے۔ متوسط طبقے کی بیٹیاں بھی اب کسی سے پیچھے نہیں۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ یہ آفت اب دیہات کو اپنی لپیٹ میں لینے لگی ہے!

لڑکوں اور لڑکیوں میں 'معصوم' ہی نہیں 'غیر معصوم' تعلقات بھی معمول کی چیز ہو چکے بلکہ کسی نوجوان کا اس 'معمول' سے بچ رہنا آج حیرانگی کا باعث جانا جاتا ہے! خاندان ٹوٹ پھوٹ چکا۔ خاندان کے سربراہ کا دورِ اقتدار ختم ہوا۔ بڑوں کی ماننا ماضی کا قصہ کہلایا۔ لڑکے اور لڑکیاں اپنے معاملات اب خود بہتر جاننے لگے ہیں اور والدین کو 'دخل در معقولات' کی بہت کم اجازت ہے۔ 'دین' اور 'مذہب' عموماً جمود اور بند ذہنیت کی علامت سمجھا جانے لگا۔ دیندار ہونا پسماندگی کا نشان اور زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کا سبب جانا گیا۔ نقش کہن پہ اَڑنا آدمی کے ان پڑھ ہونے کی دلیل بنا اور کسی بھی اعلیٰ قدر پر جم جانا جمود اور کم عقلی جانا گیا اور کہا یہ گیا کہ یہ زمانہ جمود کا نہیں ارتقاء کا ہے۔

ساٹھ ستر سال میں یہ سب کچھ تبدیل ہو گیا۔ اس کو علم اور ارتقا کا نام دیا گیا۔ مہذب دنیا کے شانہ بشانہ چلنے کا عنوان دیا گیا۔ اس کو ٹیکنالوجی اور انفارمیشن کا انقلاب کہا گیا۔ روز بروز یہ عمل اب اور بھی

'ترقی' کی سمت گامزن ہے!

ہم بھی یہ مانتے ہیں کہ انسانی دنیا میں اس نئی تبدیلی نے جو ایک کھلبلی مچا دی ہے عالمِ اسلام کو ان عالمی تبدیلیوں سے لاتعلق بہر حال نہیں رہنا تھا۔ مگر ہمارا دعویٰ ہے کہ صورتحال اس سے یکسر مختلف ہوتی اگر اسلام ان مسلم معاشروں میں ایک زندہ حقیقت ہوتا نہ کہ محض روایات کا ایک مجموعہ جن میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں۔

جہاں تک ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقی کا تعلق ہے تو وہ ایک مسلمان کیلئے کسی الجھن کا باعث ہونی ہی نہیں چاہئے۔ مسلمانوں نے پہلے بھی تو ایک مختصر ترین وقت میں دنیا بھر کی سائنسی ترقی کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ خود بھی پھر سائنس میں بے انتہا قیمتی بلکہ بنیادی اضافے کئے جن میں سے نمایاں ترین 'سائنسی تحقیق کا تجرباتی طریقہ کار' ہے جو مسلمانوں نے دنیا میں متعارف کرایا۔ اور وہ سب سائنسی انکشافات الگ ہیں جو سائنس کی موجودہ ترقی کی بنیاد میں پڑے ہیں۔ مگر بات یہ ہے مسلمان سائنس پڑھتا ہے تو اس سے اس کا عقیدہ متاثر نہیں ہوتا۔ اللہ پر اور یوم آخرت پر اس کا ایمان متزلزل نہیں ہوتا۔ کیونکہ مسلمان ایک مستقل ہستی کا مالک انسان ہے۔ ایک ایسی متوازن ہستی جس میں سائنس اور ایمان دونوں سما سکتے ہیں۔ نہ صرف سما سکتے ہیں بلکہ باہم متعاون ہو سکتے ہیں۔ یہاں سائنس اور ایمان کے مابین نہ کسی تعارض کا امکان ہے اور نہ کسی تضاد کا۔

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (فاطر:۲۸) حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم وآگہی رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں

سائنس اور ایمان کا یہ تضاد تو دراصل یورپ میں وقوع پذیر ہوا جس کا سبب اُس 'دین' کا اپنا خلل تھا جس پر اس سے پہلے یورپ ایمان رکھے ہوئے تھا۔ یہ خلل اس تصور میں تھا جو یورپ کو اس کے دین نے بنا کر دیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ 'دین' اپنی فطرت میں 'سائنس' سے متعارض ہے اور نہ ہی اس وجہ سے 'سائنس' اپنی طبیعت میں 'دین' کا کوئی متبادل ہے بلکہ اس وجہ سے کہ یورپ جسے 'دین' سمجھتا تھا خود اس میں 'سائنس' سے تعارض پایا جاتا تھا اور جس کی وجہ سے سائنس کو آخر کار اور مجبوراً 'دین' کا متبادل بننا پڑا۔

سو اگر اسلام ان مسلم معاشروں میں ایک زندہ حقیقت ہوتا نہ کہ محض روایات کا ایک ایسا مجموعہ جن میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں، تو یہ امت ضرور اس پوزیشن میں ہوتی کہ یہ انسانیت کو عمرانی ارتقاء کا

ایک بالکل منفرد نمونہ پیش کر کے دیتی۔ یہ تہذیبی ترقی کا ایک ایسا نمونہ ہوتا جو تمدن کے اس مغربی نقشے سے یکسر مختلف ہوتا جس میں ایک سے بڑھ کر ایک رخنہ پڑ تا رہا ہے۔ مغرب کو کچھ ایسی کوتاہ نظری نصیب ہوئی ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں بھی اس کو انسان پورا نظر نہیں آ سکا۔ کبھی یہ انسانی وجود کا صرف روحانی پہلو دیکھتا تھا اور اب کچھ صدیوں سے اسے اس کا صرف مادی پہلو نظر آ تا ہے۔ مغرب کی تاریخ میں ہمیشہ یہ محدود نظری رہی ہے کہ آخرت کا تصور کرنے کیلئے دنیا نظر سے روپوش ہو جائے اور دنیا کو توجہ دینے کیلئے آخرت سے دامن کش ہونا پڑے۔ کسی بھی حالت میں انسانی وجود کو پورا لینا اس کیلئے ممکن نہیں رہا اور انسانی ضرورت کا ایک کلی تصور رکھنا کبھی مغرب کے بس کی بات نہیں رہی۔ انسان تو دراصل ایک مشتِ خاک اور ایک نفخۂ روح کا آمیزہ ہے۔ یہ دونوں عنصر آپس میں مل کر گتھم گتھا ہوں تو انسان وجود میں آتا ہے۔ یہ بات ایک مسلمان پر بہت واضح ہے۔

| | |
|---|---|
| إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَراً مِن طِينٍ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ (ص: ۷۱-۷۲) | جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا: میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ |

امت کا اب اس بات سے عاجز رہنا کہ وہ اپنے زمانے میں ہونے والی سائنسی اور تکنیکی ترقی کو ایک بہترین انداز میں اپنے اندر سمیٹ لے اور اس سے اپنے زمانے کے شایان شان عمرانی ارتقا کا ایک منفرد نمونہ پیش کر سکے...... ایک ایسی بات ہے جو اپنے اندر ایک واضح دلالت رکھتی ہے جسے اس دور کے داعیانِ اسلام کی نظر سے ہرگز روپوش نہیں رہنا چاہیئے تھا۔ اس واقعے کی عمومی دلالت یہ تھی کہ مسلمانوں میں اس دین کی فاعلیت کا اصل شعلہ بجھ چکا ہے یا پھر اس حد تک سرد پڑ چکا ہے کہ اب یہ امت اپنے زمانے کے حالات سے اس زندہ انداز کا تفاعل کرنے سے عاجز آ چکی ہے جس زندہ انداز سے تاریخ میں یہ اپنے زمانے کے ساتھ پورا اترتی آئی ہے۔ اُمت میں زندگی کے ساتھ تفاعل اختیار کرنے اور زندگی کے ساتھ پورا اترنے کے جذبے کا یوں سرد پڑ جانا اور زندگی کے ہر میدان میں ایک سردمہری کا آ جانا ظاہر ہے واضح اسباب رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ تو واضح ہے کہ اس ذہنیت کا اس دین کی طبیعت اور مزاج سے ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک زندہ اور زندگی سے بھرپور دین ہے۔ یہ تاریخ میں عجیب وغریب کمالات دکھا چکا ہے۔ جب بھی کسی معاشرے نے اس دین پر پوری سچائی اور پورے شعور کے ساتھ ایمان رکھا اور

دنیائے واقع میں اسے حقیقت کا روپ دینے کیلئے اسے اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھا دنیا نے ہمیشہ معجزات دیکھے۔ ضرور کچھ ایسے امراض ہونگے جن کا تعلق اس دین سے بہرحال نہیں۔ دلوں کی بیماریاں جسموں کو بھی مریض کر کے رہتی ہیں!

ألا ان فی الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد كله، وإذا فسدت فسد الجسد كله، ألا وهي القلب (أخرجه البخاری)

خبردار جسم میں ایک ایسا لوتھڑا ہے جو اگر صحیح ہو تو سارا جسم ٹھیک رہتا ہے۔ اس میں خرابی آئے تو سارے جسم میں خرابی آ جاتی ہے، یہ دل ہے

چنانچہ اسلام کے داعیوں پر اگر یہ امراض واضح ہو گئے ہوتے جو امت کے جسم کو کھا چکے تھے تو وہ ابتدائے کار میں ان امراض کے علاج کو ہی اولیت دیتے۔ اگر ان پر یہ واضح ہو گیا ہوتا کہ پسماندگی کے یہ سب مظاہر جو مسلمانوں کی زندگی میں بول بول کر اپنا آپ بتا رہے ہیں...... خواہ وہ علم اور سائنس میں پسماندگی ہو، خواہ مادی افلاس ہو، خواہ سیاسی محکومیت ہو، خواہ جنگی پسپائی ہو، خواہ عمرانی تنزل ہو اور خواہ تہذیبی اور ثقافتی افلاس...... یہ سب جس چیز کا شاخسانہ ہے وہ مسلمانوں کی عقیدے میں پسماندگی ہے جو مسلمانوں کے اس آخری دور میں بطور خاص مسلم ذہن اور مسلم معاشرے میں آئی ہے...... ان داعیوں پر اگر یہ واضح ہو گیا ہوتا تو وہ اپنی دعوت اور اپنی تحریک کیلئے اس سے کوئی مختلف منہج اپناتے جو کہ وہ اب تک اپنائے رہے۔ تب ان کا، اس مرض کا علاج کرنے کا، طریق کار بھی اس سے کہیں مختلف ہوتا۔

یہ حقیقت کہ یہ امت، اسلام کی جو اصل صورت ہے اس سے ابھی دور ہے...... ان داعیوں پر بھی ضرور واضح تھی۔ ہمارے اس دور کی تحریکوں کو بھی ان کا ضرور ادراک تھا۔ ہمیں شک اس بارے میں نہیں۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے ہی اتنی واضح کہ اس کا روپوش رہنا کسی سے ممکن نہیں۔ البتہ یہ بات کہ یہ امت، اسلام کی اس اصل صورت سے، جس پر کہ اسے ہونا چاہئے، کتنی دور ہے اور اصل اسلام سے اس کے فاصلے کی نوعیت اور کیفیت کیا ہے...... یہ بات البتہ ضرور ایسی تھی جو بہت سے داعیوں کی نگاہ سے چھپی رہی۔ اس کا سبب روایات کی وہ دبیز تہہ تھی جو سات عشرے پیشتر یہ فریب دے رہی تھی کہ یہ معاشرہ کسی نہ کسی حد تک اپنی اصل پر قائم ہے۔ اس سے داعیوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ عمارت کی بنیادیں تا حال سلامت ہیں اور ان میں کہیں کہیں تھوڑی بہت مرمت کی ضرورت ہے!

اسلامی تحریک کو اس وقت چاہیے یہ تھا کہ وہ مظاہر کا پردہ اٹھا کر ان بنیادوں کا جائزہ لیتی اور پھر یہ فیصلہ کرتی کہ یہ بنیادیں پوری طرح قائم ہیں یا تاریخ میں بار بار کے ان بھونچالوں نے انہیں ہلا کر رکھ دیا ہے...... تا آنکہ اس بات کا درست فیصلہ ہوتا کہ عمارت کہیں کہیں سے صرف مرمت کی ضرورت مند ہے یا بالکل ہی ایک تاسیس نو کی۔

امت میں اس بار جو خرابی آئی تھی وہ صرف عملی زندگی تک محدود نہ رہی تھی۔ اس کا دائرہ بنیادی مفہومات تک چلا گیا تھا۔ مفہومات اور تصورات میں آ جانے والا انحراف اس انحراف سے کہیں سنگین ہوا کرتا ہے جو محض عملی زندگی تک محدود ہو۔ اس کا علاج بھی اتنا ہی دشوار ہوا کرتا ہے۔

خرابی اگر کسی فرد یا جماعت یا امت کی صرف عملی زندگی تک محدود ہو، مگر اس کے مفہومات اور تصورات اپنی جگہ صحیح شکل میں قائم ہوں، تو اس خرابی کی اصلاح چاہے جتنی بھی پر مشقت ہو اتنی مشکل بہر حال نہیں ہوتی جتنی کہ اس وقت، جب عمل کے پیچھے تصور اور مفہوم بھی بگڑ چکا ہو۔ کیونکہ ایسی صورت میں آپ کو دوہری محنت کرنا پڑتی ہے۔ مفہومات کی تصحیح پر محنت الگ ہوتی ہے جو کہ اس عمل کا اصل مشقت طلب پہلو ہے اور عمل کی تصحیح پر الگ محنت ہوتی ہے۔

ہمارے اس دور میں جب اسلامی دعوت اور اسلامی تحریک کا آغاز ہوا تو حقیقت میں اس وقت اسلام کے بنیادی مفہومات اور تصورات ہی بگاڑ اور انحراف کا شکار ہو چکے تھے۔ جیسا کہ اس سے پہلے ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ **لا الہ الا اللّٰہ** کا مفہوم بھی اس بگاڑ سے محفوظ نہ رہا تھا۔ بلکہ یوں کہیے اس بگاڑ کا آغاز ہی **لا الہ الا اللّٰہ** کا مفہوم بگڑنے سے ہوا تھا۔ **لا الہ الا اللّٰہ** محض اب ایک کلمہ بن کر رہ گیا تھا جسے زبان سے ادا کر دیا جانا ہو۔ اس کے ساتھ کچھ اور بچ گیا تھا تو وہ چند شعائرِ عبادت تھے اور وہ بھی کچھ لوگوں کے ہاں جن پر ایک روایتی سا انداز اس سے کہیں غالب تھا جتنا کہ ان مراسم بندگی کی ایک زندہ شعور کے ساتھ ادائیگی، جو کہ اگر پائی جائے تو انسان کو زندگی کے ایسے ہمہ گیر منہج کے ساتھ جوڑ دیتی ہے جو اس کی پوری زندگی کا احاطہ کر لے۔ یہاں نماز روزہ کا بھی وہ تصور بڑی حد تک روپوش تھا جو انسان کو مراسمِ بندگی سے لے کر عملی زندگی، سیاست، معیشت، سماجی روابط اور فکری رجحانات میں بیک وقت ایک مستحکم اور باہم مربوط روش پر چلا سکے۔

بے شمار عوامل ایسے تھے جو لوگوں کے ذہن و فکر کے اندر اسلام کے بنیادی مفہومات میں بگاڑ لے آنے کا سبب بنے۔ جس کے نتیجے میں اسلام کے یہ بنیادی تصورات اپنی اس شکل میں کہ جیسے یہ اللہ

کے ہاں سے نازل ہوئے تھے اور جن کو اسلام کی نسل نو نے سب سے پہلے اپنے قلب و ذہن میں بٹھایا تھا اور اپنی زندگی میں ان کو ایک زندہ اور چلتی پھرتی حقیقت بنا دیا تھا...... اور پھر ان کے بعد کی نسلیں بھی انہی تصورات کو اپنے قلب و ذہن میں بٹھاتی اور اپنی زندگی کی حقیقت بناتی رہی تھیں...... اسلام کے یہ بنیادی تصورات اب کے لوگوں کے قلب و ذہن میں رہے تھے اور نہ عملی زندگی میں۔

ارجائی فکر اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو چکا تھا کہ 'ایمان' کے مفہوم سے 'عمل' کو خارج کر دے اور لوگوں کو یہ باور کرا دے کہ ایمان بس تصدیق کر دینے کا نام ہے یا زبان سے اقرار کر لینے کا! اور یہ کہ جو زبان سے **لا الہ الا اللہ** کہہ دے بس وہ مومن ہے چاہے اسلام کے اعمال میں سے کسی ایک پر بھی کاربند نہ ہو!

صوفی فکر اسلام کو بس روح کی ریاضتوں میں تبدیل کر چکا تھا۔ یوں اسلام کا مطلب کچھ خاص ورد کرنا تھا۔ کچھ خاص اذکار اسلام کی پہچان بن گئے۔ وجد اور عشق اسلام کے بنیادی فرائض بنے جو دنیائے واقع میں تبدیلی لانے کیلئے ایک پتہ تک نہ ہلا سکیں۔ نہ امر بالمعروف کیلئے کوئی تکلیف کرے اور نہ نہی عن المنکر کا دردسر مول لے اور نہ جہاد کی کوئی سبیل...... یہ سب کچھ اصل خلل کے علاوہ تھا جو عقیدہ میں اولیاء اور درگاہوں کی پوجا پاٹ کے سبب آ چکا تھا اور جس کی رو سے غیر اللہ کیلئے عبادت کے ایسے افعال روا کر لئے گئے تھے جو صرف اللہ تعالیٰ کیلئے سزاوار ہیں۔

پھر رہی سہی کسر اس سیاسی استبداد نے نکال دی جو یہاں بنو امیہ کے دور سے شروع ہوا تو پھر بنو عباس اور پھر ممالیک اور پھر عثمانیوں کے دور تک آتے آتے ہر دور میں اور اپنے ہر مرحلے میں اور سے اور بڑھتا رہا۔ اس سیاسی استبداد نے لوگوں میں ایک ایسی ذہنیت پروان چڑھائی کہ آدمی بس اپنے کام سے کام رکھے اور معاشرے کو درست کرنے سے بہت کم سروکار۔ یہاں کا سیاسی استبداد بھی اس بات کا سبب بنا کہ عبادت کا تصور بس چند مراسم دین تک محدود ہو جائے اور اگر نیکی اور فضیلت کے کاموں کی طرف کسی کی توجہ ہو بھی تو وہ ایسے کام ہوں جو اجتماعی اور سماجی معاملات میں آدمی کے دخل دینے کا باعث نہ بنیں۔

توکل ایک زبردست عقیدہ تھا مگر اب اس سے مراد یہ لی جانے لگی کہ اسباب اختیار کرنا موقوف اور معاملہ بس خدا پر ڈال دیا جائے۔

عقیدۂ تقدیر کم ہمتی اور نامردی کیلئے 'شرعی عذر' ٹھہرا۔ حالانکہ یہی تقدیر کا عقیدہ مسلمانوں کو جری و بہادر بناتا تھا اور ایک دنیا سے ٹکر لے لینے پر آمادہ کر دیتا تھا۔ قضا و قدر کا عقیدہ کبھی مسلمان کو بتایا

کرتا تھا:

قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَن يُصِيبَكُمُ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِندِهِ أَوْ بِأَيْدِينَا فَتَرَبَّصُوا إِنَّا مَعَكُم مُّتَرَبِّصُونَ (التوبۃ:۵۱۔۵۲)

ان سے کہو: ”ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے۔ اور اہل ایمان کو ایک اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے“۔ ان سے کہو: ”تم ہمارے معاملے میں جس چیز کے منتظر ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہے (یعنی فتح یا شہادت) اور ہم تمہارے معاملے میں جس چیز کے منتظر ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ خود تم کو سزا دیتا ہے یا ہمارے ہاتھوں دلواتا ہے؟ اچھا تو اب تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں

اب ایک ایسا وقت آ گیا تھا کہ مسلمان کیلئے دنیا اور آخرت کے راستے الگ الگ ہو گئے۔ حالانکہ اس سے پہلے دو جہان میں سرخرو ہونے کیلئے اس کو ایک ہی راہ چلنی ہوتی تھی۔ نہ دنیا کی راہ آخرت سے الگ تھی اور نہ آخرت کی، دنیا سے۔ اور ان دونوں میں تعارض ایک مسلمان کی سمجھ سے باہر ہوا کرتا تھا۔

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (القصص:۷۷)

اللہ نے تجھے جو کچھ دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ (الملک:۱۵)

وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو تابع کر رکھا ہے۔ پس چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق، اسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے

چنانچہ دیندار مسلمانوں کی ایک بڑی کثرت ’دنیا‘ کے راستے کو چھوڑ چھڑا کر ___ جس میں علم، سائنس، قوت کے اسباب، زمین پر قبضہ و اقتدار مستحکم رکھنا، بستیاں بسانا اور معاشروں کی حالت سدھارنا سب کچھ آتا تھا ___ اس ’دنیا‘ کے راستے کو چھوڑ کر اللہ سے ’اخروی‘ تقرب پانے کیلئے ہر چیز سے فراغت پانے کے طلبگار ہوئے۔ جس کا طریقہ ذکر و ورد کی مجلسیں منعقد کرنا تھا اور عشق و وجد کی ریاضتیں، کاروبارِ دنیا کی جانب متوجہ ہونا اب ان لوگوں کا کام ٹھہرا جن کو آخرت سے سروکار نہیں۔ یوں دنیا ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو دولت اور اقتدار کے پجاری تھے اور جن کو اللہ کے سامنے جوابدہی اور حساب کتاب کا شعور تک نہ تھا۔ یہ اُدھر دنیا میں فساد مچاتے رہے اور یہ اِدھر اپنی آخرت سنوارتے رہے!

یہ سب امراض جو اُمت کی ایک بڑی اکثریت کو لاحق ہوئیں اور جو کہ دین کو اس کی حقیقت سے فارغ کر چکی تھیں اور لا الہ الا اللّٰہ کو، امت کی زندگی میں، اس کی اصل فاعلیت سے محروم کر چکی تھیں......ان امراض کا تقاضا تھا کہ قبل اس کے کہ عوام کو ساتھ ملا کر چلایا جائے، کام کا آغاز امت میں لا الـہ الا اللّٰہ کا مفہوم درست کرنے اور معاشرے پر اثر انداز ہو سکنے والی ایک بھاری جمعیت کی تربیت و تیاری سے کیا جاتا!

☆☆☆☆☆☆☆

ایک طرف اگر یہ معاملہ تھا کہ مسلم معاشروں میں پرانی روایات کا ___ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے ___ اس حد تک بھرم قائم تھا کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کیلئے کام کرنے والے اس سے دھوکہ کھا کر اس اصل مرض سے غافل ہو جائیں جو کہ امت میں ___ ایک بڑی سطح پر ___ اس کے عقیدے اور اس کے تصور اسلام ہی کو لگ چکا تھا......تو دوسری طرف عوام کا وہ جوش و جذبہ، جو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کیلئے دیکھنے میں آتا رہا، اس فریب کو بڑھا دینے اور تحریکوں کو معاشرے کی اصل صورت حال سے غافل کر دینے میں اور بھی بڑا سبب بنا۔

لوگوں میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے کام کیلئے جو جوش و جذبہ پایا گیا وہ واقعی دیدنی تھا۔ مصر میں چند سال کے اندر امام حسن البنا شہیدؒ کے گرد جو لوگ اکٹھے ہوئے ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد نصف ملین (پانچ لاکھ) کو پہنچتی ہے جن میں اکثریت نوجوانوں کی تھی۔ یہ ایک بہت بڑی شرح تھی خصوصاً جبکہ ہم یہ ذہن میں رکھیں کہ اس وقت مصر کی کل آبادی بیس ملین (دو کروڑ) کو ابھی نہیں پہنچی تھی۔ اس تعداد میں سے ہم عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور ایسے لوگوں کو نکال دیں جو کسی بھی عوامی کام میں شریک نہیں ہو سکتے، یا جو 'ہر حال میں خوش رہنے' والے لوگ ہوتے ہیں اور ہر نئے آنے والے کو سلام کرتے ہیں! ان لوگوں کو نکال دیں تو امام حسن البنا کے گرد پانچ لاکھ کی تعداد ہرگز کوئی چھوٹی تعداد نہیں۔

اس میں بھی شک نہیں کہ امام شہید [1] کو جو روحانی تاثیر کا قدرتی ملکہ حاصل تھا، اور لوگوں کے دلوں میں گھر کر لینے کی جو خاص صلاحیت تھی وہ بھی اس بات کا سبب بنی کہ لوگ ان کی دعوت کیلئے شدید حد تک جوش و خروش محسوس کریں۔ ایک ایسا شخص جو ان کی طرح دلوں میں بسنا نہ جانتا ہو اور ان جیسی

(۱) امامِ شہید کا لقب اخوان کے ہاں حسن البنا کیلئے مستعمل ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس کو جوں کا توں رہنے دیا ہے۔ مترجم

صلاحیتوں کا مالک نہ ہو، اتنے تھوڑے عرصے میں انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو اپنے چاروں طرف اکٹھا کبھی کر ہی نہیں سکتا تھا۔

لیکن ہمیں ایک نظر عوام پر ڈالنی ہے جن میں اخوان کی دعوت یوں دنوں میں مقبولیت حاصل کر گئی۔ لوگوں کی اتنی بڑی تعداد علی وجه التحديد آخر کس بنا پر امام کے ساتھ اکٹھی ہوئی؟

لوگوں کو ایک ایسا شخص مل گیا تھا جو ان میں پائی جانے والی روحانیت کی پیاس بجھا رہا تھا اور بڑے ہی پڑھے لکھے اور جدید تعلیم یافتہ انداز میں یہ پیاس بجھا رہا تھا۔ جبکہ اس سے پہلے انہوں نے روحانیت کا درس ذکر کے ان خاص حلقات میں سنا تھا جو ان پڑھ عوام میں مقبول رہے ہیں اور جو کہ صوفیاء کے مشائخ طریقت کے ہاں چلتے ہیں اور جس سے کہ عام پڑھے لکھے الرجک ہوتے ہیں مگر وہ اس کا متبادل بھی کہیں نہیں پا رہے ہوتے...... اب ان کو یہ متبادل امام شہیدؒ کی شخصیت میں اور ان کی تاثیرِ کلام میں مل گیا جو روحانیت میں ان کی پیاس بجھا رہا تھا مگر بیک وقت ان کے 'پڑھا لکھا' ہونے پر حرف بھی نہ آنے دیتا تھا۔ یہ 'شیخ' روحانیت کا ایسا نشہ بھی نہ ہونے دیتا تھا جس سے انسان کی عقل و ہوش سلب ہو جائے......

عوام کو ایک ایسا رہنما مل گیا تھا جو ان کی نظر میں ان کی، اسلام کی ان ملکوں پر پھر سے حکمرانی کروا دینے کی، آرزوئیں پوری کرنے جا رہا تھا...... وہ بھی عین اس وقت جب لوگ ابھی سقوطِ خلافت کے زخم چاٹ رہے تھے۔ اسلام پسند عوام کو ایک ایسا راہبر نظر آ رہا تھا جو خباثت اور بے حیائی کے اس طوفان کو تھام دینا چاہتا تھا جس کا معاشرہ گرفتار ہو چکا تھا اور جس سے یہ لیڈر لوگوں کو اعلیٰ اخلاق اور تہذیبی اقدار کی جانب واپس لانا چاہ رہا تھا...... یہ پانچ لاکھ عوام حسن البنا سے اس سب کچھ کی توقع کر رہے تھے بغیر اس کے کہ یہ خود کوئی بڑا خطرہ مول لینے پر تیار ہوں اور اس نیک مقصد کیلئے امام کے پروگراموں میں بڑی پابندی کے ساتھ شریک ہونے اور ان کی باتوں کو بڑی عقیدت کے ساتھ سننے سے زیادہ کچھ اور کرنے پر آمادہ ہوں!

یہ عوام جس تیزی کے ساتھ امام کے گرد اکٹھے ہوئے تھے، جب حالات مشکل اور دشوار ہوئے تو یہ اتنی ہی تیزی کے ساتھ ان کے گرد سے چھٹ گئے۔ ایسے گئے کہ یہ مجلسیں پھر نہ جم سکیں۔ ان کو یہ اندازہ تک نہ تھا کہ حالات کبھی ایسے بھی ہو جائیں گے کہ حسن البنا کی ایمان افروز تقریریں سننا اتنا مہنگا اور اتنا خطرناک ہو سکتا ہے...... نہ ہی وہ ابھی اس بات کیلئے تیار ہو پائے تھے کہ وہ ان خطرناک حالات کے ساتھ پورا اتر لیں۔ ان کو اگر پہلے سے معلوم ہوتا یا کم از کم اندازہ ہی ہوتا کہ معاملہ یوں خطرناک موڑ

بھی مڑ سکتا ہے تو وہ یا ان میں سے بہت سے شروع میں ہی امام کے ساتھ ہو لینے پر تیار نہ ہوتے!

اب امام شہید کے گرد ان نوجوانوں کے سوا جن کو انہوں نے اپنی خاص نگرانی میں تربیت دی تھی اور جن میں عمل کی جوت جگائی تھی، ان نوجوانوں کے سوا کوئی باقی نہ رہا......

عوام کے یہ غول جو امام کے گرد بہت شروع میں اکٹھے ہونے لگے تھے اور جو کہ امام کا بیشتر وقت اور توجہ لے رہے تھے اور جن کی وجہ سے امام کا 'کام' بہت ہی زیادہ بڑھ گیا تھا اور جو کہ وقت آنے پر پھر ان کے ساتھ کھڑے نہ رہ سکے...... ایسے عوام کا اتنے شروع میں یوں اکٹھے ہو جانا اور تحریک کی ساری توجہ لے لینا کیا واقعتاً دعوت کو آگے بڑھانے کا سبب بنا یا پیچھے لے جانے اور راستے کا بوجھ بن جانے اور سفر کو مشکل کر دینے کا!؟

اس بات کا جائزہ ہم آگے چل کر دشمن کے ردعمل کے ضمن میں اپنی گفتگو کے دوران بھی لیں گے۔ مگر یہاں ہم ذرا دیر رک کر ایک اہم سوال پر غور کرنا چاہیں گے۔

آخر کس چیز نے تحریک کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے اس بالکل ابتدائی مرحلے میں ہی عوام کی جانب اس بڑی سطح پر متوجہ ہو جائے!؟ یہ ایک غلط فہمی تھی جو بنیادی طور پر حسنِ نیت پر قائم تھی۔ یہ عوام کے بارے میں ضرورت سے زیادہ حسن ظن تھا۔ سمجھ یہ لیا گیا تھا کہ عوام میں بس ایک عملی بگاڑ آیا رہا ہے اس سے زیادہ کوئی خرابی نہیں پس اگر ان کو پر تاثیر انداز میں پند و نصیحت کر لی جائے جگہ جگہ درس دیئے جائیں اور پروگرام کئے جائیں تو معاملہ درست ہو جائیگا اور عوام کے یہ غول کے غول اسلام کی راہ پر چل پڑیں گے اور دعوت کیلئے مخلص سپاہی بن کر کام دیں گے یا کم از کم بھی تحریک میں بھرتی ہونے کیلئے تیار خام مواد کا کام دیں گے اور دعوت اسلام پسند عوام کی اس کثرت کو ساتھ لے کر منزل مقصود کی جانب رواں دواں ہو جائیگی!

تحریک کی قیادت پر اس ابتدائی مرحلے میں یہ واضح نہ ہو پایا ___ جس طرح کہ پھر بعد میں خود بخود واضح ہو گیا ___ کہ یہ خلل جو اس بار امت میں نیچے کی سطح پر آیا صرف عملی بگاڑ تک محدود نہیں۔ یہ بگاڑ دراصل اسلام کے بنیادی مفہومات اور اسلام کے بنیادی تصورات تک کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے خاص طور پر یہ کہ اللہ کی شریعت کی تحکیم کا مسئلہ عوام کی سطح پر بالکل سمجھا نہیں گیا اور یہ کہ معاملہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ایک بڑی جدوجہد اسلام کے بنیادی حقائق کو ذہنوں میں اتارنے کیلئے کی جائے قبل اس

سے کہ عوام کو ساتھ لے کر چلا جائے۔ یہ ضرورت بعد میں واضح ہوئی بھی (۱) ......لیکن اس وقت جب تحریک کا عوام کی جانب رخ ہو جانے پر خاصا وقت اور محنت صرف ہو چکی تھی۔ اس سارے عرصے میں، عوام پر جو توجہ اور محنت کی گئی، وہ بس اس بنیاد پر تھی کہ لوگوں میں ایک ولولہ اور جوش و جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اگر موثر پروگراموں کے ذریعے یہ کام کر لیا جائے تو وہ دعوت کیلئے مخلص سپاہی بن کر ساتھ چلیں گے اور نہیں تو کم از کم دعوت میں سپاہی بن کر بھرتی ہونے کیلئے خام مواد کا کام تو ضرور ہی دیں گے......پھر جب عوام پر یہ شبانہ روز محنت کر لی گئی اور لوگ یوں دیوانہ وار اکٹھے ہو گئے، حسن البنا کی گونج پورے مصر میں سنائی دینے لگی اور اس عوامی مقبولیت کو سیاسی میدان میں آزمانے کی بھی تدبیر ہوئی......تو لازمی بات تھی کہ اس سے دشمنوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔ اب دشمن کی جانب سے ایسے ایسے ردعمل سامنے آئے کہ جن میں سے بعض کی توقع بھی نہ کی جا سکتی تھی۔

جب کسی ملک میں عوام اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہاں برسر اقتدار مقامی طاقتیں اس سے پریشان ہو جاتی ہیں۔ لیکن معاملہ اگر اسلامی تحریکوں کا ہو تو اس سے صرف وہاں کی مقامی طاقتیں ہی نہیں عالمی طاقتیں بھی بیک وقت کان کھڑے کرتی ہیں...... بلکہ ایسے واقعات سے عالمی طاقتوں کی پریشانی کہیں بڑھ کر ہوتی ہے۔ اس امر کا پورا ادراک کر لینے کیلئے تاریخ کے بعض صفحات پڑھ لینا ضروری ہے۔

پچھلی دو صدیوں میں یہ بات بہت کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ عالم اسلام کا معاملہ ہر میدان میں روز بروز نیچے جا رہا ہے......سلطنت عثمانیہ جس سے یورپ کئی صدیاں ہول کھاتا رہا تھا اب دو صدیوں سے ضعیفی کا شکار تھی اور روز بروز نحیف اور لاغر ہوتی جا رہی تھی۔ سلطنت عثمانیہ بڑی تیزی سے سمٹ رہی تھی

(۱) امام شہید نے سن ۱۹۴۸ء میں ''معرکۂ مصحف'' کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین جاری کیا تھا، جس میں بہت واضح کر کے بیان کیا تھا کہ امت کی موجودہ حالت حالتِ اسلام نہیں، اور یہ کہ یہ اسلامی ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ یہ سب شرائع و قوانین کو چھوڑ کر ایک شریعتِ اسلام کی ہی تحکیم نہیں کر لیتی۔ امام کی دعوت میں یہ اسلوب اس شدت اور قطعیت کے ساتھ اس سے پہلے کے مراحل میں واضح نہیں تھا۔ چنانچہ یہ ایک نیا مرحلہ اور نیا رخ تھا جو آپ کی دعوت اب جا کر اختیار کرنے لگی تھی، مگر یہ سلسلہ بھی جنگِ فلسطین کے شروع ہو جانے کے باعث رک گیا۔ پھر فروری ۱۹۴۹ء میں امام شہید قاتلانہ حملے کے نتیجے میں ختم کر دیئے گئے، جبکہ ابھی آپ کے پیروکار اس نئی جہت پر اپنی پوری گرفت اور رسوخ نہ کر پائے تھے۔

اور زار کا روس ایک کے بعد ایک کر کے اس کی سب املاک ہڑپ کیئے جا رہا تھا مگر اس کو اسے روک دینے کی ہمت نہ ہوتی تھی اور نہ ہی خلافت عثمانی کے پاس اس کو کوئی سبیل تھی کہ یہ اپنے مقبوضہ خطے روس سے واگزار کرا سکے۔ خطۂ بلقان کے ممالک یورپی ملکوں کی آشیر باد کے زیرِ اثر خلافت سے باغی ہو چکے تھے۔ عالم اسلام کے اندر کی غیر مسلم اقلیتیں الگ سے علمِ بغاوت بلند کیئے پھر رہی تھیں۔ دولت عثمانیہ کا ہاتھ حالات کی چکی میں آ چکا تھا اور یہ اپنی مرضی سے حرکت کرنے کی بھی طاقت نہ رکھتی تھی۔ رہی مسلم امت تو اس کا حال بھی سلطنت عثمانیہ سے کم برا نہ تھا۔ یہ مدت سے پسماندگی کا شکار تھی۔ ہر طرف جہالت و ناخواندگی اور غربت و افلاس کا دور دورہ تھا۔ جمود کی حالت طاری تھی۔ بند ذہنیت پوری امت کی نفسیات میں بول رہی تھی۔ ماؤف ذہنیت حالات فہمی کی متحمل نہ رہی تھی...... معاملہ عین اس حالت کو پہنچ چکا تھا۔ جب یورپ نے دیکھا کہ موقعہ بڑی دیر اور انتظار کے بعد ہاتھ آیا ہے کہ اس ازلی دشمن کا کام اب تمام کر دیا جائے۔ یورپ کی طاقتوں نے مل کر پروگرام بنایا اور پورے عالم اسلام کو اپنے قبضے میں لے لینے کے منصوبے کے ساتھ یورپ آگے بڑھا۔ یوں عالم اسلام کو یورپ کی 'کالونیاں' بنانا ٹھہرا۔ صلیبی یورپ کے ساتھ اب کے ایک نیا عنصر بھی شامل تھا۔ یہ عالمی یہودیت تھی جو کہ اپنی ہی مار پر تھی اور یہ خود بھی اس موقعہ کیلئے بڑی دیر سے پر تول رہی تھی جو مسلمان ان سب کو آپ اپنے ہاتھ سے فراہم کر رہے تھے۔ صلیب اور صہیون دونوں مل کر ہماری جانب آگے بڑھے اور فلسطین میں ایک یہودی وطن کی بنیاد ڈالی۔

سلطان عبدالحمید کی جانب سے فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کا مطالبہ رد ہو جانے کے بعد عالمی یہودیت اور عالمی صلیبیت میں عثمانی سلطنت کو گرا دینے پر آخری حد تک یکسوئی پائی جانے لگی۔ اب دونوں کا منصوبہ ایک تھا اگرچہ ہر فریق اس منصوبے پر عملدرآمد سے اپنا مطلب نکالنا چاہ رہا تھا۔ اس منصوبے میں کہیں کوئی رخنہ باقی نہ تھا اور اس پر عملدرآمد میں صلیبیت اور صہیونیت کو کہیں کسی مشکل کا سامنا نہ تھا کیونکہ امت اپنے دین اور دنیا کا شعور کھو بیٹھی تھی اور وہ عزم و ہمت جس کی اللہ تعالیٰ نے اسے تاکید کی تھی کہیں روپوش ہو چکی تھی۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (آل عمران:۱۳۹) دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی بالاتر ہو اگر تم مومن ہو

عالم اسلام کو عسکری اور سیاسی میدان میں چاروں شانے چت کر لینے کے بعد اسلام سے جنگ آزمائی کیلئے جو خطرناک ترین اسلحہ استعمال کرنے کا فیصلہ ہوا وہ 'فکری یلغار' تھی۔ اس کا مقصد صلیبی اور

صہیونی اقتدار کے خلاف مسلمانوں کی قوت مزاحمت کو کچل دینا تھا اور اس کا طریقہ یہی ہو سکتا تھا کہ دلوں میں اس عقیدے کی کوئی جگہ باقی نہ رہنے دی جائے اور اس کی جگہ ایسی نسلیں تیار کی جائیں جو ذلت اور غلامی کو ذہنی طور پر قبول کر لینے پر راضی ہوں اگرچہ کوشش یہ کی جائے کہ 'رضامندی' سے بھی بڑھ کر یہ نسلیں ذلت میں 'لطف و مسرت' کا بے حد سامان پائیں اور اپنی نجات کا راز بھی اپنی فکر و تہذیب کی موت میں پائیں!

صلیبی صہیونی منصوبہ ساز سے یہ بات اوجھل نہ تھی کہ یہاں کی مسلمان قومیں اس غفلت سے کبھی بھی اور کسی بھی وقت بیدار ہو سکتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہو سکتا ہے یہ قومیں یورپ کی ذلت آمیز غلامی کو مسترد کر دیں اور 'آزادی' کا مطالبہ کرنے لگیں۔ منصوبہ سازوں نے اس بات کا پہلے سے حساب رکھا ہوا تھا۔ اس مقصد کیلئے اس نے شروع امر سے یہاں قومیت اور وطنیت کے بیج بو دیئے تھے اور ایسی قیادتیں تیار کرنا شروع کر دی تھیں جن سے عوام راہنمائی پائیں اور ان کے گرد اکٹھا ہوں۔ یہ سب کچھ استعمار کی زیر نگرانی ہوا تھا اور اس عمل کو ظاہری یا مخفی انداز میں اسی کی مدد حاصل رہی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر یہاں استعمار کے خلاف کبھی بغاوت ہو، جس کا کہ استعمار کو ہمیشہ ہی خدشہ رہا ہے، تو اس کا نقصان استعمار کے حق میں اور اس کا فائدہ یہاں کی قوموں کے حق میں کم سے کم رہے۔ مثلاً یہ قومیں زیادہ سے زیادہ اگر کسی چیز کا تصور کریں تو وہ عسکری آزادی ہو، بشرطیکہ وہ اپنے اندر اس بات کی قوت پائیں یا پھر عسکری اور سیاسی انداز کی آزادی کا سوچیں، جو کہ کم از کم ظاہری آزادی ضرور ہو۔ مگر یہ اس بات کی جانب ہرگز نہ آئیں کہ ایک فکری، تہذیبی، اور ذہنی آزادی کی سوچ سوچیں اور جسم کے ساتھ روح کو بھی اس استعمار کی قید سے آزاد کرانے پر عمل پیرا ہوں۔ کیونکہ استعمار ان اقوام کو کسی مجبوری کے تحت اگر سیاسی معنی میں آزادی دے بھی دیتا ہے تو بھی یہاں کے قومی اور وطنی نظاموں کی شکل میں اور ایک کے بعد ایک انقلاب آتے رہنے کی صورت میں، جس کیلئے عوام تالیاں بجانے اور داد و دہش دینے میں مسلسل مشغول رہیں گے...... یہاں کی اقوام عملاً مغرب ہی کی دست نگر رہیں گی۔

مختصر یہ کہ وہ اصل چیز جس سے یہ صلیبی صہیونی دشمن واقعی خوف کھاتا تھا اور جس کو ہر قیمت پر روک دینا چاہتا تھا وہ یہ کہ ان اقوام میں حقیقی اسلامی بیداری آ جائے۔ اس کے ساتھ مفاہمت کی اس کے پاس کوئی صورت نہیں اور اس کے ساتھ کوئی درمیانی راستہ نکال لیا جانا ناممکن ہے...... امت میں حقیقی اسلامی بیداری (صحوہ اسلامیۃ) کا آ جانا دشمنوں کیلئے ایک ڈراؤنا خواب رہا ہے اور وہ خوب جانتے

ہیں کہ یہ ان کے مفادات کیلئے کس قدر خطرناک ہوسکتی ہے۔

لَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءهُمْ (البقرة:۱۴۶) جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس کو ایسا پہچانتے ہیں جیسا اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں

اب جب امام شہید کے ہاتھوں اسلامی تحریک پروان چڑھنے لگی تو عالمی صلیبی صہیونی دشمن بڑے غور سے اور ایک خوف کی حالت میں امام کی اس تحریک کو جانچ رہا تھا اور پوری باریکی کے ساتھ اس کا جائزہ لے رہا تھا کیونکہ وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ اپنی خطرناکی میں کس سطح کو پہنچ چکی ہے۔ مشہور برطانوی مستشرق جِب کی صرف ایک بات سے ہی آپ اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ مستشرقین صلیبی صہیونی جاسوسی کا علمی اور ثقافتی شعبہ ہیں۔ جِب نے ''اسلام میں جدید رجحانات'' (Modern Trends in Islam) کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی جس کی پہلی طباعت ۱۹۳۶ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں وہ جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے ظاہری طور پر اس کو بے حد سراہتا ہے مگر کتاب کے ایک حاشیے میں ایک جگہ اس پر یوں تعلیق لگاتا ہے۔

''اس (جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی تحریک کے بعد) ابھی حال ہی میں ایک نئی جماعت منظر پر آئی ہے جس کا نام الاخوان المسلمون بتایا جاتا ہے۔ اس کا رہنما حسن البنا نام کا ایک شخص ہے۔ اس جماعت کے بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہوگا۔ اگرچہ ظاہر یہی ہوتا ہے کہ اس کا خطرہ ایک خاص نوعیت کا ہے''۔

اس اتنی تعلیق سے ہی واضح ہے کہ تیس کے عشرے کی ابھی ابتدا تھی تو مغرب اس خطرے کو کس انداز سے دیکھ رہا تھا اور یہ کہ اس پانی کی گہرائی وہ بڑی دقت کے ساتھ ماپنا چاہتا تھا۔ چنانچہ مغرب میں اس نوخیز جماعت کے بننے کے ساتھ ہی خطرے کی گھنٹیاں بجادی گئی تھیں!

لازمی بات ہے اس نئی دعوت کے گرد جوں جوں لوگ اکٹھے ہونے لگے توں توں مغرب کی نظر میں یہ خطرہ بڑا ہونے لگا تھا۔ یہ جماعت جو اسلام کو لے کر پوری زندگی میں ساتھ چلنا چاہتی تھی اور اسلام کی خاطر جگہ جگہ اب لوگ اس کے گرد جمع ہو رہے تھے...... مغرب اس تحریک سے تاحال ایک سیاسی اور سماجی خطرہ ہی محسوس کر پایا تھا۔ اتنے تھوڑے عرصے میں وہ اس بات کا پورا اندازہ تو ابھی کر ہی نہ پایا تھا کہ اس جماعت کے اندر میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ عالمی دشمن کو پورے طور پر معلوم نہ تھا کہ اس جماعت کے اندر

مجاہد سپاہ تیار ہو رہی ہے جو اسلام کی خاطر موت پانا زندگی کی سب سے بڑی آرزو سمجھتی ہے!

یہ بم ۱۹۴۸ء میں پھٹا۔ بلکہ عین اس وقت اور اس موقع پر پھٹا جس سے زیادہ خطرناک وقت اور موقعہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ واقعہ فلسطین میں ہوا اور اس وقت ہوا جب فلسطین میں یہودی وطن قائم کیا گیا......

اس بم نے سب کے اوسان خطا کر دیئے۔اس کے پھٹنے کی آواز تحریک کے قائدین کی توقع سے بھی بڑھ کر رہی!

یہ بات کہ اس تحریک کے رہنماؤں کو اس بات کا اندازہ تھا کہ صلیبیت وصہیونیت اسلام کی دشمن ہیں اور یہ کہ صلیبی صہیونی دشمن کو اس تحریک سے بہت کچھ اندیشہ ہے اور یہ کہ یہ دشمن اس تحریک کو ختم کر دینا چاہتا ہے اور اسے لوگوں کا اس تحریک سے لگاؤ رکھنا ایک آنکھ نہیں بھاتا تو یہ بات تو ظاہر ہے کسی بیان کی محتاج نہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو ایک عام مسلمان کو بھی آپ سے آپ معلوم ہوتی ہیں۔ایک مسلمان کو اس ضمن میں قرآن کی یہ آیات پڑھ لینا ہی کافی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَلَن تَرْضَى عَنكَ الْيَهُودُ وَلاَ النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرۃ:۱۲۰) | یہ یہودی اور عیسائی ہرگز تم سے راضی نہ ہوں گے جب تک کہ تم ان کی ملت کی پیروی نہ کرنے لگو |
| إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُواْ بِهَا (آل عمران:۱۲۰) | تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے، اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں |
| لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُواْ الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُواْ (المائدۃ:۸۲) | تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے |
| وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّاراً حَسَداً مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (البقرۃ:۱۰۹) | اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف لے جائیں۔اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے، مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے |

ایک مسلمان کو قرآن میں یہ آیات پڑھ لینا ہی کفایت کرتا ہے تا کہ اسے معلوم ہو کہ یہ دشمنی قائم ہے اور قائم رہے گی......البتہ یہ بات کہ یہ دشمنی اس وقت کس حد کو پہنچی ہوئی ہے اور اس مکروہ سازش کی نوعیت اس وقت کیا ہے اور اس منصوبے کی عملی تفصیلات فی الوقت کیا ہیں تو اس بات سے آگاہ ہونا

ایک اور بات ہے......اور جو بات حالات کی ترتیب سے سامنے آئی، اس سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ تحریک کی قیادت کو اس بات کا اندازہ جس حد تک اور جس دقیق انداز سے ہونا چاہیئے تھا وہ نہیں تھا......

یہودی منصوبہ سازوں نے عالم اسلام کے اس اہم ترین گوشے میں اپنا یہودی وطن بسانے کیلئے جو کچھ منصوبہ بندی کی تھی اس میں ہر اس چیز کا خیال رکھا گیا تھا جو کسی انسان کے ذہن میں آ سکتی تھی۔ چنانچہ جب سے سلطان عبدالحمید نے فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کے بدلے میں یہودیوں کی بھاری پیش کشیں ٹھکرا دی تھیں، جن میں کہ سلطان عبدالحمید کو ذاتی طور پر ایک بھاری رشوت کی پیشکش جو کہ سونے کے پانچ ملین پاؤنڈ اسٹرلنگ (جو کہ اس وقت کے حساب سے بہت بڑی دولت سمجھی جا سکتی ہے) تک پہنچتی تھی، اور اس بات کی یقین دہانی کہ روس، برطانیہ اور فرانس کو آمادہ کیا جائے گا کہ وہ عثمانی قلمرو کے اندر اقلیتوں کو بغاوت پر اتر آنے سے باز رکھیں (جو کہ دولت عثمانیہ کا بہت بڑا سیاسی دردسر تھا) اور یہ یقین دہانی کہ عثمانی سلطنت کی قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی معیشت کو سہارا دینے کیلئے لمبی مدت کے بھاری قرضے دیئے جائیں گے (جو کہ دولت عثمانیہ کا بہت بڑا معاشی دردسر تھا)...... جب سے سلطان عبدالحمید نے یہودیوں کی ان بھاری دل لبھانے والی مگر زہرناک پیش کشوں کو ٹھکرا دیا تھا اسی وقت سے یہودیوں نے اپنے وطن کے قیام کیلئے ایک بہت لمبی مدت کی منصوبہ بندی کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ کافی تیاری کر لینے کے بعد اس منصوبہ پر عمل درآمد کیلئے جو میعاد مقرر کی گئی وہ پچاس سال تھی، جیسا کہ ہرٹزل نے ۱۸۹۷ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر بال میں منعقدہ کانفرنس میں اعلان کیا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے عبدالحمید کو معزول کر دیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کی بنیاد رکھ دی گئی تا کہ سارے کا سارا صلیبی یورپ عثمانی سلطنت پر ٹوٹ پڑے اور اس 'مرد بیمار' کا کام تمام کر کے اس کا ترکہ اپنے درمیان تقسیم کر لے۔ یہ ترکہ زیادہ تر برطانیہ اور فرانس کے حصے میں آیا۔ (یہ ترکہ اب تک جوں کا توں انہی کے پاس ہے سوائے اس ایک فرق کے کہ مرکز ثقل برطانیہ جو کہ اُس وقت کی 'آزاد دنیا' کا چودھری تھا، سے منتقل ہو کر امریکہ کے پاس چلا گیا جو کہ اِس وقت کی 'آزاد دنیا' کا رکھوالا ہے) برطانوی انتداب کے تحت آئندہ کیلئے اکھاڑا فلسطین کو بنایا گیا تا کہ بلفور ڈیکلریشن کے سائے میں یہودی وطن کی بنیاد رکھی جائے۔ اسی لئے اس ڈیکلریشن میں کہا گیا تھا کہ "ملکہ معظّمہ فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن کے قیام کو ہمدردانہ نگاہ سے دیکھتی ہیں"!

یہ منصوبہ فلسطین یہود کو دے دینے پر ختم نہیں ہو جاتا تھا۔ بلکہ فلسطین کے گرد جو ممالک تھے ان کو بھی چھوٹے چھوٹے راجواڑوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اس بات کو بھی یقینی بنایا گیا کہ ان راجواڑوں میں اکھاڑ پچھاڑ اور کھینچا تانی معمول کا واقعہ بنا رہے اور ان سب ممالک کا کوئی وزن نہ تو جنگ کی دنیا میں رہے اور نہ سیاست کی دنیا میں اور نہ معیشت کی دنیا میں۔ پھر ان میں جگہ جگہ سرحدوں پر جھگڑے ہوں اور ان کے اندر قومی اور وطنی تحریکیں ہر ملک میں لوگوں کو نہ صرف ملکی مسائل میں مشغول رکھیں بلکہ مسلمانوں کی وحدت کو پھاڑ کر بھی رکھیں۔

پھر یہ مکر وفریب یہاں بھی نہیں رکا۔ کسی بھی امت کے نوجوان اپنے دشمن کیلئے ایک مسلسل خطرہ ہوتے ہیں۔ خصوصاً جب وہ کسی بڑے کام پر سنجیدگی سے جت جائیں۔ لہٰذا کسی قوم کے نوجوانوں کو کسی بھی کام پر پوری سنجیدگی کے ساتھ لگ جانے سے ہر قیمت پر روک دینا اور اس مقصد کیلئے سب وسائل کو بروئے کار لانا، خصوصاً ایسے کاموں میں ان کو دل مار کر لگ جانے سے روک رکھنا جن سے دشمن کے منصوبوں کو خطرہ ہو...... بہت ضروری سمجھا گیا۔ امت کے نوجوانوں کو پامردی سے محروم اور بے راہ رو کر دینے کیلئے سب وسائل آزمائے گئے تاکہ یہ نوجوان بیچ کام کے سوا کسی چیز کا سوچیں تک نہیں اور کسی بلند کام کا تو خیال تک ذہن میں نہ لائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: **ان اللہ یحب معالي الأمور ویکرہ سفاسفھا (رواہ الطبرانی فی المعجم الکبیر)** کہ "اللہ تعالیٰ کو بلند اور عظیم کام پسند ہیں اور بیچ کام سخت ناپسند"۔

چنانچہ امت کے نوجوانوں کو سینما فراہم کیا گیا۔ ریڈیو کے ذریعے 'تفریح' فراہم کی گئی اور تھیٹر کی راہ دکھائی گئی (یہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی ٹیلی ویژن نہیں آیا تھا، وی سی آر اس کے بھی بعد کی بات ہے۔ نہ ہی یہود ابھی ہمارے نوجوانوں کو فٹ بال اور کرکٹ کے عالمی بخار میں مبتلا کر سکے تھے)۔ ہمارے پڑھے لکھے مگر دین سے لاعلم نوجوانوں کو 'آزادی نسواں' پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ 'آزاد خیالی' کی طرح ڈال کر لڑکے لڑکیوں کو ایک دوسرے کو 'سمجھنے' کی ترغیب دی گئی۔ یوں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے مابین 'معصوم تعلقات' کو شد ومد کے ساتھ متعارف کرایا گیا کہ جانتے تھے یہ 'معصوم تعلقات' خود بخود 'غیر معصوم' ہو جاتے ہیں۔ نوجوانوں کو بہت کچی عمر میں سیاسی تعصّبات کی بھینٹ چڑھایا جانے لگا جو کہ ان کا قیمتی وقت بھی اور ان کی صلاحیتیں بھی برباد کر دیں اور ان کو کسی مثبت کام کی جانب توجہ تک نہ کرنے دیں اور اپنی

زندگی کا قیمتی ترین دور لایعنی مصروفیت میں گزار دیں۔ ہمارے زیادہ پڑھے لکھے نوجوان اس قسم کے موضوعات پر بہت طویل بحثیں اور مناظرے کر سکتے تھے کہ مغربی آرٹ یا موسیقی یا ادب میں کس سکول آف تھاٹ کو کس سکول آف تھاٹ پر کونسی اور کس قسم کی برتری حاصل ہے اور ہمارے عام نوجوان مقامی موسیقاروں پر ہی یہ شوق پورا کر لیتے تھے اور وہ یہاں کی مقامی گلوکاراؤں کی ایک دوسری پر فضیلت کے موضوع پر سیر حاصل بحث کر سکتے تھے! غرض اس طرح کی لایعنی مشغولیات کی کوئی حد نہ رہی تھی۔

عین پورے وقت پر، ہرٹزل کی دی ہوئی پچاس سال کی یہ میعاد جب پوری ہونے کو آئی (۱۸۹۷ء میں اس نے پچاس سال کے اندر یہودی وطن کے قیام کا اعلان کیا تھا) یہودی وطن کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ عرب ملکوں کی فوجوں نے ڈرامے کی کارروائی پوری کرنے کیلئے جنگیں لڑیں۔ بہت ہی خوبصورت طریقے سے شکست 'حاصل' کی گئی۔ خوب خوب غداریاں اور خیانتیں ہوئیں۔ اسلحے کے ڈھیر ردی نکل آئے۔ فوجی پلٹنیں کچھ دیر تک 'دائیں بائیں' کرتی رہیں اور بالآخر اس لائن پر جا کر رک گئیں جو متارکۂ جنگ اور پھر تقسیمِ اراضی کیلئے طرفین میں پہلے سے طے کی جا چکی تھی!

یہاں اس موقعہ پر، جو کہ دشمن کے منصوبوں کے حساب سے نازک ترین موقعہ تھا، یہ بم پھٹا اور اس کے کانوں کے پردے پھاڑ دینے والے شور نے ہر طرف ہلچل مچا دی......

الاخوان المسلمون کے فدائی فلسطین کے معرکے میں جا اترے تھے! یہاں یہود کو پہلی بار الاخوان سے متعارف ہونے کا موقعہ ملا اور وہ تجسس جو ان کو پچھلے کچھ عرصے سے الاخوان المسلمون کی تحریک کے بارے میں تھا وہ عین اس نازک موقعہ پر دور ہوا۔ یہود کو معلوم ہوا، اور ان کے ساتھ عالمی صلیبیت کو بھی، کہ الاخوان المسلمون کیا ہیں!

یہ بہت ہی زوردار بم تھا اور اس سے اٹھنے والا شور پوری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال چکا تھا! یہ واقعہ اس سے بہت زیادہ سنگین تھا جتنا کہ اخوان کی قیادت کبھی اندازہ کر سکتی تھی......

یہودی جو عرب فوجوں کو شکست پر شکست دیتے جا رہے تھے جونہی اخوان کے فدائیوں سے بھڑے تو یہ محسوس کئے بغیر نہ رہے کہ یہ کسی اور معدن کے بنے ہوئے لوگ ہیں اور ان فوجوں سے بہت مختلف ہیں جو اس ڈرامہ نما جنگ میں اپنا کردار ادا کرنے آئی تھیں...... یہ ایک عقیدے کیلئے جینے اور عقیدے کیلئے مرنے والے لوگ تھے اور اب وہ اپنے اس عقیدے کیلئے مرنے کی خاطر میدان میں اتر

آ ئے تھے۔الاخوان کے یہ فدائی جان ہتھیلی پہ لئے معرکہ فلسطین میں موت کا تعاقب کر رہے تھے۔ یہود کو اور انکے پیچھے صلیبیوں کو مسلمانوں کا عین وہی نمونہ نظر آ گیا جس سے تاریخ کے ایک طویل عرصے تک ان کو پالا پڑا رہا تھا۔

اس نئے واقعے نے ان کو شدید پریشان اور ہراساں کر دیا تھا۔اس بات کا تصور بھی ان کے بس سے باہر تھا کہ ایسے انسانوں سے ایک بار پھر ان کو پالا پڑ سکتا ہے جو تاریخ اسلام کی شروعات میں دیکھے گئے تھے......اور پھر وہ بھی مصر سے جہاں استعمار کی فکری یلغار نے اپنا کام بہت پہلے سے اور فرانسیسی حملے کے وقت سے شروع کر دیا تھا تا کہ مصر کو سب سے پہلے اسلام بھلا دیں...... بلکہ اسلام ہی نہیں عرب قومیت بھی بھلا دیں اور عرب قومیت کی جگہ ان میں مصری قومیت کا شعور بیدار کریں اور یہی وجہ ہے کہ وہاں عرصہ دراز تک ''مصر مصریوں کا ہے'' کا نغمہ الاپا جا تا رہا تھا۔اور اس نعرے سے مراد یہی تھی کہ مصر اسلام ہی نہیں عرب قومیت سے بھی بیگانہ ہو جائے......مگر اب ان کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی تھی۔اسی مصر سے اسلام کیلئے مرنے والے **اللّٰہ اکبر وللّٰہ الحمد** کا ورد کرتے ہوئے دیوانہ وار موت کے پیچھے بھاگ رہے تھے جن کے ساتھ جنگ میں ڈٹے رہنا یہود کیلئے ممکن نہ تھا اور وہ اپنے مورچے اور اپنا اسلحہ اور سب ساز وسامان چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر رہے تھے۔

اب ان پر یہ واضح ہوا کہ پڑوس میں یہ نوخیز اسلامی تحریک جب تک جیتی جاگتی ہے تب تک مستقبل میں اسرائیل کی توسیع کا خواب تو رہا ایک طرف خطے میں اسرائیل کا امن وبقا بھی ممکن نہیں۔اور یہ کہ اسرائیل کو اگر زندہ رہنا ہے اور امن واستقرار حاصل کرنا اور خطے میں توسیع کرنی ہے تو پھر اس تحریک اسلامی کا کام تمام ہونا چاہیئے۔ بہت تھوڑے عرصے میں جماعۃ الاخوان المسلمین کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔اس کے رہنما کو قاتلانہ حملے میں ختم کر دیا گیا اور پھر ناقابل بیان واقعات کا ایک تانتا بندھ گیا۔

تحریک پر قبل از وقت ہاتھ ڈال دیا گیا اور وہ بھی بہت ہی بے رحم انداز کے ساتھ......اس سے بھی کہیں بے رحم انداز کے ساتھ جس کی کہ توقع کی جا سکتی تھی۔

درست کہ تحریک کا کوئی راہنما خود بھی یہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ تحریک ہر اذیت سے محفوظ رہے گی کیونکہ خدائی سنت ہمیشہ یہی رہی ہے اور اس سنت کے ہوتے ہوئے ایسی امید رکھنا محال ہے۔لیکن یہ توقع کوئی بھی نہ کر سکتا تھا کہ اخوان پر ظلم وتعدی اس وحشت ناک حد کو پہنچے گی۔تحریک کے ہر دلعزیز راہنما کو

بھرے بازار میں دن دہاڑے گولی ماردی جاتی ہے۔ ہسپتال حکومتی احکامات پر طبی امداد دینے سے انکار کر دیتے ہیں تاکہ خون کا آخری قطرہ تک جسم سے نچڑ جائے۔ ہزاروں نوجوان دھر لئے جاتے ہیں۔ ان کو جیلوں میں ٹھونس دیا جاتا ہے اور اس بے دردی سے اذیتیں دی جاتی ہیں جن سے درندے پناہ مانگیں...... یہ بات البتہ ضرور ایسی تھی جو کسی کے سان گمان میں نہیں تھی اور کوئی بھی اس کا پیشگی تصور نہیں کر سکا تھا۔

ان وحشی درندوں کی بربریت کا ظاہر ہے کوئی بھی وجہ جواز نہیں تھا، خواہ وہ کتنا ہی اپنے جرائم کو مختلف پردوں میں چھپائیں اور ان کو حفظ امن عامہ کا نام دیں یا بدامنی کو روکنے کا۔ اس پر نہ دنیا میں کوئی پردہ پڑ سکتا ہے اور نہ قیامت کے روز جب:

| | |
|---|---|
| يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ (النور:۲۵) | اس دن اللہ وہ بدلہ انہیں بھرپور دے گا جس کے وہ مستحق ہیں اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے سچ کو سچ کر دکھانے والا |

مگر ہم یہاں سوال یہ کرنا چاہتے ہیں کہ تحریکی مراحل طے کرنے میں تحریک نے اپنی طرف سے کیا درست حکمت عملی اختیار کی تھی یا کہیں جلد بازی ہوئی اور کچھ کام قبل از وقت کر لئے گئے؟

یہاں کوئی بھی یہ خیال ذہن میں نہ لائے کہ اس تحریک نے اگر کوئی اور حکمت عملی اپنائی ہوتی تو اس کو جنگ کئے بغیر چھوڑ دیا جاتا...... پیچھے ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے جب یہ تقاضا کیا تھا کہ وہ آپؑ کے ساتھ جنگ وجدل سے ہاتھ کھینچ کر ذرا صبر سے کام لے لیں تا آنکہ خدا کی جانب سے جو ہونا ہے وہ ہو رہے تو قوم کے سرداروں کی طرف سے کیا جواب آیا تھا:

| | |
|---|---|
| وَإِن كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنكُمْ آمَنُواْ بِالَّذِيَ أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يْؤْمِنُواْ فَاصْبِرُواْ حَتَّى يَحْكُمَ اللّهُ بَيْنَنَا وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ قَالَ الْمَلأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُواْ مِن قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُواْ مَعَكَ مِن قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِينَ (الاعراف:۸۷-۸۸) | اگر تم میں سے ایک گروہ اس دعوت پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں، ایمان لے آیا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لایا، تو صبر کے ساتھ دیکھتے رہو، یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے، اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے<br>اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، اس سے کہا: "اے شعیب، ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی اس بستی سے نکال کر رہیں گے، یا پھر تم لوگوں کو ہماری ہی ملت میں واپس آنا ہوگا"۔ شعیب نے جواب دیا: "کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں؟ |

ناممکن! ہو نہیں سکتا کہ جاہلیت کبھی لا الہ الا اللّٰہ کی دعوت کو دیکھنا برداشت کرلے۔ یا اس سے جنگ بندی پر آمادہ ہو یا اس کے معاملے میں صبر سے کام لے۔

ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ تحریک اگر صحیح منہج پر ہی ثابت قدم رہتی تو ہر اس اذیت سے محفوظ رہتی جو ظلم وتشدد اور قتل وغارت کی ہر اس آخری حد کو پہنچ سکتی تھی۔ اس اذیت سے تو اسلام کی وہ پہلی جماعت محفوظ نہ رہی تھی جسے رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے زیرنگاہ تربیت دے کر تیار کیا تھا اور جو کہ اپنی دعوت کے ہر مرحلے میں اس صحیح ترین منہج پر چلتی رہی تھی جس پر چلنا کسی انسانی تحریک کے بس میں ہو سکتا ہے۔ یہ وہ جماعت تھی جسے ہر ہر قدم پر وحیِ ربانی خود لے کر چلتی اور راہ دکھاتی رہی تھی۔ ایسی بہترین جماعت بھی ظلم وتشدد، قتل وغارت، جلاوطنی اور بھوک سے مار دیئے جانے کی ظالمانہ کارروائیوں سے محفوظ نہ رہی تھی......

چنانچہ صحیح منہج پر چلنا اور صحیح حکمت عملی اپنانا دراصل اس لئے مقصود نہیں ہوتا کہ دعوت کو لے کر چلنے والے اشخاص کا بچاؤ کیا جائے...... ہاں البتہ یہ خود دعوت کے بچاؤ کیلئے ضرور مطلوب ہوتا ہے۔ اس بات کا انتظام بہرحال ضروری ہوتا ہے کہ دعوت سے پورے ثمرات لئے جائیں اور دعوت اپنا مشن پورے طریقے پر ادا کر پائے۔

اخوان کی تحریک پر بڑی بے دردی سے اور وقت سے پہلے ہاتھ ڈال لیا گیا، جبکہ یہ دعوت کسی مضبوط بنیاد پر ابھی معاشرے پر اثر انداز ہونے والی بنیادی جمعیت کی تیاری کا کام مکمل نہ کر سکی تھی۔ یقیناً اس نے ایسے مخلص فدائی تیار کر لئے تھے جو اللہ کی راہ میں موت پانے کیلئے ہر دم مستعد اور دعوت الی اللہ کی خاطر جواں مردی کے ساتھ ہر اذیت سہ لینے پر تیار تھے...... یقیناً اس نے ایسے افراد پیدا کر لئے تھے جن میں اخوت اور محبت صرف خدا کی خاطر تھی اور جو کہ خونی رشتوں کی محبت پر بھاری تھی...... یقیناً اس نے ایسے پاک صاف لوگ تیار کر لئے تھے جو معاملے کے کھرے اور ہر بات میں اللہ سے ڈرنے والے تھے...... یقیناً اس نے ایسے افراد بنائے تھے جو دین کیلئے اپنا سب کچھ لٹا دینے پر تیار تھے اور دین کی راہ میں قوت برداشت کا مظاہرہ کرنا جانتے تھے...... یہ سب صفات یقیناً ایسی ہیں جو اس بنیادی جتھے میں پائی جانا ضروری ہوں جسے معاشرے کی کایا پلٹنی ہو...... مگر یہی سب کچھ نہیں۔ ایک بنیادی جمعیت کیلئے یہ صفات بہرحال کافی نہیں۔ معاشرے پر اثر انداز ہونے والے افراد صرف پاک طینت، پاکباز اور دین کیلئے اپنا آپ لٹا دینے والے افراد نہیں ہوتے۔ اس کام کو اس سے کچھ زیادہ اوصاف بھی مطلوب ہوا کرتے ہیں۔

ان افراد کو مجسم دعوت ہونا ہے۔ جہالت کی تاریکی میں ڈوبی اور غلامی کی ذلت میں گرفتار اس پوری امت کیلئے یہی نجات دہندہ ہیں......خدا سے دوری کے سب فاصلے جو اس امت کی زندگی میں آ گئے تھے ان سب کو انہی لوگوں نے سمیٹنا تھا۔ یہ کام اخلاص اور فدائیت کے علاوہ اور بہت کچھ کا متقاضی ہے۔

وہ تربیت جو اس ابتدائی مرحلے میں مطلوب ہے اس پر ہم آئندہ فصل میں گفتگو کریں گے۔ چاہے یہ تربیت کا وہ پہلو ہو جو اس بنیادی جمعیت کیلئے ضروری ہے جسے معاشرے کی قیادت کرنی ہے اور چاہے یہ تربیت کا وہ پہلو ہو جو عوام کے اس طبقے کو دی جانا ہے جو تحریک کے ساتھ مل کر چلنے والے ہوں......مگر یہاں ہم صرف ان اسباب کا جائزہ لیں گے جو تحریکی زندگی میں اس جلد بازی کا سبب بنے اور پھر ان آثار پر گفتگو کریں گے جو اس جلد بازی کا نتیجہ بن کر سامنے آئے۔

اخوان کی تحریک نے، قبل اس سے کہ اس بنیادی جمعیت کی تیاری پختہ بنیادوں پر مکمل کر لے جو بعد میں معاشرے پر اثر انداز ہو سکے اور معاشرے کی قیادت کرے، ایک عوامی انداز اپنا لیا تھا اور اسی انداز میں رفتہ رفتہ آگے بڑھتی گئی۔ معاملہ یہ ہے کہ عوام کو، انکا دینی فہم وشعور پختہ کئے بغیر، ساتھ لے کر چلنا اور ان کے بل پر برسر اقتدار طبقوں سے جا الجھنا اور ایسے معرکے چھیڑ لینا جن میں طرفین کے مابین طاقت کی کوئی نسبت ہی نہیں، تحریک کے وارے کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے نتائج پھر خود دعوت ہی کے حق میں اچھے ثابت نہیں ہوئے......

اس جلد بازی کے نتیجے میں لا الہ الا اللہ کی حقیقت جو معاشرے میں بڑے عرصے سے دھندلاہٹ کا شکار تھی، اگر کچھ اور نہیں بڑھ گئی تو برقرار ضرور رہی۔ کیونکہ عقیدے کے اس بنیادی موضوع (لا الہ الا اللہ) کے ساتھ کچھ دوسرے سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل آ ملے تھے اور لا الہ الا اللہ کے حوالے سے معاملہ ابھی لوگوں پر اور خود تحریک پر بھی پوری طرح واضح نہ ہو پایا تھا کہ مسئلہ خالصتاً اللہ کی بندگی کرنے کرانے کا ہے نہ کہ تحریک کا اصل سروکار ان مسائل سے ہے جو اس دعوت کے سیاسی، معاشی اور سماجی مضمرات ہو سکتے ہیں۔ اور نہ ہی یہ بات پورے طور پر تحریکی نوجوانوں کے شعور میں پختہ ہو سکی تھی کہ یہ سب کے سب سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل ایک خاص ترتیب سے اور ایک خاص وقت آنے پر ہی لا الہ الا اللہ کی دعوت کے ساتھ جڑتے ہیں بلکہ خود لا الہ الا اللہ کے اندر سے پھوٹتے ہیں اور یہ

کہ یہ سب مسائل ایک خاص ترتیب سے لا الہ الا اللّٰہ کی ذیل میں آنے چاہئیں نہ کہ لا الہ الا اللّٰہ کے ساتھ برابر میں ذکر ہونے چاہئیں اور یہ تو ہونا ہی نہیں چاہئے کہ یہ سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل لا الہ الا اللّٰہ سے ہٹ کر ذکر ہوں اور تحریک کا ایک مستقل موضوع بنیں اور یہ تو کسی صورت ہونا ہی نہیں چاہئے کہ یہ مسائل لا الہ الا اللّٰہ سے بھی پہلے ذکر ہونے لگیں۔

یہ بات بھی فراموش نہیں ہونی چاہئے کہ عوامی انداز اختیار کرنے اور عوام کو قبل از وقت ساتھ لے کر چلنے میں جو جلد بازی کا مظاہرہ ہوا، جبکہ ابھی عوام کے اندر اسلامی فکر وشعور پختہ نہیں ہو پایا تھا بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ عوام میں اسلام کا جامع فہم ابھی وجود بھی نہ پا سکا تھا مگر چلئے ہم یہی کہہ لیتے ہیں کہ عوام میں ابھی شعور کی پختگی نہیں آئی تھی۔ اسلامی تحریک کی اس مقبولیت نے ملک کی بڑی بڑی سیاسی جماعتوں اور بڑے بڑے سیاسی گرگوں کو الگ پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ یوں ان کو ایک بڑی سطح پر اپنے 'ووٹروں' کی فکر پڑ گئی جواب بڑی تیزی کے ساتھ ان کے ہاتھ سے جا رہے تھے اور اس نئی اسلامی تحریک سے جا مل رہے تھے۔ یہ سیاسی جماعتیں اور قیادتیں بھی اخوان کی تحریک کو اس کے اصل اصلاحی مشن سے ہٹا کر سیاسی مناظرہ بازی میں الجھانے لگی تھیں۔ اخوان کو لاجواب کرنے کیلئے یہ ان سے تقاضا کر رہی تھیں کہ وہ اپنا سیاسی منشور اور تفصیلی پروگرام سامنے لائیں اور یہ واضح کریں کہ وہ اقتدار پا کر ملک کی حالت کیونکر سنوار دیں گے۔ اس سے اخوان کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنے سیاسی منشور اور معاشی وسماجی پروگرام، جو اقتدار پانے کی صورت ہیں وہ ملک کے اندر لے کر آئیں گے، عوام کے سامنے اور ان پارٹیوں کے سامنے واضح کریں یوں اس سیاسی مناظرے اور جواب در جواب بحث میں اخوان کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ اپنے اصل مسئلے ___ یعنی لا الہ الا اللّٰہ کی دعوت ___ کو نہ چاہتے ہوئے بھی پس منظر میں چلا جانے دیں۔

یہ لا الہ الا اللّٰہ کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ویسے تو عموماً بھی مگر اس مرحلے میں تو خاص طور پر جب ذہن وشعور کی تشکیل ہو رہی ہو اور تحریک وجود پا رہی ہو...... اس لا الہ الا اللّٰہ کے مسئلہ کو ان نتائج سے بالکل کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے جو دنیوی زندگی میں اس سے مسلمانوں کو حاصل ہو سکتے ہیں، خواہ وہ اقتدار کا حصول ہو، خواہ سیاسی استقرار اور استحکام ہو، خواہ معاشی خوشحالی ہو اور خواہ سماجی امن وسکون ہو...... کیونکہ عین ممکن ہے دنیا کی زندگی میں ان سب باتوں میں سے کچھ بھی حاصل نہ ہو۔ عین ممکن ہے

**لا الــہ الا اللّٰہ** کہنے کا انجام دینوی زندگی میں کسی وقت فرعون کے ان جادوگروں کا سا ہو جو ایمان لے آئے تھے اور پھر ان کو اس کی پاداش میں موت اور سولی کو گلے لگانا پڑا۔ یا پھر دنیا میں ان کا انجام اصحاب الاخدود جیسا ہو، جو سب کے سب آگ کے گڑھوں میں پھینک کر زندہ جلا دیئے گئے تھے......مگر وہ اپنے بعد والوں کیلئے ایمان کی ایک خوبصورت اور زندہ مثال بن گئے اور ان کے نصیب میں وہ اعزاز آیا جو وہ اپنے لئے پسند کر چکے تھے، یعنی اللہ کو جی بھر کر راضی کر لینا اور اس کے ہاں جا کر خلد کے باغات میں جا بسنا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جہاں بہشت میں آبشاریں گرتی ہیں۔

عوام کو اکٹھا کرنے کی جلدی کرنا اور پھر ان عوام کو قافلے میں لے چلنے کی جلدی کر بیٹھنا، جبکہ ان کے شعور میں ابھی پختگی نہ لائی جا سکی ہو بلکہ ابھی تحریک خود اپنے نوجوانوں میں پختگی نہ لا سکی ہو، ایک ایسی غلطی تھی جس نے اسلام کے اس اساسی مسئلے (یعنی توحید) کے گرد پائی جانے والی دھندلاہٹ کو کچھ اور بھی بڑھایا۔ اب اسلامی دعوت کی بنیاد یہ ٹھہر گئی تھی کہ 'اسلام نافذ ہو جانے سے وہ سب سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل حل ہو جائیں گے جو آج اس وقت لوگوں کی زندگی اجیرن کر دینے کا باعث بنے ہوئے ہیں'۔ اس بنا پر خود بخود ضروری ٹھہرا کہ ایسے عملی اور تفصیلی پروگرام عوام کے سامنے لائے جائیں جن سے واضح ہو کہ اسلامی تحریک کو اقتدار مل جانے کے بعد فی الواقع ایسا ہو جائے گا تاکہ ان سیکولر جماعتوں کا منہ بند ہو سکے جو اسلامی جماعت کو بار بار اس بات کا چیلنج دیتی ہیں!

یہ بات کہ ہر بحران کا اسلام ہی اصل حل ہے، اپنی جگہ اٹل حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ذمہ اٹھایا ہے اور اس کا وعدہ کر رکھا ہے: **ولو أن اهل القرى آمنوا واتقوا لفتحنا عليهم بركات من السماء والأرض** (الاعراف:٩٦) ''اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے''۔ البتہ یہ بات کہ یہ حل جس کا اسلام وعدہ کرتا ہے، اسلام پسندوں کے برسر اقتدار آتے ہی ظہور پذیر ہو جائے گا، اس پر بہرحال کتاب اللہ سے کوئی دلیل ملتی ہے اور نہ تاریخ کے وقائع سے۔ خود اسلام کے دور اول میں جب مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہوا اور وہ ایک ایسی ریاست کا قیام عمل میں لانے میں کامیاب ہوئے جو اللہ کا قانون چلاتی تھی، مسلمان بہت برسوں تک تنگی اور ترشی کی شدید اور ناقابل بیان حالت میں گرفتار رہے تھے اور ایک لمبا عرصہ ان کو صبر کرنا پڑا تھا تا آنکہ حضرت عمرؓ کے دور میں جا کر کہیں خوش حالی کا دور آیا اور اس سارا

عرصہ لوگ بڑے صبر کے ساتھ یہ سب سختی برداشت کرتے رہے کیونکہ وہ ایمان کی حقیقت جان چکے تھے اور ایمان کو دلوں میں اتار چکے تھے۔ پھر کیونکہ وہ اپنا آپ دعوت اسلام کی نذر کر چکے تھے اور پھر یہ کہ ان کی کل امید اور ان کا اصل مطمع نظر صرف اور صرف آخرت تھی اور دنیا کی خوشحالی کو کبھی انہوں نے اپنا نصب العین بنایا ہی نہ تھا اور نہ وہ اپنی دنیا سنور جانے کے کبھی منتظر رہے تھے۔ یہی وہ اصل اہلیت تھی جس نے اس دعوت کو اس لائق بنایا کہ وہ زمین میں تمکین پائے، معاشروں میں اپنے پیر گاڑے اور پھر انسانی افق پر ہر سمت کو پھیلتی جائے۔

اگر کہیں رسول اللہ ﷺ نے ___ معاذ اللہ ___ عوام کو یہ لالچ دی ہوتی کہ آپؐ کے اقتدار پا لینے کی صورت میں ان کے سب دنیاوی مسئلے حل ہو جائیں گے اور خوش حالی کا دور دورہ ہو جائے گا تو لوگ کبھی بھی اس سختی اور تنگی کو برداشت نہ کر سکتے جو کہ اسلامی ریاست کے قیام میں آنے کے ساتھ ہی مسلمانوں پر حملہ آور ہوئی اور پھر برسوں تک ان کے صبر کا امتحان لیتی رہی تھی، اور نہ ہی وہ اس صبر و استقامت کا مظاہرہ کر سکتے جس کی بنیاد پر انہوں نے اللہ کے فضل سے تاریخ کا رخ موڑ کر رکھ دیا۔ اب جب ہم لوگوں کو ___ جبکہ ان کے دل ابھی لا الہ الا اللّٰہ کی حقیقت کیلئے دنیا و مافیہا سے بیگانہ نہیں ہوئے ___ یہ باور کراتے ہیں کہ مسلمانوں کے اقتدار پانے کی صورت میں ان کی سب مشکلیں دنوں کے اندر جاتی رہیں گی اور پھر دوسری طرف اسلام پسند اگر کبھی اقتدار پا لیتے ہیں تو وہ دیکھیں کہ برسوں گزر جانے کے بعد بھی ان کی یہ مشکلات حل نہیں ہوتیں بلکہ یہ مشکلات ___ صلیبی صہیونی دشمنی کے باعث ___ کئی گنا اور بھی بڑھ جاتی ہیں تو کیا یہ لوگ صبر کریں گے جو کہ ہمارے ساتھ شامل ہی خالصتاً اللہ کی اطاعت و بندگی کے دروازے سے گزر کر نہیں ہوئے بلکہ دنیا سنور جانے کے شوق میں یہ ہمارے ساتھ آ ملے تھے!؟ کیا یہ تنگی کے ان دنوں میں اور دنیا کا بہت کچھ ہاتھ سے چلا جانے پر اور اس کٹھن جہاد کی راہ پر صابر و ثابت قدم رہیں گے تا آنکہ اللہ کا وعدہ اپنے وقت پر جا کر پورا ہو جس کا کہ صرف اللہ کو علم ہے...... یا پھر یہ الٹا اسلامی حکومت پر ہی برس پڑیں گے جس نے اپنے وعدے پورے نہیں کئے اور جس بات کا کہہ کر وہ ان کے ووٹ لیتی رہی اور جس مقصد کی خاطر وہ اقتدار میں آئی اس کا ان کو دور دور تک کوئی نام ونشان تک نظر نہیں آتا!!؟

دعوت کا کام تو یہ ہے کہ وہ ہر چیز سے پہلے اور ہر چیز کو بھلا کر لوگوں پر بس یہی واضح کرے کہ بندوں پر خالق کا حق کیا ہے۔ بڑی دیر تک لوگوں کو صرف یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اللہ کی خالص بندگی کا حق کیسے ادا ہو سکتا ہے اور اللہ کے پاس سے جو ہدایت اور جو شریعت آئی ہے اس کی پابندی کس قدر ضروری ہے، بغیر اس بات کی پرواہ کئے کہ اللہ کیلئے بندگی اور عبادت کو خالص کر دینے کا دنیا کی زندگی میں کیا نتیجہ نکلتا ہے اور زمینی معیاروں کی رو سے اس سے کچھ 'حاصل' ہوتا ہے یا صرف گھاٹا پڑتا ہے۔ اللہ کی بندگی کا اصل بدلہ صرف آخرت ہے۔ ہاں یہ بھی ضرور ساتھ میں واضح کیا جائے کہ اللہ کا اس امت سے بطور خاص یہ وعدہ ہے کہ وہ اسے دنیا کی زندگی میں بھی تمکین سے نوازے گا اور ان کی خوف و بدامنی کی حالت کو چین اور بے فکری سے بدل دے گا مگر اس بات کیلئے اللہ کی شرط بہت واضح ہے: یہ کہ وہ اللہ کی بلا شرکت غیرے بندگی کریں اور اس کیلئے اپنی اطاعت و فرمانبرداری اور اپنی عبادت کو خالص کر دیں نہ کہ اس کا یہ وعدہ اس بات سے مشروط ہے کہ وہ اسلام پسندوں کے حق میں بیلٹ بکس بھر دیں اور ان کو پارلیمان میں اکثریت دلا کر اقتدار پر فائز کر آئیں۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئاً (النور:۵۵)

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، ان کے لئے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے۔ اور ان کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا۔ بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں

بلاشبہ دعوت جب اس بنیاد پر اٹھائی جائے گی تو وہ بہت ہی آہستگی کے ساتھ بڑھے گی۔ بہت تھوڑی مدت میں عوام کی بہت بڑی تعداد ساتھ نہیں چلے گی۔ مگر اس صورت میں تمکین فی الارض پانے کا درست عمل بھی شروع ہو چکا ہوگا۔ کیونکہ یہ ایک طرف خدائی منہج کا تقاضا ہے تو دوسری طرف اللہ کی سنت بھی ہمیشہ یہی رہی ہے اور یوں اللہ کا لکھا ہو کر رہتا ہے۔

وَاللّهُ غَالِبٌ عَلَى أَمْرِهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (یوسف:۲۱)

اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں

☆☆☆☆☆☆☆

دعوت کی حقیقت پر یہ جو دھندلاہٹ پڑی تھی اس میں کئی گنا اضافہ پھر عین اس وقت ہوا جب ایک طرف اس تحریک کے کچھ دھڑے حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے اور مسلح لڑائی کرنے پر اتر آئے اور دوسری طرف اسی تحریک کے کچھ دھڑے پارلیمان میں جا بیٹھے!

عالمی صلیبی صہیونی طاقتیں جس طرح اسلامی تحریک سے پریشان ہو چکی تھیں اور پھر ساتھ میں کچھ دوسرے عوامل بھی شامل ہو گئے تھے اس سے عالمی سیاست میں ایک خاص شدت پر مبنی تبدیلی آئی تھی، جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں مگر اس تبدیلی کا جو عالم اسلام سے متعلقہ پہلو ہے اس کی جانب یہاں ایک اچٹتا اشارہ کر دیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

برطانیہ اور فرانس جو کہ اپنے وقت کی دو بڑی طاقتیں تھیں دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹۔۱۹۴۵) سے اپنا بہت سا نقصان کرا کے فارغ ہوئی تھیں۔ جبکہ امریکہ اس جنگ سے بڑی عافیت کے ساتھ نکلا تھا اور یہ جنگ اس کا کوئی خاص قابل ذکر نقصان نہ کر پائی تھی۔ یہ دیکھ کر امریکہ کو یہ شوق چرایا کہ جس کو اُس وقت کی 'آزاد دنیا' کہا جاتا تھا وہ اس کا لیڈر بن جائے اور برطانیہ اور فرانس دونوں کو عالمی اثر و رسوخ اور دنیا بھر کی چودھراہٹ سے فارغ کر دے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ تیسری دنیا اور خصوصاً عالم اسلام میں برطانیہ اور فرانس کی بجائے اب امریکہ کی ایجنٹ حکومتیں بیٹھیں۔ ایسی حکومتوں کو ایک نئی ہیروانہ شان کے ساتھ مسند اقتدار پر بٹھانا ضروری تھا جن کو ان کے عوام اس نظر سے دیکھیں کہ یہ استعمار کو شکست فاش دے کر میدان جیتنے میں کامیاب ہوئی ہیں اور یہ کہ قوم کو غیر ملکی اقتدار سے نجات دلانا ان شیر بہادروں کا ہی کمال تھا۔ مگر یہ ڈرامہ، جس کا جنگ عظیم کے نتائج کے پس منظر میں حقیقت ہونا آپ سے آپ باور ہو جانا تھا، اپنی تہہ میں دراصل ایک اور گھناؤنا مقصد بھی رکھتا تھا...... اور اس مقصد کو پورا کرنے کی حد تک صلیبیت اور صہیونیت کے درمیان آپس میں پورا پورا تعاون ہو رہا تھا بلکہ مشترکہ منصوبہ بندی بھی...... اور وہ گھناؤنا مقصد یہ تھا کہ ان ڈرامائی تبدیلیوں اور ان ہیروانہ کارناموں کے پردے میں خطے کے اندر، خصوصاً عرب علاقے میں، اسلامی تحریکوں پر بھی ہاتھ صاف کر دیا جائے تا کہ اسرائیل امن و چین سے جی سکے اور عالم اسلام کے عین پڑوس میں اس چھوٹے سے یہودی ملک کو ترقی و استحکام کے وہ سب مواقع حاصل ہو سکیں بلکہ اس کی اس مزید توسیع کیلئے بھی راستہ صاف ہو سکے جس کا کہ اسرائیل کی پیدائش کے وقت خواب دیکھا گیا تھا۔ اسلامی تحریکوں کو راہ سے ہٹانے کیلئے یہ مکروہ عزائم پھر اور بھی شدت پکڑ گئے جب یہ دیکھا

گیا کہ یہ پہلی ضرب اسلام کی اس ایک بڑی تحریک کا کام تمام کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی جس میں کہ امام شہید کو قتل کر دیا گیا تھا اور نوجوانوں کو بڑی تعداد میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس ضرب نے تحریک کا کام تمام نہیں کیا بلکہ الٹا محسوس یہ ہوا گویا یہ اس تحریک کے مقبول ہونے کیلئے بنیاد بن گئی ہے اور اس کو ایک نیا ولولہ دے کر دور دور کے ملکوں تک پہنچا آنے میں کامیاب ہوئی ہے۔

اب ان اسلامی تحریکوں کو قابو کرنا اور پوری قوت سے کچل دینا ٹھہر گیا تھا۔ اس مقصد کیلئے لیڈروں کے انتخاب کا خاص خیال رکھا گیا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ یہ سب کے سب لیڈر فوجی حکمران تھے! ہر فوجی ضروری نہیں اس مہم کیلئے مناسب ہو، اس مقصد کیلئے تین بنیادی شرطیں کسی فوجی حکمران میں پائی جانا ضروری سمجھی گئیں۔ اس کے بعد پھر کچھ اضافی صلاحیتیں بھی ہوں تو کچھ حرج نہیں۔ اقتدار کا جنون، بے رحمی اور اسلام سے بغض۔ اس کے لئے آئیڈیل کے طور پر جس شخص کو لیا گیا یہ وہی تھا جو اس تجربے کی پہلی عملی مثال بنا تھا......کمال اتاترک!

یہ تین بنیادی صفات کسی شخص میں پائی جائیں تو اقتدار حاصل کرنے کے بعد طبعی طور پر وہ جو پہلا کام کرے گا وہ یہی کہ وہ اسلامی تحریکوں پر گرفت کرے اور وہ بھی اس شدت اور بے رحمی کے ساتھ جس کی کہ اس سے توقع ہے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود معاملے کو حالات اور اتفاقات پر نہیں چھوڑ دیا گیا تھا بلکہ بڑی تدبیر و منصوبے کے ساتھ اس بات کا انتظام کیا جاتا تھا کہ اسلامی تحریکیں بظاہر بڑے قدرتی انداز کے ساتھ نئی سے نئی آفت میں جا پڑیں۔[1] ان کی چیدہ چیدہ شخصیات قتل ہوں، ان کے نوجوان ہزاروں کی تعداد میں جیلوں میں سڑنے کیلئے ڈال دیئے جائیں اور ان کو ایسی ایسی وحشت ناک اذیتیں دی جائیں جن کو سن کر آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں...... یہاں سے اس بات کی 'حکمت' سمجھ آتی ہے کہ کیوں یہاں کے حکمران سویلین کی بجائے ہمیشہ فوج سے لئے گئے۔ فوجی دور میں وہ بہت کچھ بڑی آسانی سے کھپ جاتا ہے جو سویلین دور میں مشکل ہو۔ فوجی قوانین، فوجی احکامات، فوجی عدالتیں، آہنی ہاتھ، آہنی اقدامات ......حکومت سول لوگوں کی ہو تو عموماً یہ جرائم اتنی بے باکی سے نہیں کر سکتے۔ نہ ہی ایسا آہنی ہاتھ ڈال سکتے ہیں نہ تشدد کی اس آخری حد پہ اتر سکتے ہیں اور نہ اس قدر دہشت پھیلا سکتے ہیں۔

---

(۱) جس کی ایک مثال منشیہ میں (سن ۱۹۵۴-۱۹۵۵ء) ہونے والا ڈرامہ تھا جو عبدالناصر کے خلاف کرایا گیا تا کہ اسلامی تحریک کے خلاف خون کی ایک پوری ہولی کھیل لینے کا جواز حاصل کر لیا جائے۔

یوں ہر اس ملک میں جہاں فوجی اقتدار تھا مسلمانوں پر ایک کے بعد ایک آفت آتی رہی۔ یہ سب کچھ محض 'اتفاق' نہیں ہوسکتا تھا۔ اس خطے میں اذیت رسانی کے ایسے ایسے طریقے ایجاد کئے گئے جن کی تاریخ میں کہیں مثال نہیں ملتی سوائے سپین کی 'تفتیشی عدالتوں' کے جن کا مقصد بھی اسلام کا اندلس سے مکمل خاتمہ کردینا تھا...... اسلامی تحریک کو پے درپے ضربیں لگتی رہیں۔ ہر چند سال بلکہ بعض حالات میں ہر چند ماہ گزرنے پر اس تحریک کا کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی ملک میں خون کیا جارہا ہوتا تھا۔ اسلامی تحریکوں پر ڈھایا جانے والا ہر ظلم زیادہ سے زیادہ 'خبر' ہوتا تھا۔ جو بڑی بے چارگی سے دُنیا بھر میں گشت کرتی اور بہرے کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر فضا میں منتشر ہوجاتی۔ اس پر صلیب وصہیون خوشی سے رقص کرتے اور اس بات پر اطمینان محسوس کرتے کہ ان کے 'لاڈلے' عالم اسلام میں بڑی خوش اسلوبی سے یہ مہم پوری کررہے ہیں جو 'بڑوں' نے ان پر اعتماد کرتے ہوئے ان کو سونپ رکھی ہے۔

اس تکلیف دہ صورتحال سے اسلامی تحریک میں بیک وقت دو روشوں نے جنم لیا۔ جو کہ دو مختلف بلکہ متضاد سمتوں میں آگے بڑھنے لگی تھیں۔ ایک وہ روش تھی جو عموماً نوجوانوں میں مقبول ہوئی اور اس کے مقبول ہونے کا سبب یہاں کا وحشت ناک ظلم وبربریت تھا جس سے نوجوان اور بھی طیش میں آئے اور طاقت کا جواب طاقت سے اور تشدد کا جواب تشدد سے دینے کا فیصلہ کیا جس کے پیچھے یہ سوچ کارفرما تھی کہ ان کی یہ مسلح مزاحمت[1] آخر کار حکومتی بربریت کا خاتمہ کردے گی اور حکومتی کارندوں یا پھر ان کے بڑوں کو...... اس بات پر مجبور کردے گی کہ وہ اپنا یہ اسلوب تبدیل کرلیں۔ دوسری روش وہ تھی جو عموماً بزرگوں میں مقبول ہوئی جو کہ پے درپے ضربیں سہہ سہہ کر تھک ہار چکے تھے اور ممکنہ حد تک کسی عافیت کی

(۱) مصر کے اندر اسلامی قوتوں کی حکومت کے خلاف مسلح کارروائیاں اسی کی دہائی کے اواخر سے لے کر نوے کی دہائی تک کوئی عشرہ بھر جاری رہیں اور نوجوانوں کا کچھ بھاری نقصان کرالینے کے بعد مزید جاری نہ رہ سکیں۔ ان کارروائیوں کے ختم کرانے میں عالم اسلام کے کئی اہلِ علم طبقوں کا خصوصی کردار رہا اور مصر کے نوجوانوں نے خصوصاً شیخ عمر عبدالرحمٰن کی قائم کردہ الجماعۃ الاسلامیۃ کے نوجوانوں نے ان علما کی نصیحت قبول کرتے ہوئے حکومتی ڈھٹائی کے باوجود یکطرفہ طور پر ان مسلح کارروائیوں کے ختم کرنے کا اعلان کیا اور مصر کے اندر ایک علمی وفکری ودعوتی عمل ہی پر اپنی توجہ مرکوز کرادینے کا عزم کیا۔ ہمارے یہاں بھی کچھ اسلام سے مخلص عناصر اسی قسم کی کارروائیوں کو مسئلہ کا حل جانتے ہیں، اور گاہے بگاہے اسی بات کا عندیہ بھی دیتے ہیں، جو کہ ہمارے خیال میں اس مسئلہ کو کہیں زیادہ الجھا دینے کا باعث ہوسکتا ہے اس وقت پاکستان میں خاص طور پر اس قسم کی صورتِ حال پیدا ہوجانے کے امکانات بڑھ رہے ہیں۔ مترجم

راہ پر چلنا چاہتے تھے۔ان حضرات نے فیصلہ کیا کہ یہ جمہوری کھیل میں حصہ لیں تا کہ ان کے بارے میں یہ نہ کہا جائے کہ یہ تشدد کے حامی ہیں...... یہ دونوں روشیں اپنی اپنی جگہ اس بات کا سبب بنیں کہ لا الہ الا اللّٰہ کے مسئلے کے گرد جو دھندلاہٹ پہلے سے موجود تھی اب اس میں اور بھی اضافہ ہو جائے۔

اس بات سے قطع نظر کہ ان میں سے ہر فریق اپنے اپنے طریق کار کیلئے کیا کیا جواز پیش کرتا ہے، یہاں ہم ان نتائج سے بحث کریں گے جو کہ تحریکی عمل میں اس جلد پسندی سے پیدا ہوئے، جس کا آغاز بہت شروع سے ہو گیا تھا اور جس نے کہ پہلے سے موجود الجھنوں میں اور سے اور نئی الجھنوں کا اضافہ کیا اور تحریکی عمل کے درست سمت میں آگے بڑھنے کی راہ میں نئی سے نئی رکاوٹیں پیدا کیں۔جلد بازی کے یہ اقدامات اگرچہ بظاہر مثبت اور تحریک کیلئے مفید اور ہدف سے قریب کر دینے والے دکھائی دیتے تھے مگر دراصل یہ تحریک کی اپنی ہی راہ کو دشوار گزار بنا رہے تھے۔

اگر ہم اس اعتبار کو درست سمجھتے ہیں کہ اسلام کی دعوت کو اس وقت جو صورتحال درپیش ہے وہ ___ بعض پہلوؤں سے مختلف ہونے کے باوجود ___ مجموعی طور پر اس صورتحال سے بہت قریب اور مشابہ ہے جو مسلم جماعت کو ابتدائے اسلام میں مکہ کے اندر درپیش تھی......تو پھر تشدد کا سہارا لینا دعوت کی کوئی خدمت نہ ہو سکتا تھا۔اس سے اسلام اور جاہلیت کے مابین جو اصل تنازعہ ہے، یعنی لا الہ الا اللّٰہ کا تنازعہ، وہ بجائے اس کے کہ واضح ہوتا اور بھی چھپ جاتا۔اس بات کو ہرگز فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اس تحریک میں اول سے لے کر آخر تک کا سب سے اہم مسئلہ ہے ہی یہ کہ اس تنازعے کی اصل حقیقت ___ یعنی لا الہ الا اللّٰہ کی بنیاد پر کھڑا ہونے والا تنازعہ ___ ہر کس و ناکس پر آخری حد تک واضح ہو جائے۔چاہے وہ تحریک کے اپنے نوجوان ہوں، چاہے تحریک کے مخاطب عوام ہوں اور چاہے دیکھنے سننے والے اور یہ کہ دعوت کی راہ میں کوئی قابل ذکر اور حقیقی پیش رفت ہو جانا ممکن ہی نہیں جب تک یہ اصل قضیہ تصور و عقیدہ سے لے کر سلوک اور عمل تک ہر سطح پر واضح انداز میں سرفہرست نہیں لے آیا جاتا۔

اب جب ہم حکمرانوں کے ساتھ ایسے معرکے شروع کر لیتے ہیں جن میں طرفین کے مابین طاقت کا کوئی نسبت تناسب ہی نہیں۔جبکہ جوازِ اقتدار کا مسئلہ ابھی لوگوں کے ذہن میں واضح تک نہ کیا جا سکا ہو، تو اس سے بیک وقت دو مسئلے پیدا ہوتے ہیں اور یہ دونوں ہی تحریک کیلئے شدید نقصان دہ ہیں:

پہلا مسئلہ: یہ کہ اسلامی تحریک اور برسر اقتدار طبقوں کے مابین کسی ایسی مسلح چپقلش ہو جانے کے بعد، جلد یا بدیر، دیکھنے والوں کی نگاہ میں مسئلہ سارے کا سارا اس بات پر آ رہتا ہے کہ کون مرا اور کس نے مارا، کون جیتا اور کون ہارا۔ اور یہ تو سب کو بھول ہی جاتا ہے یا بڑی حد تک پس منظر میں چلا جاتا ہے کہ اصل بات کیا تھی جس کی وجہ سے یہ لڑائی ہو رہی ہے۔ دیکھنے والوں کی نگاہ سے روپوش ہو جاتا ہے کہ طرفین میں اصل تنازعہ اس بات پر ہے کہ دنیا میں بندگی کس کی ہو اور زمین پر چلے کس کی؟ اس طول پکڑتی اور روزانہ کا معمول بنتی ہوئی لڑائی میں اب کون کس کو بتائے گا کہ فریقین کے مابین جھگڑا اس بات پر ہے کہ قانون چلانے کا حق کس کو ہے کیا اللہ وحدہ لاشریک کو یا انسانوں کو اور یہ کہ اقدار اور معیارات مقرر کرنے کا حق کسے ہے اور لوگوں کیلئے زندگی کا رخ متعین کرنے کا حق کس کو ہے کیا اللہ کو یا غیر اللہ کو؟ یہی وہ اصل مسئلے اور اصل تنازعے ہیں جو اسلام اور جاہلیت میں اور اہل حق اور اہل باطل کے مابین ازل سے چلے آ رہے ہیں، اسی مقصد کیلئے دنیا میں رسول مبعوث ہوئے، اسی مقصد کیلئے آسمان سے وحی اترتی رہی اور اسی مسئلے کی بنیاد پر جنت اور دوزخ وجود میں آئیں۔

دوسرا مسئلہ: یہ کہ یہ کام کر کے ہم اسلام دشمن حکومتوں کو ایک زبردست موقعہ آپ اپنے ہاتھ سے فراہم کر دیتے ہیں کہ وہ لوگوں کو یہ باور کرا لیں کہ وہ دراصل اسلام سے جنگ نہیں کر رہے بلکہ دہشت گردی سے نمٹنا چاہ رہے ہیں۔ لوگ کچھ نہ کچھ دیر بعد اس بات کو بہر حال سچ ماننے لگتے ہیں۔ اس میں دعوت سراسر نقصان میں رہتی ہے۔ کیونکہ اس سے لوگوں کو ان حکومتوں کا اصل گھناؤنا چہرہ اسلام دشمنی کرتا ہوا اپنی عریاں ترین حالت میں دیکھنے کا موقع نہیں ملتا بلکہ لوگوں کے سامنے وہ 'مذہبی جنونیوں' سے اپنا 'دفاع' کر رہا ہوتا ہے۔ نہ ہی اس کام سے لوگوں کے ذہن میں جوازِ اقتدار رکھنے کا مسئلہ واضح ہوتا ہے، جبکہ یہ مسئلہ بھی ان بنیادی اور اساسی مسائل میں ہے جن پر جاہلیت اور اسلام کی جنگ اپنے درست اور طبعی انجام کو پہنچنے کیلئے ہمیشہ سہارا کرتی ہے۔

پھر اسی طرح جب ہم پارلیمنٹ میں شمولیت اختیار کرتے ہیں تو تب بھی ہم **لا الہ الا اللّٰہ** کو اصل بنیادی مسئلے کے طور پر پیش کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

ہماری پہلی ناکامی یہ ہوتی ہے کہ شریعت کا قیام اور فرمانبرداری کا مسئلہ جو کہ دین میں ایک لازمی ترین فرض کا درجہ رکھتا ہے اب وہ ایک اختیاری کام بن جاتا ہے جس کا فیصلہ عوام کے ووٹوں سے ہونا

ہوتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّـهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِم (الاحزاب:۳۶)

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے

یہ مسئلہ کہ اللہ تعالیٰ کی، زمین میں بلا شرکت غیرے بندگی ہو، جو کہ اصل میں **لا الـہ الا الـلّٰہ** کا مسئلہ ہے، دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تنہا اور بلا شرکت غیرے عقیدے میں معبود ہو، وہی تنہا اور بلا شرکت غیرے مراسم بندگی میں معبود ہو۔ ایک اسی کا قانون ہو اور اسی کی شریعت۔ ایک اسی کو، اور بلا شرکت غیرے، یہ اختیار ہو کہ وہ انسانوں کیلئے زندگی کی اقدار اور معیار مقرر کرے اور ایک وہی بلا شرکت غیرے انسانوں کیلئے زندگی گزارنے کا طریق کار طے کرے......اور پھر وہ جو طے کر دے وہ حرف آخر ہو اور ہر حال میں فرض ولازم۔ ایک مسلمان کو، جب تک کہ وہ اسلام کا اقراری ہے، اسے قبول کرنے یا قبول نہ کرنے کا ذرہ بھر اختیار نہ ہو، اور اس مالک الملک کا فرمایا ہوا اور نازل کیا ہوا ہر اس شخص پر فرض ٹھہرا دیا جائے جو زبان سے **لا الـہ الا الـلّٰہ** کا اقرار کرتا ہے، چاہے وہ اندر سے منافق اور اسلام کو ناپسند کرنے والا کیوں نہ ہو۔ کیونکہ **لا الـہ الا اللّٰہ** کا اقرار کر لینے کے بعد پھر اگر وہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی شریعت سے سرِعام منہ موڑتا ہے، اور اس کے فیصلے پہ سر تسلیم خم نہیں کرتا، تو اس کے زبان کے اقرار کی بنا پر اس کا مواخذہ ہوگا، اور وہ اسلام سے مرتد قرار دیا جائے گا۔ یہاں اس معاملے میں اختیار کیسا!؟

وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِّنْهُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَمَا أُولَـٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ (النور:۴۷-۴۸)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسول ؐ پر اور ہم نے اطاعت قبول کی۔ مگر اس کے بعد ان میں ایک گروہ (اطاعت سے) منہ موڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ اور رسول ؐ کی طرف، تا کہ رسول ؐ ان کے آپس کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق کترا جاتا ہے

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (النساء:۶۵)

نہیں، اے محمد ؐ، تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں، بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں

اب جب ہم جمہوری کھیل میں شامل ہوتے ہیں تو اپنے اس فعل سے جو پہلا کام ہم کرتے ہیں وہ یہ کہ وہ چیز جس کا خدا کی طرف سے ہر مسلمان پابند محض ہے ہم اس کو عوام کے استصواب کا مسئلہ بنا دیتے ہیں۔ خدا کی طرف سے جو بات حرف آخر ہے ہم اس کا فیصلہ عوام کے ووٹوں سے کرواتے ہیں کہ چاہیں تو اس کو قبول کر لیں اور چاہیں تو رد کر دیں۔ اس کے ساتھ ہم ___ جمہوری قواعد کی رو سے ___ بعض لوگوں کو یہ کہنے کا موقعہ دیتے ہیں اور ان کی یہ بات 'جمہوری قواعد' کی رو سے غلط نہیں ہوتی کہ "تم تو اقلیت میں ہو، پارلیمنٹ کی اکثریت پر تم اپنی رائے اور اپنا منشور آخر کیوں ٹھونسنا چاہتے ہو؟" اس کی وجہ یہی ہے کہ جمہوریت کی دنیا میں یہ مسئلہ 'ہماری رائے' اور 'ہمارے منشور' کی حیثیت رکھتا ہے نہ کہ 'حرف آخر' کی حیثیت جو کہ شریعت کا تقاضا ہے۔ ایک مسلمان کیلئے شریعت ہر حال میں قانون ہے مگر یہاں شریعت کو قانون کا درجہ پانے کیلئے اس بات کا انتظار کرنا پڑتا ہے کہ پارلیمنٹ میں اس کے حق میں پڑنے والے ووٹوں کی تعداد ایک خاص حد کو پہنچے تو پھر شریعت 'پاس' ہو۔

الجزائر میں جاہلیت نے اسلام کے ساتھ جو کیا، جب اسلام پسند پارلیمنٹ میں ووٹوں کی اس تعداد تک پہنچ گئے تھے جس کی اقتدار پانے کیلئے جاہلیت شرط لگایا کرتی تھی! یہ ظلم جو وہاں اسلام پسندوں کے ساتھ ہوا اس سے صرف نظر کرتے ہوئے بھی کہ یہ ایک ایسا سبق ہے جس سے جمہوری راستے پر چلنے والے اسلام پسندوں کو ہرگز ہرگز غافل نہیں رہنا چاہیئے ...... چنانچہ الجزائر میں جاہلیت نے اسلام کے ساتھ جو کیا اس سے قطع نظر کرتے ہوئے ضروری ہے کہ یہ مسئلہ بالکل ایک اور مختلف بنیاد پر متعین کیا جائے۔ شریعت کو حکمران بنانا خدائی فیصلہ ہے اور ہر مسلمان آپ سے آپ اس کا پابند۔ اس پر انسانوں کے ووٹوں کا کیا کام؟ اس پر لوگوں کو ووٹ دینے اور اس کو قبول یا رد کرنے اور شریعت کو پاس کرنے یا نہ کرنے کا اختیار کیسا؟ اللہ کی شریعت کو پاس نہ کرنے کا اختیار رکھتے ہوئے وہ مسلمان کیونکر رہ سکتے ہیں!؟

دو باتوں کو خلط کر دینا درست نہیں۔ اسلام کا زمین کے کسی خطے میں قائم ہونا ___ اللہ کی مشیئت کے بعد ___ اہل ایمان کی ایک ایسی مضبوط جمعیت کے وہاں پائے جانے پر موقوف ہونا جو اللہ کے اس اٹل فیصلے اور قانون کو دنیائے واقع میں عملی حقیقت کا روپ دے دیں، ایک بالکل اور بات ہے...... اور خود اس قانون کا جو خدا کی طرف سے نازل ہو چکا ہے قانون کا درجہ پانے کیلئے محل نظر ہونا یا پارلیمنٹ کی ووٹوں کا محتاج ہونا یا 'انتخاب' اور 'استصواب' کا موضوع ہونا بالکل ایک اور بات۔

بطور مسلمان ہمارے لئے خدا کی نازل کردہ شریعت کسی کے 'پاس کرنے' کی محتاج نہیں ہوسکتی۔ کسی کے ووٹ سے اس کے قانون کا درجہ پانے یا نہ پانے کا فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ ہم اس کو انتخاب کا موضوع نہیں بنا سکتے۔ خواہ ہم اس کو معاشرے میں جاری وساری کردینے کی طاقت رکھتے ہوں اور خواہ ہم، اپنے کمزور وناتواں ہونے کے باعث، اس بات کی طاقت نہ رکھتے ہوں جیسا کہ مسلمان مکہ میں کمزور ہونے کے باعث بہت دیر تک اس پوزیشن میں نہ تھے کہ شریعت کو معاشرے میں جاری کردیں۔

یہ بہرحال ضروری ہے کہ کوئی تحریک اسلام کو اور اسلامی شریعت کو لوگوں کے سامنے اس حیثیت میں پیش کرے: یعنی یہ کہ شریعت خدا کے اٹل فیصلہ کا نام ہے۔ ہر انسان آپ سے آپ، اور بغیر کسی اضافی شرط کے، اس کا پابند ومحکوم ہے۔ اس سے منہ پھیرنے والا خدائی فیصلہ کی رو سے مرتد ہے اور یہ کہ سب لوگ، خواہ وہ حاکم ہوں یا محکوم، اس کو عملاً قائم کردینے کے پابند ہیں۔ خواہ کوئی جماعت، کوئی کونسل ان سے 'نفاذ شریعت' کا مطالبہ کرنے کیلئے پائی جائے یا نہ۔ کیونکہ اللہ کی شریعت کا حکمران ہونا کسی انسان کے مطالبہ کرنے یا نہ کرنے پر موقوف نہیں، جبکہ یہ رب العالمین کا اپنا حکم ہے جو اس نے باقاعدہ فرمان کی صورت میں اپنے ہاں سے بندوں کیلئے نازل فرما رکھا ہے...... اور ایسا نہ کرنے کی اس نے کسی کیلئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑ رکھی ہے۔

اب یہ جو مفہوم ہے یہ لوگوں کے ذہن سے بالکل ہی روپوش ہوجاتا ہے ___ یا کم از کم بھی یہ کہ اس میں وہ اصل جان باقی نہیں رہتی ___ جب ہم جمہوری کھیل کا حصہ بن جاتے ہیں جس کا پہلا اصول یہ ہے کہ کسی چیز کا قانون ٹھہرنا اس بات پر موقوف ہے کہ انتخابات میں یا پارلیمان میں اس کو اکثریت کے ووٹ ملیں۔ ہماری دوسری ناکامی یہ ہوتی ہے کہ جمہوری تماشے میں شامل ہوکر ہم جوازِ اقتدار کے مسئلے کو بھی بے جان کردیتے ہیں۔ جمہوری اصولوں کی رو سے اقتدار کا جواز وہی رکھتا ہے جو اکثریت کے ووٹ لیتا ہے۔ اسلام کا سرے سے یہ معیار نہیں۔ خدائی معیار یہ ہے ___ جس طرح کہ ہم نے پچھلی فصل میں بیان کیا ___ کہ اقتدار کا جواز وہ رکھتا ہے جو اللہ کی شریعت کو حکمران بناتا ہے۔ رہا وہ جو اللہ کی شریعت سے منہ موڑتا ہے اور شریعت کو حکمران نہیں بناتا، اللہ کے دین کی رو سے وہ تو اقتدار کا ذرہ بھر جواز نہیں رکھتا چاہے وہ اکثریت کے ووٹ تو کیا سو فیصد کے سو فیصد ووٹ کیوں نہ لے چکا ہو۔ اس کا

اقتدار سو فیصد نا جائز ہوگا۔ یہی وہ اصل نقطۂ اختلاف ہے جو اسلام اور جمہوریت کے بیچ پایا جاتا ہے۔ اس بات کا دوٹوک ہونا ناگزیر ہے۔

اب جب ہم جمہوریت کے کھیل میں حصہ لیتے ہیں تو اس کھیل کے اصولوں کی رو سے ہمیں اس شخص یا اس پارٹی کیلئے اقتدار کا جواز تسلیم کرنا پڑتا ہے جو اکثریت کے ووٹ لے جائے، چاہے وہ اللہ کی شریعت کو حکمران نہ بھی بناتا ہو۔ کیونکہ اس کھیل کے یہی اصول ہیں اور اس کھیل میں حصہ لینے کیلئے یکطرفہ طور پر ہم یہ اصول تبدیل نہیں کر سکتے۔ اب اس طریقے سے ہم ایک ایسی غلطی میں جا پڑتے ہیں جو کہ ہمارے عقیدے کی خلاف ورزی ہے۔ ایسا کر کے ہم ایک ایسی چیز کا جواز تسلیم کر لیتے ہیں جسے ہمارے رب نے کفر کہا ہے اور وہ اس طرح کہ ہم غیر ما انزل اللّٰہ کی حکمرانی کو، جو کہ کفر ہے، جمہوری اصولوں کے احترام میں تسلیم کر لیتے ہیں۔

اب ہم جتنا بھی اپنے نجی اور عوامی بیانات میں یہ کہتے رہیں کہ غیر ما انزل اللّٰہ کی شریعت کو ہم تسلیم نہیں کرتے مگر جمہوری کھیل کے اصولوں کی رو سے ہم اپنے آپ کو یہ (غیر شریعت کی حکمرانی) تسلیم کرنے کا اس وقت پابند کر چکے ہوتے ہیں جب ہم اس کھیل میں شمولیت پر آمادگی ظاہر کرتے ہیں بلکہ جب ہم، متعدد مواقع پر، اس کھیل میں حصہ لینے کی باقاعدہ اجازت طلب کرتے اور بعض اوقات جب ہمیں اس کی اجازت نہیں دی جاتی تو ہم اس پر احتجاج کرتے ہیں۔

اس کھیل کے دوران ہمارے مخالفین نے، کئی مواقع پر، ہمیں شرمندہ اور لاجواب کرنے میں کوئی کسر بھی نہ چھوڑی بلکہ سیاست اور صحافت میں ہمیں بار بار وہ اس سوال پر لے آتے رہے کہ "انتخابات میں اگر آپ ہار جاتے ہیں اور دوسری غیر اسلامی جماعتیں انتخابات جیت جاتی ہیں تو ان کی حکومت کے بارے میں آپ کا کیا موقف ہوگا؟" افسوس اور صد افسوس کہ ہمیں کہنا پڑا: "ہم قوم کے فیصلے کا احترام کریں گے" ہم سے سوال ہوا: "آپ کے اقتدار میں آنے کے بعد اگر قوم آپ کو مسترد کر دے اور اگلی بار "دوسروں" کو منتخب کر لے تو؟" افسوس اور صد افسوس کہ ہمیں کہنا پڑا "ہم قوم کے فیصلے کے پابند رہیں گے" ارے کیا تب بھی جب قوم کا فیصلہ خدا کے فیصلے کے خلاف ہو!؟؟

لا الہ الا اللّٰہ کے مسئلے کو اور جوازِ اقتدار کے مسئلے کو بے جان کر دینے میں آخر اس سے بڑھ کر کیا بات ہوسکتی؟

یہ سب کچھ جان بوجھ کر جب ہم نے اس کھیل میں حصہ لیا تو اس کھیل کے اصولوں کو تسلیم کرنے کے ہم آپ سے آپ پابند ہوئے۔ یہ ایک سیدھی اور منطقی بات ہے۔ ہاں اگر کھیل کے ان باطل اصولوں کو مسترد کرنا ہے تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ سرے سے ہم یہ کھیل کھیلتے ہوئے ہی نظر نہ آئیں۔ تب ہمارا موقف خود اپنی نظر میں بھی اور لوگوں کی نظر میں بھی منطقی و معقول ہوگا جب ہم لوگوں سے کہیں گے: ''ہم اس کھیل میں اس لئے حصہ نہیں لیتے کہ اس کے اصول اللہ کے فیصلے اور اس کے حکم سے متعارض ہیں''۔

قدرتی بات ہے جب ہم یہ کہیں گے تو ہمارے مخالف ہمارے بارے میں یہ عام کریں گے اور ہمیں یہ کہہ کر بدنام کریں گے کہ: تم جمہور پسند نہیں ہو۔ تم عوام اور جمہوریت کے دشمن ہو۔ ہم ان سے صاف کہیں گے تم جو چاہو کہتے رہو ہم ایک ایسے نظام کو تسلیم نہیں کر سکتے جو کسی مخلوق کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اللہ کی شریعت سے متصادم قانون چلائے۔ کیونکہ اگر ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر ہم مسلمان نہیں رہنے کے۔ اور جو چیز ہم پر خدا نے آسمان سے اتاری ہے وہ اسلام اور خدا کی فرمانبرداری ہے نہ کہ تمہاری یہ جمہویت جس کا تم ہمیں طعنہ دیتے ہو۔ ہمیں جس بات کا خدا نے ہر حال میں پابند بنایا ہے وہ اسلام ہے نہ کہ جمہوریت۔ قیامت کے روز جس بات پر وہ ہمارا حساب کرے گا وہ 'اسلام' ہے نہ کہ جمہوریت۔ إن الدین عند اللہ الاسلام (آل عمران:۱۹) ''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے''۔ ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منه وهو فی الأخرة من الخاسرین (آل عمران: ۸۵) ''اس اسلام (فرماں برداری) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا''۔

ٹھیک ہے اسلام میں شوریٰ ہے۔ مگر اس شوریٰ کا مطلب ڈیموکریسی نہیں ہے۔ شوریٰ اس بہترین طریقے کا نام ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہونے والی ایک نص کو نافذ کرنے کیلئے اور جہاں خدا کی طرف سے واضح نص موجود نہ ہو وہاں مسلمانوں کے باصلاحیت طبقوں سے اجتہاد [1] کروانے کیلئے

(۱) اجتہاد کی حدود اسلامی فقہ کے اندر معروف ہیں، اور وہ یہ کہ نہ تو وہ شریعت کے کسی حلال کو حرام کریں اور نہ کسی حرام کو حلال، اور نہ ہی مقاصدِ شریعت کے ساتھ متصادم ہوں۔ ان کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ان تمام امور کو شامل ہے جو امت کو کسی بھی دور کے اندر پیش آ جائیں، گو اس عمل کو اپنے تمام مراحل میں شریعت کے ضوابط ہی کا پابند رہنا ہوتا ہے۔

اختیار کیا جاتا ہے۔ رہی ڈیموکریسی تو وہ ابتداءً حاکمیت انسانیت کے دائرہ اختیار میں دیتی ہے اور اپنی بات چلانے اور مطلق و غیر مشروط طور پر منوانے کا حق ایک اللہ وحدہ لا شریک کو نہیں دیتی۔ کتنا بڑا بعد المشرقین ہے ان کی اس جمہوریت اور اسلام کی اس شوریٰ میں۔ **افحکم الجاهلية يبغون ومن احسن من الله حكما لقوم يوقنون** (المائدۃ:۵۰) "کیا پھر یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک تو اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے"۔

اب اگر ہمارے جمہوریت کے کھیل میں حصہ لینے کا، **لا الہ الا اللّٰہ** کے مسئلے اور جوازِ اقتدار کے مسئلے کو بے جان کر کے رکھ دینے کے سوا، اور کوئی بھی نقصان نہ ہو تو ایک یہی نقصان اس قدر کافی ہے کہ اس کے پیش نظر ہم اس کھیل سے دور رہیں۔ چاہے اس سے حاصل ہونے والے وہ جزوی فوائد کتنے بھی ہوں جو ہم پارلیمنٹ میں شمولیت کر کے حاصل کرتے ہیں اور جن سے، پارلیمنٹ میں شامل نہ ہونے کی صورت میں، ہمیں ہاتھ دھونے پڑ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوا بھی تو حرام کیا ہے، حالانکہ ان دونوں میں خود قرآن کی اپنی صراحت کے مطابق لوگوں کیلئے کئی ایک فائدے ہو سکتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اس نے ان دونوں کو، جس طرح کہ آیت نے صراحت کی ہے، حرام کر دیا ہے کیونکہ ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (النساء:۶۵)

پوچھتے ہیں: شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو: ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کیلئے کچھ منافع بھی ہیں۔ مگر ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بہت زیادہ ہے

یہ ایک ایسا فقہی قاعدہ ہے جس سے ہم اس معاملے میں ہدایت پا سکتے ہیں جس میں شریعت کی واضح نص نہیں۔ پارلیمنٹ اور پارلمینٹ میں شمولیت کے مسئلے پر بھی شریعت کی نص موجود نہیں لیکن اس مسئلے پر ہوش مندی کے ساتھ غور کر لیا جائے تو یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہیں کہ ایسا کر کے ہم **لا الہ الا اللّٰہ** کے اصل مسئلے کو اور **لا الہ الا اللّٰہ** کے بنیادی تقاضوں کو بے جان کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ایسا کر کے ہم شریعت کے اس مسئلے کو بھی بے جان کر دیتے ہیں کہ اقتدار کا جواز کون رکھتا ہے۔ یہ بات ہماری اصل دعوت پر برے طریقے سے اثر انداز ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ بات دعوت کے ان دو بنیادی اور اساسی قضیوں کی بابت لوگوں کا ذہن منتشر کر دیتی ہے:

پہلا قضیہ یہ کہ: شریعت کا حکمران ہونا، اور خود بخود قانون کا درجہ رکھنا، خدائی پابندی ہے نہ کہ ایسا مسئلہ جس پر لوگ ووٹ دیں یا عوامی نمائندے بحث کریں۔ شریعت کو قانون بنا دینے والی چیز یہ بات نہیں کہ آیا لوگ اس کو منظور کرتے ہیں یا نہیں یا کوئی مجلسِ قانون ساز اس کے بارے میں کوئی شق پاس کرتی ہے یا نہیں۔ بلکہ شریعت کو آپ سے آپ قانون بنا دینے والی چیز ہمارا مسلمان ہونا ہے بلکہ ہمارا زبان سے یہ دعویٰ کر دینا ہی کہ ہم مسلمان ہیں آپ سے آپ شریعت کو قانون بنا دیتا ہے۔

دوسرا قضیہ، جو ہمارے پارلیمنٹ میں جا بیٹھنے سے بے جان ہو جاتا ہے یہ کہ: اللہ کے دین میں 'جائز اقتدار' یا 'ناجائز اقتدار' کا مسئلہ اس بات سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا کہ انتخابات میں کس نے کتنے ووٹ لئے ہیں۔ لوگوں کی تائید یا عدم تائید کسی چیز سے تعلق رکھ سکتی ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ حکمران 'شخصیت' ہو سکتی ہے جسے "اللہ کی شریعت کو نافذ کرنے کیلئے" اقتدار پر فائز ہونا ہے نہ کہ لوگوں کی تائید یا عدم تائید کا تعلق اس مسئلہ سے ہے کہ یہ منتخب ہونے والا شخص یا گروہ کس انداز سے حکومت کرے۔ نظامِ حکومت کو طے کرنا کسی کا اختیار نہیں، خواہ وہ حاکم ہو یا محکوم۔ اللہ کے فیصلے کے بعد کسی کا فیصلہ نہیں۔ اور اللہ نے اپنا یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ایک اسی کی شریعت انسانوں کیلئے قانون ہے۔ بلکہ اس نے تو یہ بھی فیصلہ کر دیا ہے اور وہ بھی بڑی صراحت کے ساتھ کہ جو اس کی اس شریعت سے منہ موڑے وہ سرے سے مومن نہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيما (النساء:٦٥)

نہیں، اے محمد، تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربسر تسلیم کریں

وَمَا أُوْلَئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ (النور: ٤٧)

**"اور ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں"**

☆☆☆☆☆☆☆

یہ ہیں کچھ بنیادی مسائل جو تحریکی اور دعوتی عمل میں بہت واضح کر دیئے جانے چاہئیں۔ جب تک عوام یہ مسائل تحریک سے سن سن کر پوری گہرائی کے ساتھ ان کو سمجھ نہیں لیتے اور ان پر ان کا ایمان اور یقین راسخ نہیں ہو جاتا اس وقت تک تحریک کی عوامی بنیاد پختہ نہیں ہوتی۔ تحریک کو یہ عوامی بنیاد بے انتہا پختہ کرنا ہوتی ہے۔ اسلام کا اقتدار اسی عوامی سرزمین پر قائم ہونا ہوتا ہے۔ عالمی جاہلیت

ہر وقت اسلامی تحریک کی تاک میں لگی رہے گی اور دنیائے واقع میں اس دین کے پیر جم جانے کا ہرگز کوئی موقعہ نہیں دے گی۔ لہٰذا اسلام کی عمارت اٹھانے کیلئے عوام کی یہ زمین بہت ہی پختہ کی جانے کی ضرورت رہے گی۔ اسلام کے بنیادی مفہومات اور تصورات پر معاشرے کا اپنا ہی ایمان اس قدر راسخ اور پختہ ہونا چاہیے جو آج کے کسی بھی عالمی دباؤ کے سامنے چٹان بن کر کھڑا رہے بلکہ خود آگے بڑھ کر اس کا مقابلہ کرے۔ ہر وہ دھندلاہٹ جو ہم اپنے کسی عمل سے لوگوں کے ذہن میں اسلام کے ان بنیادی اور اساسی مسائل کے گرد پیدا کرلیں گے وہی دعوت کے راستے کی اصل رکاوٹ ہوگی اگرچہ ہم یہ گمان کریں کہ یہ کام ہمیں اپنے ہدف سے قریب کر دے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

یہ تھا ایک بہت ہی مختصر اور سرسری ذکر ان اسباب کا جو ہماری آج کی اسلامی تحریکوں میں عجلت پسندی آجانے کا باعث بنے ہیں، اور ان نتائج کا جو پھر اس عجلت پسندی کے نتائج کی صورت میں سامنے آئے ہیں اور جو کہ ہم پر یہ حق رکھتے ہیں کہ ہم ان کا بغور جائزہ لیں اور ان کی روشنی میں اپنے نقطہ ہائے نظر درست کریں اور آئندہ کیلئے منہج درست کرنے کی کوشش۔

اب آئندہ فصول میں ہم تربیت پر جو کہ دراصل مطلوب ہے گفتگو کریں گے۔ چاہے یہ تربیت کا وہ پہلو ہو جو کہ اس بنیادی جمعیت کی ضرورت ہے جسے بالآخر معاشرے پر اثر انداز ہونا اور معاشرے کو ساتھ لے کر چلنا ہے اور چاہے یہ تربیت کا وہ پہلو ہو جو دعوت کے مخاطب عوام کو دی جانا ضروری ہے۔ تاکہ عوامی سرزمین اس حد تک تیار ہو جائے کہ اس پر اسلام کی عمارت کی بنا رکھی جائے اور اسلام کی تحریک آخر کار اپنے وسیع تر مقاصد حاصل کرے۔ اپنی اس گفتگو میں ہم دعوت کے نبوی منہج سے مدد لیں گے۔ دعوت اور تحریک کے نبوی منہج میں نقطۂ ابتدا ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ ایک ایسی ٹھوس اور مضبوط جمعیت کی تیاری عمل میں لائی جائے، جو معاشرے کی ہر میدان میں قیادت کر سکے اور اس پوری عمارت کا وزن اپنے کاندھوں پر اُٹھا لے۔

☆☆☆☆☆☆☆

# ”بنیادی جمعیت“
# جو معاشرے پر اثر انداز ہو

محتاج بیان نہیں کہ ہر رسول اپنی رسالت اور اپنے مشن کا خود ہی عنوان ہوا کرتا ہے۔ وہ خود ہی ایک ایسا نمونہ ہوتا ہے جسے اس کے پیروکاروں کو اپنی زندگیوں میں اختیار کرنا ہوتا ہے۔ ان کو حتی الوسع یہ کوشش کرنی ہوتی ہے کہ اپنے اس نبی کے اقوال وافعال اور حرکات وسکنات ہی کا عملی مظہر بنیں اور اس کے امرونہی کو حقیقت میں تبدیل کر دیں۔ ہر رسول کے پیروکاروں کو یہی کام کرنا ہوتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّهِ (النساء:٦٤) | ہم نے جو کوئی بھی رسول بھیجا وہ اسی لئے تو بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی فرمانبرداری کی جائے |
| وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا (الحشر:۷) | جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رُک جاؤ |
| لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا (الاحزاب:٢١) | دراصل تمہارے لئے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے |
| فاذا نهيتكم عن شيء فاجتنبوه، واذا أمرتكم بامر فاتوا منه ما أستطعتم (أخرجه البخاری) | پس جب میں تم کو کسی بات سے روک دوں تو اس سے رک جایا کرو اور جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو جہاں تک استطاعت ہو اس کو پورا کرو |

پھر یہ بھی محتاج بیان نہیں کہ آخری رسالت سب رسالتوں میں ایک منفرد ترین رسالت ہے۔ کیونکہ اس پر دین کی تکمیل ہوگئی ہے۔ یہ پوری انسانیت کے لئے اتری ہے نہ کہ کسی خاص قوم کیلئے، جیسا کہ پچھلی رسالتوں میں ہوتا رہا ہے، اور پھر اس لئے بھی کہ یہ وہ رسالت ہے جو ایک بے مثال جامعیت

رکھتی ہے اور انسانی زندگی کے سب جوانب کا احاطہ کرنے اور ہر پہلو سے انسانی زندگی پر حاکم بننے کے لئے اتاری گئی ہے۔ پھر یہ بعثتِ محمد ﷺ سے لے کر قیامت تک کے سب ادوار کیلئے انسانیت کو زندگی کا ایک مکمل ترین منہج عطا کرتی ہے۔

| | |
|---|---|
| الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِيناً (المائدہ۳) | آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہوا |
| قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعاً (الاعراف:۱۵۸) | اے محمدؐ! کہو کہ: اے انسانو میں تم سب کی طرف خدا کا پیغمبر ہوں |
| وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء:۱۰۷) | اے محمدؐ! ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے |
| وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِناً عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ (المائدۃ:۴۸) | پھر اے محمدؐ! ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور اپنے سے اگلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور انکا احاطہ کرنے والی ہے |

خدائی منصوبہ تھا کہ یہ سب امتیازات آخری رسالت کا خاصہ بنیں۔ ان سب امتیازات کے ساتھ ہی نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت عمل میں لائی گئی۔

| | |
|---|---|
| مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ (الاحزاب:۴۰) | (لوگو) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں |
| لا نبی بعدی (متفق علیه) | میرے بعد اب کوئی نبی نہیں |

'ختم رسالت' کا یہی تقاضا ٹھہرتا تھا کہ آخری رسالت میں نہ صرف لوگوں کی ہر وہ ضرورت پوری کر دی گئی ہو جو اس رسالت کے نزول کے وقت ان کو پیش آئے بلکہ اس میں ان سب ضرورتوں کو بھی بدرجہ اتم پورا کر دیا گیا ہو جو قیامت تک کبھی مستقبل میں بھی پیش آسکتی ہوں[1] یہاں تک کہ اگر لوگ اس رسالت اور اس مشن سے چمٹے رہیں تو کبھی خراب نہ ہوں اور نہ ہی اپنی دنیا و آخرت بنانے کیلئے وہ اس کے علاوہ کسی اور چیز کے کبھی ضرورت مند ہوں۔

| | |
|---|---|
| ترکت فیکم ما ان تمسکتم به لن تضلوا ، کتاب اللّٰہ و سنتی (متفق علیه) | میں تم میں ایک ایسی (زبردست) چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر اس سے چمٹے رہو تو کبھی راستہ نہ بھٹکو، یہ ہے کتاب اللہ اور میری سنت |

آخری رسالت کی اگر یہ شان ہے تو پھر یہ ایک طبعی بات تھی کہ خدا کا آخری رسولؐ سب رسولوں میں عظیم الشان ہوتا۔ یہ وہ سب سے عظیم ہستی ہوتی جس نے اس زمین پر کبھی پاؤں دھرا ہو......اور یہ کہنا بھی ہرگز بعید از حقیقت نہ ہوگا کہ وہ مرد صفت لوگ جنہیں رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس تربیت دی وہ ___اللہ کے رسولوں کے بعد___ تاریخ کے عظیم ترین لوگ ہیں۔

بطور عموم ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اصول اور وہ انسانی قدریں جن پر تربیت کا کوئی عملی منہج مشتمل ہو اس معاملے میں گہری تاثیر کی حامل ہوتی ہیں کہ وہ کس نوعیت کے انسان تیار کریں گی۔ جس قدر یہ قدریں اور یہ اصول عظیم ہوں گے اتنے ہی زبردست معیار کے وہ لوگ ہونگے جو ان قدروں اور ان اصولوں سے ذہنی اور اخلاقی تربیت پا کر تیار ہوئے ہونگے......ایک دوسرے پہلو سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مربی کی شخصیت بھی اس معاملے میں گہری تاثیر کی حامل ہوتی ہے کہ جو لوگ اس سے تربیت پائیں وہ کس معیار کے نکلیں گے۔ جس قدر عظیم مربی کی شخصیت ہوگی اتنے ہی عظیم المرتبت اور بلند خیال و بلند اخلاق وہ لوگ ہونگے جو اس سے تربیت پا چکے ہوں......ایک تیسرے پہلو سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ فطری استعداد جو تربیت پانے والوں میں رکھی گئی ہو وہ اس معاملے میں گہری تاثیر کی حامل ہوتی ہے کہ وہ کسی مربی سے تربیت پا کر سیرت اور کردار میں عظمت کی کس حد کو پہنچ سکتے ہیں۔ جتنی تربیت پانے والوں کی فطری استعداد ہوگی اور جس قدر وہ نفس کے عیوب سے پاک ہوگی اتنی ہی اعلیٰ تربیت ان لوگوں کی ہو سکے گی......اب اگر ہم ان تینوں بنیادی عناصر کو مدنظر رکھیں تو ہم ان بنیادوں کے بارے میں اپنا ایک ذہن بنا سکتے ہیں جن پر اس جمعیت کی تیاری عمل میں لائی گئی تھی جو آگے چل کر معاشرے پر اثر انداز ہوئی اور جو کہ رسول اللہ ﷺ نے بنفس نفیس تیار کی۔ ان تینوں عناصر کو سامنے رکھ کر ہم رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں تیار ہونے والی اس بنیادی جمعیت کے معیار اور نوعیت کا تعین بھی کر سکتے ہیں جس

---

(۱) انسانی زندگی میں آئے روز نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بات رسالت نازل کرتے وقت اللہ کے علم سے پوشیدہ نہ تھی۔ مگر اللہ نے شریعت کے اندر ایسی صلاحیت ودیعت کر رکھی ہے کہ یہ ہر نئے مسئلے کو بہترین انداز میں حل کر لیتی ہے اور ہر نئی صورتِ حال پر چھا جاتی ہے۔ مسلم فقہا اور اصولیوں نے ان امور کو مفصل بیان کیا ہے، اور اس کی تفصیل ان کی کتب میں طلب کی جا سکتی ہے

نے ایک محدود ترین عرصے میں تاریخ کا رخ بدل دیا تھا۔

جہاں تک تربیت کے ان اصولوں کا تعلق ہے تو اس کی بابت یہی کہ دینا کافی ہے کہ ان کی اساس اور ابتدا توحید ہے۔ یعنی لا الـہ الا اللّٰـہ ۔توحید ہی وہ چیز ہے جس نے اس امت کو وجود دیا اور 'خیر امت' کی حیثیت میں دنیا کو اس امت سے متعارف کرایا۔

كُنتُمْ خَيْـرَ أُمَّةٍ أُخْـرِجَـتْ لِلنَّـاسِ تَـأْمُرُونَ بِـالْـمَـعْـرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰه (آل عمران:١١٠)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں ( کی ہدایت و اصلاح ) کیلئے میدان میں لائی گئی۔تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو

البتہ یہ 'خیریت' یعنی اس امت کے 'بہترین ہونے' کی یہ صفت کسی اور میں اس درجہ کی نہ پائی گئی جس درجہ کی یہ اس بے مثال جمعیت میں پائی گئی جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنے زیر نگرانی مکہ کے تربیتی مرحلے میں تیار کیا اور پھر مدینہ میں اسکے بقیہ حصے کی تکمیل کی......

توحید ___ اپنی اس حقیقت کے ساتھ جس کے ساتھ یہ نازل ہوئی اور جسے رسول ﷺ کے دل میں بٹھایا گیا اور جس پر پھر آپؐ نے اپنے ساتھیوں کو تربیت دی ___ دراصل کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔اور یہ کائنات کی حقیقت میں وہ سب سے عظیم وصف ہے جو کائنات کی ساخت میں اصل محرک ہے اور انسانی نفوس کی تعمیر میں اصل عنصر۔

اللّٰهُ لا إِلَـهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوم (آل عمران:٢)

اللہ ہی وہ ذات ہے جس کے سوا بندگی کرانے کا کسی کو حق نہیں...... وہ زندۂ جاوید ہستی جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے

کائنات اپنی فطرت میں عبادت کرنے والی ہے۔انسان اپنی فطرت میں عبادت کرنے والا ہے۔آسمان اور زمین خدا کے آگے مطیع وفرمانبردار ہیں۔رہ گیا انسان جس کا ایک پہلو تو اسی طرح مطیع و فرمانبردار ہے مگر دوسرا پہلو استکبار اور پہلوتہی کر لیتا ہے:

ثُـمَّ اسْتَـوَى إِلَى السَّمَاء وَهِيَ دُخَانٌ فَـقَـالَ لَهَـا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَـا طَوْعـاً أَوْ كَرْهاً قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِين (حم السجدۃ:١١)

پھر استوا کیا اس نے آسمان کی طرف جو کہ اس وقت محض دھواں تھا۔ پھر کہا اُس نے آسمان سے اور زمین سے:"فرمانبرداری میں آ جاؤ خواہ تم چاہو یا نہ چاہو" دونوں نے کہا!"ہم بخوشی فرمانبردار ہوئے"

| | |
|---|---|
| أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ (الحج:۱۸) | کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے آگے سربسجود ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان۔ اور بہت سے وہ بھی ہیں جن پر عذاب کا مقولہ ثابت ہو چکا ہے |

## انسان کی فطرت طبعاً موحد ہے:

| | |
|---|---|
| فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفاً فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (الروم:۳۰) | پس تم یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو۔ اس فطرت کو قائم کرتے ہوئے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بنائے کو بدلنا نہیں۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے |
| وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُواْ بَلَى شَهِدْنَا (الاعراف: ۱۷۲) | وہ وقت جبکہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا: "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں" انہوں نے کہا: کیوں نہیں۔ ہم سب گواہ بنتے ہیں |
| كل مولود يولد على الفطرة (البخاری) | ہر نومولود فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے |
| انی خلقت عبادی حنفاء كلهم (مسلم) | میں نے اپنے سب بندے طبعا موحد پیدا کئے ہیں |

**مگر خدا کا انسان کیلئے ایک فضل اور تکریم تھی کہ اس نے نہ چاہا کہ انسان کو بزور توحید پر چلائے جیسا کہ اس نے دوسری مخلوقات کو بزور اپنے حکم کا مطیع کر رکھا ہے۔ اس کی بجائے انسان کو اوروں پر فضیلت اور اعزاز دیا ہے۔**

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (الاسراء: ۷۰) | یقیناً ہم نے اولاد آدم کو بڑی عزت دی اور ان کو خشکی و تری میں سوار کرایا اور انکو پاکیزہ نعمتوں سے روزی پہنچائی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی |

**یہ تکریم ہی کا ایک مظہر ہے کہ انسان کو چناؤ کی آزادی دے دی گئی ہے۔**

| | |
|---|---|
| وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا (الشمس:۷۔۱۰) | قسم ہے نفس انسانی کی اور اس کی موزوں ترین ساخت دینے کی۔ پھر سمجھ دی اس کو بدکاری کی اور (برائی سے) بچ نکلنے کی۔ جس نے اسے پاک کیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے خاک میں ملا دیا وہ ناکام ہوا |

باوجود اس کے کہ یہ آزادی انسان کیلئے ایک اعزاز ہے جو اللہ تعالیٰ نے بطور خاص انسان کو دیا پھر بھی بعض فطرتیں بگڑ جاتی رہیں اور بجائے اس کے کہ اپنی اس آزادی کو ہدایت کا راستہ اور اس پر استقامت اختیار کرنے کیلئے استعمال کریں یہ اس آزادی کو خدا کی نافرمانی کیلئے استعمال کرنے لگیں اور اس کی عبادت سے بڑائی اختیار کرجاتی رہیں، جس کے نتیجے میں لوگوں میں کچھ مومن ہوئے اور کچھ کافر۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِن (التغابن:۲) وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن

چنانچہ ایمان لانے والے لوگ اپنی سلیم فطرت پہ چلنے والے ہوئے اور اپنے ایمان میں پائی جانے والی سچائی اور رسوخ اور مضبوطی کے بقدر، خدا کی جانب بڑھنے والوں میں رفعت اور منزلت پانے لگے اور اس مقصد کی طرف گامزن ہوئے جو کہ تمام کائنات کی تخلیق کی اصل غایت ہے اور جو کہ اس آیت میں بیان ہوئی:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات: ٥٦) جنوں اور انسانوں کو میں نے اس کے سوا کسی کام کیلئے پیدا نہیں کیا کہ بس وہ میری بندگی کریں

یہ بندگی کو اللہ وحدہ لاشریک کیلئے خالص کر دینا...... یعنی ''توحید'' انسانی نفوس میں کیا تبدیلی لے آتی ہے؟

کیا آپ نے کبھی لوہے کا ٹکڑا دیکھا جس میں برقی رو گزار دی گئی ہو یا جس پر مقناطیس لگا دیا گیا ہو۔ لوہے کے اس ٹکڑے میں کیا تبدیلی آجاتی ہے؟ اس میں ___ جیسا کہ طبیعات کا علم ہمیں بتاتا ہے ___ اس کے سب ذرات ایک نئی ترتیب اختیار کر لیتے ہیں گویا لوہے کا وہی ٹکڑا ہے مگر اب اس کی ہستی کچھ اور ہے۔ اس میں ایک ایسی برقی اور مقناطیسی قوت آجاتی ہے جو اس سے پہلے نہیں تھی۔ یہ ایک ایسی قوت ہوتی ہے جو اب حرکت پیدا کرسکتی ہے جبکہ اس سے پہلے وہ بالکل بے جان تھا نہ خود ہل سکتا تھا اور کسی اور چیز کو ہلا سکتا تھا......

یہ طاقت جو لوہے کے اس ٹکڑے میں یک دم آگئی آخر اس کی ہستی میں اِس سے پہلے کہاں گم تھی؟ یہ بکھری ہوئی حالت میں تھی اور بے ربط تھی۔ اُس حالت میں نہ یہ ظاہر ہوسکتی تھی اور نہ عمل کرسکتی تھی۔ تب اِس قوت کا کوئی ایسا وجود نہ تھا جو کوئی واقعہ بن سکے اور دیکھنے اور محسوس ہونے میں آسکے...... مگر اب یہ ایک خاص ترتیب سے جڑ گئی ہے۔ اب یہ ظاہر بھی ہونے لگی ہے۔ عمل بھی کرنے لگی ہے اور

اس کے آثار عالم واقع میں بھی دیکھے جانے لگے ہیں۔

کچھ ایسا ہی واقعہ انسانوں میں بھی رونما ہوتا ہے جب اسلام کی بشاشت ان کے نفوس سے یکجا ہوتی ہے، جب انسانی نفوس توحید سے آشنا ہوتے ہیں اور جب لا الہ الا اللہ کے ساتھ ایمان لے آتے ہیں...... نفس کے بے ربط اور بے سمت عنصر مجتمع ہو جاتے ہیں اور انتشار سے نجات پا کر یکسو اور یک سمت ہو جاتے ہیں۔

مگر، ذرا ایک لمحہ رک کر ذرا یہ بھی دیکھ لیں کہ یہ 'انتشار' نفوس میں کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟ کیا نفس انسانی طبعاً ایسی ہے یا یہ، جب یہ کسی نگہداشت اور ہدایت و راہنمائی کے بغیر چھوڑ دی جائے، تب ایسی ہو جاتی ہے، جب انسان اپنے نفس کو وہ پاکیزگی (تزکیہ) دینے میں غفلت برتتا ہے؟

**قد افلح من زکاھا و قد خاب من دساھا** (الشمس:۱۰)

"کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کیا اور نا کام ہوا وہ جس نے اس کو خاک آلود کیا"۔

تب وہ انتشار پیدا ہوتا ہے جو مختلف معبودوں کے بیک وقت پیچھے چلنے سے جنم پاتا ہے...... یہ انتشار مختلف شہوات کے دباؤ سے وجود میں آتا ہے...... زندگی میں ایک متعین ہدف اختیار نہ کئے جانے کا نتیجہ ہوتا ہے...... یہ تین اسباب ___ کم از کم ___ ضرور ایسے ہیں جو انسانی نفوس میں انتشار کو جنم دیتے ہیں۔ پھر جونہی ایمان آتا ہے تو انتشار کے یہ اسباب عنقا ہونے لگتے ہیں۔ تب نفس انسانی اس انتشار سے سمٹ کر اور اس بے حالی سے نجات پا کر مجتمع ہوتی ہے اور اس کی ہستی ایک خاص ترتیب اور خاص حالت میں آجاتی ہے۔ تب یہ ایک زوردار قوت کی صورت دھار لیتی ہے۔ اب یہ خود حرکت کرتی ہے اور دوسروں کو حرکت دے سکتی ہے۔

عرب جاہلیت کا ایک انسان مختلف خداؤں کو پوجتا تھا جن میں سے کچھ تو ظاہر تھے جیسے کہ بت اور کچھ پوشیدہ تھے مثلاً قبیلہ اور باپ دادا کا راستہ......

جہاں تک بتوں کا معاملہ ہے تو وہ تو زبان زدعام ہے۔ یہاں تک کہ بادی النظر یہی لگتا ہے کہ شاید یہی بس وہ معبود تھے جو عرب جاہلیت میں خدا کے سوا پوجے جایا کرتے تھے مگر بغور دیکھنے والا یہ ادراک کئے بغیر نہیں رہتا کہ محض لکڑی پتھر کے بت ہی وہ معبود نہ تھے جو خدا کو چھوڑ کر پوجے جاتے تھے۔ مثلاً ایک جاہلی شاعر (درید بن الصمۃ) کا یہ قول دیکھ لیں۔

وھل انا الا من غزیۃ ان غوت غویت وان ترشد أرشد

"میں (قبیلہ) غزیہ کا ایک حصہ ہی تو ہوں......وہ اگر ضلالت اختیار کرے تو میں ضلالت اختیار کروں گا اور اگر وہ راستی اختیار کرے تو میں راستی اختیار کرلوں گا"۔

'پیروکاری' میں پرستش اگر یہ نہیں تو پھر کیا ہے؟ آدمی جانتا ہے کہ اس کا قبیلہ گمراہی اور گم گشتگی پر ہے پھر یہ جانتے بوجھتے ہوئے اسی کی راہ اختیار کرتا ہے کیونکہ اس کے محسوسات میں وہ معبود کا درجہ رکھتا ہے جس کی کسی صورت مخالفت نہیں ہوسکتی۔ حق کا معاملہ ہو تب اور گمراہی کا معاملہ ہو تب۔

'باپ دادا کا راستہ' الگ سے ایک معبود تھا جس کی خدا کے سوا باقاعدہ پرستش ہوتی تھی۔

| | |
|---|---|
| وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللّهُ قَالُواْ بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لاَ يَعْقِلُونَ شَيْئاً وَلاَ يَهْتَدُونَ (البقرہ:۱۷۰) | ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو شریعت نازل کی ہے اس کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہ راست نہ پائی ہو تو کیا تب بھی......؟ |

یہ باپ دادا کا راستہ ہی ہے جو ابو طالب کو اسلام قبول کرنے سے روک رکھتا ہے ___ باوجود اس کے کہ وہ اپنے بھتیجے ﷺ سے محبت کرتا ہے، اس کی دیکھ بھال اور اس کا ازحد خیال رکھتا ہے اور کفار قریش سے ان کی حفاظت کرتا ہے ___ محض اس ڈر سے کہ کہیں یہ نہ کہا جانے لگے کہ اس نے باپ دادا کی راہ ترک کردی۔ اس پرستش سے بڑھ کر کیا پرستش ہوگی؟

جہاں تک دور حاضر کی جاہلیت میں رہنے والے ایک انسان کا تعلق ہے تو وہ البتہ جن معبودوں کو پوجتا ہے انکی تعداد بھی زیادہ ہے اور وہ مخفیت میں بھی عرب جاہلیت کے معبودوں کی نسبت بڑھ کر ہیں۔ 'قومیت' یا 'قومی مصلحت' پرانی عرب جاہلیت میں پائے جانے والے 'قبیلے' کا نیا متبادل ہے جو کہ اس سے بڑا بھی ہے اور اس سے خطرناک تر بھی۔ لوگوں کے ذہنوں پر اس کا نظریاتی تسلط بھی 'قبیلے' سے بڑھ کر ہے۔ 'عالمی رائے عامہ' آج 'باپ دادا کے راستے' کا متبادل ہے جو کہ اس سے بڑا بھی ہے اور اس سے خطرناک تر بھی۔ اور یہ دنیا کے کمزوروں اور بے خانماؤں کو اور سے اور بدحال کرنے میں بھی اس سے بدتر تاثیر رکھتا ہے۔ جبکہ یہ کچھ شیاطین کے ہاتھ کی کاریگری ہوتی ہے جو آج پوری زمین پر فرمانروائی کررہے ہیں خواہ وہ پس پردہ فرمانروائی ہو یا کھلی کھلی دھونس۔

پھر اسی طرح 'ترقی' ایک معبود ہے..... 'سائنس' ایک معبود کا درجہ رکھتی ہے..... سیکولرازم معبود ہے..... 'پیداوار' معبود ہے..... 'شخصی آزادی' معبود ہے..... خواہشات وشہوات جس طرح آج معبود بنی ہیں اس کی تو بھلا بات ہی چھوڑ دیجئے!

یہ پہلے بھی ___ خدا کو چھوڑ کر ___ پوجی جایا کرتی تھیں اور آج بھی یہ باقاعدہ معبود کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان خداؤں کا شمار تک ممکن نہیں۔ یہ وہ معبود ہیں جو اپنے پجاریوں کو ہمیشہ برباد کرتے ہیں اور ان کو تباہی کے دہانے پر پہنچا کر آتے ہیں......

یہ خواہشات اپنی طبعی حیثیت میں انسانی فطرت ہی کا ایک جزو ہیں۔ یہ دراصل نفس انسانی کی ایک ناگزیر غذا ہیں۔ یہ اس لئے ہیں کہ زمین کی تعمیر وآبادی کے عمل میں انسان ایک طبعی نشاط پائے، جبکہ یہ زمین کی تعمیر وآبادی اس مشن کا ایک حصہ ہے جو خلافت سے موسوم ہے اور جو کہ انسان کی تخلیق کا عنوان بنا تھا:

| | |
|---|---|
| وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (البقرۃ: ٣٠) | جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا: میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں |
| هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا (هود:٦١) | وہی ہے جس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اسی زمین میں اس نے تمہاری آبادی چاہی |
| زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ (آل عمران:١٤) | لوگوں کے لئے مرغوبات نفس ___ عورتیں، اولاد، سونے، چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں ___ بڑی خوش نما بنا دی گئی ہیں۔ یہ دُنیا کی چندروزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے |

مگر جس طرح یہ ایک اچھی اور مفید غذا ہیں اسی طرح یہ زہر قاتل بھی بن جاتی ہیں جب یہ اپنی حد سے تجاوز کر جائیں۔ اس کا معاملہ بالکل جسم کی غذا ہی کی مانند ہے۔ جسم کو اپنا طبعی نشاط برقرار رکھنے کیلئے ایک خاص مقدار میں لحمیات، نشاستہ، نمکیات اور ویٹامینوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ ان میں سے کسی چیز کی مقدار بے انتہا بڑھا دیں تو وہ جسم کے وظائف میں نشاط کے بجائے الٹا خلل لے آنے کا باعث بنتا ہے۔ تب یہ غذا غذا نہیں رہتی۔ تب یہ انسان میں وہ فطری نشاط لے آنے پر قدرت

نہیں رکھتی جس کا استعمال ہونا جسم میں ضروری ہوتا ہے۔ اب یہ امراض کا سبب بنتی ہے۔ یہی حال نفس کا ہے۔ نفس کو ان خواہشات اور 'محرکات' کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس میں وہ طبعی حرکت جنم پائے جس کی اس دُنیا میں بہرحال ضرورت ہے۔ مگر نفس جب ان خواہشات وشہوات کو اپنی خدمت میں لانے کی بجائے خود اس کی خدمت میں لگ جاتی ہے ___ اور وہ اس لئے کہ ان کی دل کشی بے انتہا زیادہ ہے اور نفس میں ان کو اور سے اور لینے کیلئے طلب بڑھ جاتی ہے۔ تب نفس کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ نفس فساد کا شکار ہوتی ہے اور اپنے صحت مند نشاط کی ادائیگی سے عاجز آتی ہے۔ بے شک وہ الٹے الٹے قسم کے نشاط میں مگن بھی رہے۔ جیسا کہ جسم کا ایک صحت مند خلیہ سرطان کا شکار ہوتا ہے تو وہ عمل اور نشاط تو کر رہا ہوتا ہے مگر یہ ایسا نشاط ہوتا ہے جو تباہی لے آنے والا ہو۔

چنانچہ یہاں سے 'آزمائش' کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ 'آزمائش' انسان کی پیدائش کے اہداف میں سے ایک باقاعدہ ہدف ہے:

| | |
|---|---|
| إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعاً بَصِيراً (الانسان: ۲) | ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کیلئے ہم نے اُسے دیکھنے اور سننے والا بنایا |
| إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً (الکهف: ۷) | روئے زمین پر جو کچھ ہے ہم نے اسے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں سے کون عمدہ تر عمل کرتا ہے |

چنانچہ یہ 'آزمائش' کا تصور اس سوال کی بنیاد بنتا ہے کہ انسان اس متاع ارضی کی کیونکر اور کہاں تک کھپت کرے......کیا یہ ان حدوں پر رک جائے جو خدا نے مقرر کر دی ہیں اور جن کا پابند رہنے میں خواہشات وشہوات کی ضرر رسانی نہیں رہتی ___ کہ وہ لطیف اور خبیر ہے اور اپنی مخلوق اور اس کی ضرورت کو خوب جانتا ہے اور ہر اس بات سے باخبر ہے جو انسان کو فائدہ دے اور درست رکھے ___ یا پھر وہ اسراف کرے اور ان حدوں کو پھلانگ جائے؟ اور تب یہ متاع ارضی زہر بننے لگے جو فائدے سے زیادہ نقصان کا باعث بنے بلکہ فائدے کے بجائے نقصان ہی نقصان دے؟

| | |
|---|---|
| أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (الملك: ١٤) | کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے۔ وہ تو بار یک بیں اور حد درجہ باخبر ہے |
| تِلْكَ حُدُودُ اللهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا (البقرة: ٢٢٩) | یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے ہرگز تجاوز نہ کرو |

تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا (البقرة:۱۸۷) یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، ان کے قریب نہ پھٹکنا

عرب جاہلیت کے دور کا انسان بھی شہوات وخواہشات میں غرق تھا۔ جہاں تک اس کا سماج اسے اجازت دے اور جہاں تک اس کی معاشی حالت اجازت دے وہ خواہشات سے جس حد تک لد سکتا ہو لد جائے اور جی بھر کر مزے کرے، اس میں اس کو کوئی بھی خرابی نظر نہ آتی تھی۔ بلکہ یہ اس کے لئے ایک فخر اور اعزاز کی بات تھی اور اس کو وہ اچھے سے اچھے پیرائے میں ذکر کرتا تھا۔

جاہلیت کا ایک عرب شاعر شراب اور شباب اور خونریزی سے لطف لینے پر فخر کرتا ہے اور برملا کہتا ہے کہ اگر یہ تین چیزیں نہ ہوں تو زندگی میں لطف ہی کیا۔ بلکہ ملامت کرنے والوں سے گویا ہوتا ہے:

**ألا أیھذ اللائمی أحضرا لوغی ...... و أن أشھد اللذات ھل انت مخلدی؟**

”اے او ناصح! مجھے ملامت کرتا ہے کہ میں معرکۂ خونریزی میں پڑتا ہوں اور لطف وسرود میں شریک ہوتا ہوں۔ میں ایسا نہ کروں تو کیا تم مجھے خلود بخش دو گے؟“۔

چنانچہ جب اس دُنیا کی زندگی میں خلود اور ہمیشگی پانا ناممکن ہے تو جاہلی 'منطق' یہ کہتی ہے کہ خواہشات وشہوات سے انسان جس قدر جی بھر سکے بھر لے۔ کیونکہ یہ بس ایک ہی موقع ہے۔ گیا تو پھر نہ آئے گا!

رہا معاصر جاہلیت کا انسان تو اس کی زندگی میں بھی اصل یہ ہے کہ انسان بس خواہشات وشہوات کیلئے جئے۔ وہ کوئی کام اور محنت کرتا ہے تو اس لئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایسے وسائل کا مالک بنے جو اس کی 'لذت' پوری کروائیں۔ اس کی شہوت اقتدار ہے تو وہ اس کے حصول میں دن رات ایک کر رہا ہے۔ قوت اور اثر ورسوخ ہے تو صبح شام اس کے تعاقب میں بھاگتا ہے۔ اس کی شہوت جنس ہے یا جسم کا لطف ہے ___ اور جس کا باؤلا پن آج کی جاہلیت نے ہر شخص میں پیدا کر رکھا ہے نہ اس سے کوئی بچہ محفوظ ہے اور نہ بڑا۔ نہ مرد بچا ہے اور نہ عورت ___ تو اس کا بہتر سے بہتر حصول یقینی بنانے میں ہر شخص سرگرم عمل ہے۔

جہاں تک مقصد کا تعلق ہے تو اس جاہلیت کے پاس کوئی ایسا مقصد نہیں جو اس حیات دنیوی سے اور اس میں پائے جاسکنے والے لطف ولذت سے بڑا ہو۔

| | |
|---|---|
| وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ (الجاثية: ٢٤) | یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی ہماری دُنیا کی زندگی ہے۔ یہی ہمارا مرنا اور جینا ہے اور گردش ایام کے علاوہ کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو |
| إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ (المؤمنون: ٣٧) | زندگی کچھ نہیں ہے مگر بس یہی دُنیا کی زندگی۔ یہیں ہم کو مرنا اور جینا ہے اور ہم ہرگز اُٹھائے جانے والے نہیں ہیں |
| فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّى عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ذَلِكَ مَبْلَغُهُم مِّنَ الْعِلْمِ (النجم: ٢٩: ٣٠) | اے نبی آپ اس شخص سے رخ پھیر لیں جس نے ہماری یاد سے منہ موڑ رکھا ہے اور دُنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے۔ ان کے علم کی انتہا بس یہی (دُنیا) ہے |
| يَعْلَمُونَ ظَاهِراً مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ (الروم: ٧) | لوگ دُنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں |

انسان جب اس حیات فانی میں مگن ہو جاتا ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے اور حقیر اہداف تک محدود ہو رہتا ہے ___ چاہے وہ اہداف اسے کتنے ہی عظیم نظر کیوں نہ آئیں ___ تو وہ اپنی ہستی کا ایک بڑا حصہ کھو دیتا ہے۔ خدا نے جس معیار کی یہ مخلوق بنائی اس کا بڑا حصہ اس کے ہاتھ سے چلا جاتا ہے۔ خدا نے اس کو تخلیق کیا تو ایک مشت خاک سے وجود دیا پھر اپنے ہاں سے روح کی ایک پھونک اس میں ڈال دی۔ انسان جب اس دُنیائے فانی کا ہو جاتا ہے تو اس بلندی اور عظمت سے گر جاتا ہے جو کہ انسان کی ہستی کا اصل مقام ہے۔

| | |
|---|---|
| إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَراً مِن طِينٍ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ (ص: ٧١-٧٢) | جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا: میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ |

پھر جہاں تک عرب جاہلیت کے انسان کا تعلق تھا تو اس کا کل ھمّ وغم اس کا قبیلہ تھا اور اس کے گرد گھومنے والے حالات و واقعات اور اخبار وآراء۔ اسی وجہ سے نام ونسب کی حفاظت ہوتی تھی۔ آباؤ واجداد پر فخر ہوتا۔ دوسروں کی ہجو ہوتی۔ رزم ومعرکہ کے تذکرے ہوتے۔ پلٹنے جھپٹنے کی داستانیں سنی جاتیں۔ عرب کے انسان کی کل دُنیا اس کا یہی قبیلہ تھا۔ اس کو اسی میں رہنا اور اسی کیلئے رہنا تھا۔ یہی ان کے شعراء کی جولانی طبع کا موضوع تھا۔ یہی ان کی بیٹھکوں اور چوپالوں کی گفتگو تھی اور یہی ان میں آپس کی مقابلہ بازی کا اصل میدان تھا...... اسی کے ساتھ ان کی وہ دوڑ شامل ہو جاتی تھی جو وہ کثرت اموال واولاد کیلئے اور شہوت وخواہشات سے جی بھر کر اور ایک دوسرے سے بڑھ کر حظ پانے کیلئے کیا کرتے تھے۔

جہاں تک معاصر جاہلیت کے انسان کا تعلق ہے تو وہ اس سے بھی کہیں گم گشتہ راہ ہے اور اس حیات فانی اور اس کی حسی لذت کے اندر محدود ہونے میں اور پاکیزہ قدروں سے دوری میں اور زندگی بلند و پاکیزہ مقاصد سے برگشتہ ہونے میں یہ اس سے بھی بڑھ کر ہے جس میں عرب جاہلیت کا انسان گرفتار تھا۔ آج کا انسان صرف حسی لذت کا طلبگار ہے اور بس اسی پر فریفتہ ہے۔ اور چونکہ آج کی جاہلیت کے صورت گر اپنے دور کے انسان کو ہر پاکیزہ قدر اور ہر بلند مقصد سے دور رکھنے پر حریص ہیں لہٰذا وہ اپنا تمام زور اس بات پر صرف کر چکے ہیں کہ اس حیات فانی کو آرائش وزیبائش سے بھر دیں اور گھٹیا متاعِ ارضی اور لذتِ وقتی کو حد سے زیادہ مزین اور دلفریب بنا دیں اور اس کیلئے ایسے ایسے وسائل اور ذرائع اختیار کریں جو ایک معقول انسان کے سان گمان تک میں نہ آ سکیں۔

ہر جاہلیت میں، خواہ وہ نئی ہو کہ پرانی، انسان جب اسی دُنیا کی زندگی کو تخیل کی انتہا جان بیٹھتا ہے اور کسی اور زندگی میں اور مر کر اٹھائے جانے میں اور حساب اور جزا میں یقین نہیں رکھتا...... تب یہ زندگی اس کی نگاہ میں ایک بے ہودہ اور لغو چیز بن جاتی ہے جس کا کوئی مقصد ہے اور نہ معنی۔ کسی قدر اور کسی معیار کی اس میں کوئی وقعت اور کوئی قیمت نہیں رہ جاتی۔ کسی چیز کی کوئی قیمت ہے تو بس اسی حد تک جس حد تک یہ انسان کی اس شہوت اور اس مفاد کو پورا کرے جو اس کی اس مختصر اور محدود عمر میں اس کو پیش آئے۔ اس 'انسان' کو حیرت اور سرگردانی ہر طرف سے گھیر کر رکھتی ہے اور جاہلی انسان کی یہ خاصیت سب سے نمایاں ہو جاتی ہے۔ موجودہ دور کا ایک جاہلی شاعر ایلیا ابو ماضی اپنے ان اشعار میں جاہلی انسان کی اسی کیفیت کو نمایاں کرتا ہے:

جئت لا اعلم من اين ولكنى اَتيت!
ولقد أبصرت قدامى طريقاً فمشيت!
وسأبقىٰ ما شيا ان شئت هذا اَو أبيت
كيف جئت؟ كيف أبصرت طريقي؟ لست أدرى!

"میں آیا ہوں۔ کہاں سے، نہیں معلوم بس میں آ گیا ہوں۔
میں نے اپنے آگے چلنے کیلئے راستہ پایا تو چلنے لگا ہوں۔
میں اس پر چلتا رہوں گا اگر چاہوں تب بھی اور اگر نہ چاہوں تب بھی۔

میں کیونکر آیا؟ میں نے کیونکر اپنا یہ راستہ پایا؟ کیا معلوم!''

یہی وجہ ہے کہ 'شراب' ہمیشہ ایک جاہلی انسان کی ضرورت رہی ہے۔ کیونکہ یہ زندگی سے وابستہ مقصدیت کے احساس سے فرار کا ایک ذریعہ ہے۔ زندگی کے عبث اور بے مقصد ہونے کا احساس نفس پر بہرحال گراں ہوتا ہے۔ لوگ 'کھیل تماشے' میں بھی اسی لئے غرق رہتے ہیں کیونکہ یہ 'وقت گزارنے' کا ایک ذریعہ ہے۔ وگرنہ 'وقت' بہت ہی گراں گزرتا ہے۔ لوگ جب اپنی سعیِ روزگار سے اور کمائی کی کشمکش سے فارغ ہوں تو وقت گزارنا ایک سوال بن جاتا ہے۔

عرب جاہلیت میں شراب، مجالس ناؤ نوش اور جوا وغیرہ اس 'فرار' کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ آج کی جاہلیت میں شراب کے ساتھ منشیات بھی شامل ہوگئی ہیں۔ رقص وسرود کے تھیٹر، کھیل تماشے اور دل کے بہلاوے کے طرح طرح کے انتظام، جوا خانے...... پھر جب اس 'بے کار و بے مقصد زندگی' سے فرار کسی اور طریقے سے ممکن نہ ہو تو اب یہاں نفسیاتی اضطراب ہے، اعصابی امراض ہیں، قسم ہا قسم کا جنون ہے۔ کچھ بھی کارگر نہ ہو تو پھر خودکشی!

☆☆☆☆☆☆

یہ سب اسباب ہیں جو اس انتشار کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں جو جاہلیت میں نفسِ انسانی پر حاوی ہوا رہتا ہے۔ پھر جب ایمان آتا ہے تو نفس کو اس انتشار سے نجات ملتی ہے اور وہ مجتمع اور یکسو ہو جاتی ہے۔

ایمان کا بنیادی مفہوم ہے: کہ اس بات کا اعتقاد اور یقین پیدا کیا جائے کہ بس ایک ہی معبود ہے جو تنہا عبادت کے لائق ہے اس کے سوا کوئی پرستش کے لائق نہیں، اور یہ کہ اس کے سوا سب معبود، اللہ کے سوا پوجے جانے والے سب خدا نرے بے حقیقت ہیں۔ ان کا وجود ان کے پجاریوں کے تخیلات کے سوا کہیں نہیں اور یہ باطل تخیلات حق سے ہرگز کفایت نہیں کرتے...... جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی معبود کی عبادت برحق نہیں سوائے ایک اللہ کے کیونکہ اس کے سوا درحقیقت کوئی لائق بندگی نہیں۔ سو عبادت اور پرستش کا ہر وہ عمل جو اس کے سوا کسی اور ذات کیلئے ہو، سرے سے باطل اور سراسر غلط ہے کیونکہ یہ ایک ایسی ذات کیلئے ہوا ہے جس کا درحقیقت الوہیت پر کوئی حق ہے ہی نہیں...... علاوہ ازیں اس سے مراد یہ ہوگی کہ آدمی اپنے آپ کو ہر اس بات کا پابند کرے جو خدا کے ہاں سے آئی ہوگی

کیونکہ اس امر کا تصور ممکن ہی نہیں کہ معبود حقیقی وہ ہو یعنی عبادت پر تنہا حق اسی کا ہو مگر اس کی نافرمانی ہو اور اس کے سوا کسی اور کی اطاعت ہوتی ہو! انجام کار اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا ہی وہ واحد ذات ہے جو انسانوں کو قانون اور شریعت صادر کرے۔ وہی ہے جو حلال اور حرام کا تعین کرے۔ وہی ہے جو اشیاء کے حسن وقبح کی تحدید کرے۔ وہی ہے جو جائز وناجائز کا تقرر کرے۔ وہی ہے جو ان حدوں کا تعین کرے جن کے اندر رہتے ہوئے انسان کو متاع زندگانی سے حظ اٹھانا ہے۔ وہی ہے جو انسانوں کیلئے زندگی کا منہج اور طرز عمل طے کرے اور ان کے یہاں زندہ رہنے کیلئے اہداف مقرر کرے۔

اس ایمان کی شان یہ ہے کہ یہ 'انتشار' کے اسباب میں سے کوئی ایسا سبب باقی نہ رہنے دے جو نفس انسانی کو بے سمت کر دینے کا باعث ہو......

جب انسان کا معبود بس ایک ہی ذات ہو جاتی ہے تو پھر اس کے لاشعور اور اس کے احساسات میں ان باطل اور من گھڑت خداؤں کی موت واقع ہو جاتی ہے جن میں سے ایک ایک کے پیچھے اس نفس کو بھاگنا پڑتا ہے اور اس کے باعث سو سو حصوں میں تقسیم ہونا پڑتا ہے۔ ہر معبود کے اپنے مطالبے اور اپنے تقاضے ہیں۔ ہر معبود کے خوش کرنے کو ایک خاص جہت میں چلنا پڑتا ہے۔ یہ جہتیں باہم متعارض رہتی ہیں۔ ان معبودوں کے مابین نفس انسانی بار بار بٹتی اور حصوں بخروں میں منقسم ہوتی ہے۔ ہر معبود کو، اس نفس پر خدائی کرنے کو، کسی دوسرے معبود کو ہٹا کر اس کی جگہ لینی پڑتی ہے۔ اس کھینچا تانی میں 'انسان' کا ستیاناس ہو جاتا ہے:

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلاً رَّجُلاً فِيهِ شُرَكَاء مُتَشَاكِسُونَ وَرَجُلاً سَلَماً لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلاً الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (الزمر: ۲۹)

اللہ ایک مثال دیتا ہے۔ ایک شخص تو وہ ہے جس کی ملکیت میں بہت سے کج مزاج آقا شریک ہیں جو اسے اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دوسرا شخص پورا کا پورا ایک ہی آقا کا غلام ہے۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہوسکتا ہے؟ الحمدللہ بات یہ ہے کہ ان میں کے اکثر لوگ سمجھتے نہیں

مگر جب معبود ایک ہو جاتا ہے اور انسان کے سب پہلو اور سب گوشے اسی کی بندگی میں یکجا ہوتے ہیں تو خواہشات ان طبعی حدود کی پابندی اختیار کر لیتی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کمال حکمت سے متعین فرما دی ہیں۔ تب یہ نفس کیلئے صالح غذا بنتی ہیں۔ نہ پھر یہ زہرِ مہلک ہوتی ہیں اور نہ انسان کے ہم وغم کا کلی سبب اور اس کی تمام تر توجہ کا محور بنتی ہیں جیسا کہ ایک غیر اللہ کے پجاری کے ساتھ ہوتا ہے جو کھڑا اور بیٹھا خواہشات کی تسکین کیلئے پریشان رہتا ہے۔ نہ کبھی سیر ہوتا ہے نہ مطمئن۔ نہ پیاس بجھتی ہے اور ہوس مٹتی

ہے۔ نفس کو اس مشقت سے آرام پانے کی کبھی فرصت ہی نہیں ملتی......

جب معبود ایک ہوتا ہے اور نفس اس کی بندگی پر مجتمع اور یکسو ہوتی ہے تو وہ ہدف بھی علی وجہ البصیرت متعین ہو جاتا ہے جو اس کے درون میں سب اہداف کو ایک ترتیب دے دے۔ جب انسان ایک اور زندگی پانے اور مر کر اُٹھنے اور حساب و جزا کیلئے پیش ہونے پر یقین کرتا ہے تو ان قدروں اور معیاروں کا تعین ہونے لگتا ہے جو زندگی میں پاکیزہ اور بلند اہداف کو وجود دینے کا سبب بنتے ہیں اور زندگی کے بے مقصد اور عبث ہونے کے تصور کو مٹاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

یہ شان اگر ان اصولوں کی ہے جنہیں معاشرے پر اثر انداز ہونے والی بنیادی جمعیت کو وجود دینا تھا تو تعظیم کے چند کلمات ہمیں مربی ﷺ کی شان میں بھی کہنے ہیں جنہوں نے ان اصولوں پر ایک جمعیت کھڑی کی اور جو کہ تاریخ انسانی کے عظیم ترین مربی ہیں۔ باوجود اس کے کہ ان کلمات میں یا کسی بھی انداز کے کلمات میں ہم آپ ﷺ کا حق ادا نہ کر پائیں گے۔ اس مربی ﷺ کیلئے خدا کی اپنی شہادت ہی کافی ہو سکتی ہے جو کہ ہر نعمت اور فضل کا بخشندہ ہے:

وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ (القلم:٤) اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو

ہم اس جمعیت سے ہرگز شناسائی نہ پا سکیں گے جب تک ہم اس عظیم الشان تاثیر کا ہی کچھ نہ کچھ ادراک نہ کر لیں جو رسول اللہ ﷺ کے بنفس نفیس وجود نے صحابہؓ کے اندر برپا کر دی تھی۔

پیروکار ہمیشہ اپنے قائد کی صفات کے ہی خوشہ چین ہوا کرتے ہیں جس کے پیچھے ان کی وہ اتھاہ محبت ہوتی ہے جو ان میں اپنے قائد کیلئے موجزن ہو۔ یہ اس کی صحبت کا فیض ہوتا ہے جو ان کو خوش قسمتی سے مل جاتا ہے۔ اپنے قائد کی صفات کا انعکاس اور اس کی شخصیت کا پرتو بننا، یہ بسا اوقات لاشعوری طور پر بھی ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ قائد کی شخصیت سے متاثر ہونا خود بخود اس بات کا سبب بنتا ہے کہ اس جیسا بننے کی کوشش کرنے پر پیروکار اپنے آپ کو مجبور پائیں۔ اس جیسے اعمال، اس جیسے اقوال، اس جیسے مواقف، اسی سے ملتے جلتے تصرفات انسان کی مجبوری بن جاتے ہیں بشرطیکہ وہ واقعتاً اس سے متاثر ہو چکا ہو۔ واقعتاً یہ صحابہؓ کے ساتھ ہوا بھی جب ان کی محبت اپنے نبی ﷺ کیلئے ہر محبت پر سبقت لے گئی اور نبی ﷺ کیلئے ان کی تعظیم و توقیر ہر ایسے قائد کی تعظیم و توقیر سے بڑھ گئی جس نے تاریخ انسانی میں کبھی کچھ پیروکار

رکھے ہوں۔ تب اتباع کے زبردست واقعات بھی جنم پانے لگے۔

ہرقل نے ابوسفیان سے، جبکہ ابھی وہ اسلام نہ لائے تھے، سوال کیا کہ وہ اہل ایمان کا نبی ﷺ کے ساتھ آنکھوں دیکھا حال بیان کریں۔ تب ابوسفیان نے جواب دیا: میں نے لوگوں میں سے کبھی کسی کو کسی سے ویسے محبت کرتے نہیں دیکھا جس طرح اصحاب محمدؐ، محمد ﷺ کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔

مگر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپؐ کے اصحاب کا معاملہ محض اس بات تک محدود نہ تھا کہ وہ لاشعوری طور پر ہی آپؐ سے متاثر ہوں۔ یہ ایک حد درجہ شعوری عمل بھی تھا۔ آپؐ سے محبت کرنا اور آپؐ کی گرویدگی اختیار کرنا ان لوگوں کیلئے خدا کا باقاعدہ حکم تھا جو خدا کے ساتھ ایمان لائیں اور اپنا چہرہ خدا کو سونپ دیں۔ خود رسول اللہ ﷺ کی یہی ہدایت تھی۔

| | |
|---|---|
| لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيراً (الاحزاب:۲۱) | درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے |
| وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا (الحشر:۷) | رسول تم کو جو دے وہ لے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے |
| مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ الْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا عَن رَّسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِ (التوبة:۱۲۰) | مدینہ کے رہنے والوں کو اور ان کے گردونواح کے اعراب کو یہ ہرگز زیبا نہ تھا کہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہتے اور اس کی طرف سے بے پروا ہو کر اپنے اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے |
| يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُم لِمَا يُحْيِيكُمْ (الانفال:۲٤) | اے ایمان والو، اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہو جبکہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے |
| لا يؤمن احدكم حتى اكون احب اليه من نفسه وماله وولده (اخرجه الشيخان) | تم میں سے کوئی شخص ایمان والا نہیں جب تک کہ میں اس کو اس کے اپنے آپ سے، اس کے مال اور اس کی اولاد سے زیادہ عزیز نہیں ہوتا |

صلوا کمارأیتمونی أصلی — نماز پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتا دیکھتے ہو

(اخرجہ البخاری)

خذوا عنی مناسککم(اخرجہ مسلم) — مناسب حج مجھ سے سیکھو

یہ اس وجہ سے کہ آپ ؐ محض ایک لیڈر نہیں جسے انسانوں کی ایک جماعت کی قیادت کرنا ہے۔ بلکہ آپ نبیؐ ہیں جسے اپنے رب کا پیغام پہنچانا ہے اور لوگوں کیلئے جو نازل ہوا ان کو اس کا بیان کر کے دینا ہے۔ چنانچہ آپؐ کی اطاعت خدا کا حکم ہے لہٰذا آپؐ کی اطاعت باقاعدہ طور پر خدا کی عبادت ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (النساء:۵۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اسکے رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقہ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے

مَّن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ — جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی

(النساء:۸۰)

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کیلئے آپ کے پیروکاروں میں یہ دونوں باتیں مجتمع ہو گئیں۔ ایک ایسی اتھاہ محبت اور گرویدگی جو ہر رشتے اور ہر تعلق پر بھاری پڑ جائے اور آپؐ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا ایسا التزام جسے محض خدا کی عبادت سمجھ کر کیا جائے۔ چنانچہ آپؐ کو وہ مقام حاصل تھا جہاں اصحاب آپؐ سے ایک فطری اور بے ساختہ انداز میں اور بے پناہ حد تک متاثر تھے اور آپؐ کے اس قدر گرویدہ اور آپؐ پر اس قدر فریفتہ تھے کہ جس کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں پائی جا سکتی......ایک منفرد ترین شخصیت کا نفوس پر اثر انداز ہونا اور کچھ منفرد ترین اصولوں کا ان نفوس پر اثر انداز ہونا...... یہ دونوں کام بیک وقت ہونے لگے تھے......

جہاں تک ان اصولوں کا تعلق ہے تو اس پر ابھی پیچھے ہم اجمالاً کچھ بات کر آئے ہیں اور تفصیل کے ساتھ اس پر ہم آگے چل کر بات کریں گے۔

جہاں تک رسول اللہ ﷺ کی اس شخصیت کا تعلق ہے جو اس تبدیلی کا محرک بنی تو یہاں اس مقام پر ہم اتنا ہی کہہ پائیں گے کہ:

یہ ایک جامع ترین شخصیت تھی۔ یہاں تک کہ جو پچھلے رسولوں میں سے ایک ایک کی شخصیت میں متفرق طور پر ملتا ہے وہ سب کچھ آپؐ کی ایک ہی شخصیت میں اکٹھا ہو گیا تھا: عیسیٰ علیہ السلام کی روحانیت، نوح علیہ السلام کا صبر، موسیٰ علیہ السلام کی قوت فیصلہ وشدت اقدام، ابراہیم علیہ السلام کی رقت قلب...... اور اس کے ساتھ پھر آپ کے اپنے بے شمار فضائل جن میں آپؐ سب سے منفرد ہیں اور جو آپؐ سے پہلے کسی بھی نبی کو حاصل نہ ہوئے...... اس شخصیت میں ایک زیرک اور منفرد ترین سیاسی قائد بھی تھا جو ایک قوم کے بکھرے ہوئے شیرازے کو ایک مختصر سی مدت میں ایک پرچم تلے مجتمع کر دے اور اس کو قوت اور توانائی کے آتش فشاں میں بدل کر رکھ دے اور دُنیا کی ایک پسماندہ ترین قوم کو اقوام عالم میں عظیم ترین منزلت دلوا دے...... اس میں وہ عسکری قائد بھی تھا جو دُنیا کا منفرد ترین لشکر ترتیب دے اور اس کے اندر جرأت و بسالت، جوانمردی اور جفاکشی کی وہ روح پھونک دے جو اس کو دنیا کی بڑی سے بڑی قوت کے ساتھ بھڑوا دے...... اس میں ایک مربی کی شخصیت بھی تھی جو اپنے پیروکاروں کے تزکیہ وتربیت میں کوئی کمی نہ رہنے دے اور ان کو اخلاقی بگاڑ کے پاتال سے اٹھا کر اخلاق کی عظمت کے آسمان تک پہنچا دے...... اس میں ایک عبادت گزار کی شخصیت بھی تھی جس کا ہر لمحہ خدا کے ساتھ گزرتا ہے اور جو اس کی بندگی اور تعظیم کے احساس سے لحظہ بھر غافل نہیں ہوتا اور جو رات کی خاموش ساعتوں میں اور دن کے ہنگاموں میں برابر خدا کی جانب متوجہ رہتا ہے...... اس میں ایک مجاہد شخصیت بھی تھی جو باطل سے ہر لحہ برسرِ پیکار ہے...... یہ ایک مثالی ترین شوہر بھی ہے اور ایک مہربان اور شفیق باپ بھی...... یہ سب کچھ ایک ہی شخصیت میں جمع ہو جاتا ہے اور بڑی بات یہ کہ یہ سب کچھ ایک کمال توازن کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ اس کا ایک پہلو کسی دوسرے پہلو پر حاوی نہیں ہو پاتا۔ کسی ایک پہلو کی سرگرمی کسی دوسرے پہلو کو معطل کرنے کی قیمت پر نہیں ہوتی۔ یہ شخصیت ہر جانب سے ہمہ وقت روشن ہے...... پھر کیا تعجب جو پیروکاروں پر اس شخصیت کی تاثیر ایک ایسی بے مثال تاثیر ہو جو اس سے پہلے نہ تو کوئی نبی اپنی قوم میں برپا کر سکا ہو اور نہ کوئی انسان بشریت کی تاریخ میں۔

☆☆☆☆☆☆

اجمالاً جس طرح ہم نے ان اصولوں اور فکری بنیادوں کی جانب اشارہ کیا جو اس مسلم جمعیت کی تیاری میں کام آئے جسے رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا تھا اور اجمالاً جس طرح ہم نے اس مربی اعظم کی شخصیت کی جانب اشارہ کیا ہے جس نے معاشرے پر، بلکہ تاریخ انسانی پر، اثر انداز ہونے والی یہ منفرد انسانی جمعیت تیار کی...... ویسے ہی چند کلمات اجمالاً ہم ان بندگان خدا کی بابت کہیں گے جن کے کاندھوں نے اسلام کو قائم کرنے کا یہ بار عظیم اٹھایا۔

**اللّٰہ اعلم حیث یجعل رسالتہ** (الانعام:۱۲۴)

''اللہ خوب جانتا ہے وہ اپنی پیغمبری کہاں بھیجے''۔

آخری رسالت کے لئے خدا کا اپنے اس نبیؐ کو منتخب کرنا، اور اس سرزمین کو منتخب کرنا جس سے پوری دنیا میں یہ پیغام پھوٹ کر نکلے، اور اس قوم کو منتخب کرنا جو اس پیغام کو سب سے پہلے وصول کرے...... اس سب کے پیچھے بلاشبہ خدا کی عظیم الشان حکمتیں کارفرما ہیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اپنی آخری رسالت کے لئے اپنا سب سے عظیم پیغمبر ﷺ چنا۔ ایک ایسی سرزمین کا انتخاب کیا جو اس کے علم کی رو سے آخری رسالت کے چہار وانگ پھیل جانے کیلئے مناسب ترین تھی...... ایک ایسی سرزمین جو اپنے دور کی بڑی بڑی سلطنتوں میں سے کسی کی دلچسپی کا مرکز نہ تھی۔ کیونکہ یہ لق ودق صحرا تھا۔ یہاں یہ مسلم جمعیت وجود پاتی ہے اور اپنی جڑیں راسخ کر لیتی ہے بغیر اس کے کہ کوئی بیرونی قوت اس کو دبانے یا اس کی جڑیں کاٹنے یا اس کے کام کو دشوار کر دینے کیلئے ابتدائی طور پر دخل انداز ہو۔ یہاں تک کہ جب ان 'سپر طاقتوں' کو خطرے کا الارم سنتا ہے اور وہ اس سے نمٹنے کیلئے تیار ہوتی ہیں تب تک یہ جمعیت اپنا ابتدائی کام مکمل کر چکی ہوتی ہے۔ اس نے اپنی دولت قائم کر لی ہوتی ہے اور یہ ایک ایسی قوت فراہم کر لیتی ہے جو دشمن کو خوف میں مبتلا کر دے۔

جہاں تک اس سرزمین کے باشندہ انسانوں کا تعلق ہے تو خدا کے علم کی رو سے یہ اس رسالت کا حق ادا کرنے کیلئے اور اس کو آفاق میں نشر کرنے کیلئے مناسب ترین لوگ تھے۔ درست ہے کہ بت پرست تھے...... مشرک تھے...... اڑیل ضدی تھے...... اپنی بات چھوڑنے پر تیار نہ ہوتے تھے...... مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ اپنے دور کی اقوام میں سب سے زیادہ سلیم الفطرت تھے۔ سب اقوام کو جاہلی تہذیبوں نے عیش سامانی کی راہ پر لگا کر اور طرح طرح کی نزاکتیں سکھا کر اور زندگی کے چاؤ دلوا کر بگاڑ دیا

تھا اوران کو کمینگی اور گھٹیا پن قبول کر لینے پر آمادہ کر لیا تھا جیسا کہ جزیرۂ عرب کے دائیں بائیں دونوں عظیم شہنشاہتوں ...... فارس اور روم میں پیش آچکا تھا۔ اور وہ ذلت الگ جو حاکم کے اقتدار کا تقدس مان کر اور اس کے سامنے کمتر اور ذلیل رعایا بن کر قومیں قبول کر چکی تھیں اور جس کے نتیجے میں حکمران آقا بن جاتا تھا اور قوم غلاموں کی تصویر پیش کرتی۔ یہ ایک سرکش آقا اور ذلیل غلام کا تعلق ہوتا تھا۔

عرب جاہلیت نے بھی بلاشبہ عرب مشرکین کے نفوس کو بگاڑا تھا...... مگر جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا یہ بگاڑ نفوس میں بہت نیچے تک نہیں گیا تھا۔ نیچے فطرت کا بہت کچھ ابھی سلامت تھا۔ سو جونہی اس نئے عقیدے نے بگاڑ کی وہ تہہ اوپر سے کھرچ دی تو عقیدہ کی یہ روشنی اس کے اندر جھلکنے لگی...... عقیدہ کی یہ روشنی بہت جلد 'عرب انسان' کے اندر چھپی اس فطرت سے آملی جو دوسری اقوام کی نسبت 'عرب انسان کے اندر' بڑی حد تک بچی رہ گئی تھی...... تب پھر یہ سب عجوبے رونما ہونے لگے!

ان کافروں کو چھوڑ کر، جنہوں نے اپنے کفر پر آخری لمحے تک اصرار کیا اور دیدہ دلیری سے اس دین حق کے خلاف لڑے...... وہ نفوس جنہوں نے اس پیغام کو قبول کیا انہوں نے البتہ اس کو بس یونہی ہی قبول نہ کیا بلکہ کمال خوبصورتی کے ساتھ قبول کیا جس کی کہ تاریخ میں کیا رسولوں کے پیروکاروں میں بھی مثال نہیں ملتی۔ یہ بے انتہا سلیم الفطرت لوگ تھے۔ جاہلیت کا بگاڑ ان کی فطرت کی تہہ میں نہیں بیٹھ سکا تھا۔ دین کیلئے ایسا گہرا اخلاص جوان کے ہاں پایا گیا کبھی کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ دلیری، جانفروشی اور قربانی میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ یہ سب کچھ ان کے سلیم الفطرت ہونے کی دلیل تھا۔

ایک اور عنصر جس کی طرف اشارہ ضروری ہے...... وہ ان کی نقل مکانی کی استعداد تھی اور ان کا سریع الحرکت ہونا۔ یہ ہر نئی جگہ کو اپنا وطن بنا لینے پر قدرت رکھتے تھے۔ ایسے روابط جو انسان کو ایک ہی جگہ کے ساتھ باندھ کر رکھ دیں...... ایسی محبت جو ایک کاشتکار کو اپنی دھرتی سے ہوتی ہے اور جس کے باعث چند قدم دور ہو جانے پر اس کو دیس کی یاد ستانے لگتی ہے...... وہ اس سے کسی حد تک محفوظ تھے۔ ان صفات کے ساتھ پھر جب ان کو اسلام ملا تو وہ زمین میں کچھ اس طرح پھیل گئے کہ اس سے پہلے کسی قوم نے اپنے دین کیلئے کبھی یوں نقل مکانی نہ کی تھی۔ یوں یہ جماعت دنیا میں انسانیت کیلئے ہر طرف نور اور ہدایت پھیلانے کیلئے نکل کھڑی ہوئی۔

☆☆☆☆☆☆

اجمالی طور پر ابھی تک ہم نے ان تین بنیادی عوامل پر گفتگو کی ہے جس نے اس بنیاد کو پختہ کرنے میں اپنا کردار ادا کیا جس پر رسول اللہ ﷺ نے امت اسلام کی ہراول جمعیت تیار کی۔ یعنی:

۱) وہ اصول اور وہ عظیم فکری بنیادیں جن پر اس جمعیت کی تعمیر ہوئی،

۲) بطور مربی رسول اللہ ﷺ کی عظمت

۳) اور فطرت کی وہ سلامتی جو ان لوگوں کے ہاں پائی گئی جنھوں نے اسلام کے ان اصولوں اور ان فکری بنیادوں کو قبول کیا اور اس عظیم ترین مربی کی شخصیت سے متاثر ہونا سیکھا۔

ابھی البتہ ہم نے اس پر بات نہیں کی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیروکاروں کی جو تربیت کی اس کا کیا کردار تھا۔

جہاں تک ان اصولوں اور فکری بنیادوں کا تعلق ہے جن کے بل پر ان لوگوں کی کایا پلٹ گئی تھی تو یہ اصول دستیاب ہو سکتے ہیں، جیسا کہ یہ آج بھی اسی طرح دستیاب ہیں جس طرح کہ یہ اس وقت تھے جب یہ خدا کے ہاں سے نازل ہوئے تھے...... تو یہ اصول بذات خود کچھ نہیں کرتے جب تک کہ ایک مربی ان اصولوں کے بیج اپنے پیروکاروں کے اندر گہرے کر کے نہ بو دے اور ان کی پرورش اور دیکھ بھال کرنے اور ان کو بہترین رخ دینے پر پوری جان نہ کھپا دے۔

ایک مربی بھی پایا جا سکتا ہے مگر وہ اپنی پوری تاثیر نہیں ڈال سکتا جب تک کہ وہ تربیتی عمل کو اپنی پوری توجہ نہ دے۔ لوگوں کا محض اس سے متاثر ہو جانا اس بات کیلئے کافی نہیں کہ ان کے نفوس کی تربیت عمل میں آجائے تاآنکہ مربی ایک باقاعدہ انداز سے ان پر محنت کرنے اور مطلوبہ قدروں اور معیاروں کو ان کے اندر گہرا اتارنے اور فکری بنیادوں کو ان میں راسخ کرنے پر جانفشانی سے کام نہ کرے۔

تربیت کے اسلامی منہج پر اس سے پہلے میں اپنی کسی اور کتاب میں گفتگو کر چکا ہوں۔

یہاں ہم صرف اس پر گفتگو کرنا چاہیں گے کہ ایک ایمانی جمعیت کی تیاری میں تربیت کا کیا کردار ہے کیونکہ ہمیں اپنی آج کی معاصر تحریکوں میں اسی موضوع کی ضرورت درپیش ہے اور تربیت کے کردار اور ضرورت پر گفتگو بہت اہم مواقع پر مفقود پائی جاتی ہے۔

ہم پیچھے کہہ آئے ہیں کہ **لا الہ الا اللہ** پر ایمان لے آنے کا انسانی نفس پر گہرا اثر ہونا ہوتا ہے کیونکہ یہ نفس کے 'ذرات' کو ایک نئی ترتیب دے دینا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے لوہے کے ایک ٹکڑے میں

برقی رو گزرانے سے تبدیلی آجاتی ہے۔ مگر یہ معاملہ ایک زندہ نفس کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ایک ایسی نفس جو اپنے احساسات وجذبات میں، شوق ورغبت رکھنے میں اور جذب وکیف میں پوری طرح زندہ ہو۔ اس معاملے میں اس کو ایک بے جان لوہے کے ٹکڑے کے ساتھ تشبیہ نہیں دی جاسکتی جو کہ اپنی اس حالت کو جس پر کہ وہ پایا جائے ایک طویل زمانے تک برقرار رکھ سکتا ہے۔ بلکہ ایک لوہے کا ٹکڑا بھی باوجود اس کے کہ وہ جذبات واحساسات نہیں رکھتا، اپنی اس حالت کو، جو کہ اس میں برقی رو گزار دینے کے بعد وقوع پذیر ہوتی ہے، ہمیشہ کیلئے برقرار نہیں رکھ سکتا جب تک کہ ایسے تدبیری انتظامات نہ کیے جائیں جو اس کے پھر سے بکھر جانے اور پہلی حالت پر آجانے سے اسے روک کر رکھیں۔

جبکہ نفس انسانی میں اس بات کا امکان کہیں زیادہ ہے کہ وہ ایک حالتِ نو سے برگشتہ ہو کر اپنی پچھلی حالت پر پلٹ آئے۔ اس میں جذبہ وخواہش کے جھونکے اور شوق وانفعال کے طوفان ہر طرف سے اٹھتے ہیں۔ یوں ہر وقت یہ امکان رہتا ہے کہ اس کے عناصر کی ترتیب بدل جاتی رہے اور اس کے 'ذرات' ایک بار ترتیب پالینے کے بعد پھر سے بکھر جائیں جب تک کہ اس کے گرد ایسے حفاظتی انتظامات نہ کر دیے جائیں جو اس کے 'ذرات' کو پھر سے بکھر جانے سے روک رکھیں اور جن میں کہ یہ صلاحیت ہو کہ جونہی اس کے نظام میں کوئی خلل آئے اور اس کے مجتمع عناصر یکسو ہو جانے کے بعد انتشار کا شکار ہونے لگیں تو وہ ان کو پھر سے وہی ترتیب دے دیں۔

پھر جس طرح لوہے کا ایک ٹکڑا مقناطیس ہٹا لینے کے بھی ایک مدت تک اپنی مقناطیسیت کھو نہیں دیتا مگر وہ بتدریج کم ہوتی جاتی ہے، اسی طرح ایک بشری نفس بھی ایمان لے آنے کے بعد 'حفاظتی انتظامات' کے بغیر چھوڑ دیا جائے تو وہ فوراً اپنی ایمانی کیفیت نہیں کھو دیتا مگر وہ بتدریج کم ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ ایمان فعّال نہیں رہتا۔ ایمان پھر اس کو یک سمت اور یکسو نہیں رکھتا۔ یہاں تک کہ گویا عالمِ واقع میں ایمان موجود ہی نہیں...... یہاں جس چیز کی ضرورت سامنے آتی ہے وہ ہے......'ایمان پر تربیت پانا' نہ کہ 'صرف ایمان لے آنا'۔

معاملہ یہ ہے کہ نفسِ انسانی ہر لحہ ایک نئی حالت سے گزرتا ہے اور اس کی ہستی میں بہت سے گرداب آتے اور جاتے ہیں۔ خیالات، افکار، سوچیں اور پھر وہ خواہشات جن کی بابت قرآن نے کہا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ (آل عمران:١٤)

لوگوں کے لئے مرغوبات نفس ___ عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں ___ بڑی خوش نما بنا دی گئی ہیں۔ یہ دُنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان ہے۔ البتہ جو لوٹنے کا بہترین ٹھکانا ہے وہ تو خدا کے پاس ہے

ہم اس سے پہلے یہ کہہ آئے ہیں کہ نفس انسانی کے درون کی ہر دم بدلتی اور آرزو ھا و خواہشات کی زد میں آتی رہنے والی یہ حالت ___ جو کہ بہر حال انسان سے اپنے مطلب کے اعمال اور رویے اختیار کر لینے کی متقاضی رہتی ہے ___ یہی دراصل اس 'آزمائش' کا نقطۂ ابتدا ہے جس کا انسان کو دُنیا کی زندگی زندگی سامنا کئے رہنا ہے۔ اس آزمائش سے ہر نفس کو گزرنا ہوتا ہے اور اس میں پورا اترنے کے معاملے میں ہر نفس دوسرے نفس سے مختلف ثابت ہوتا ہے اور اس کی بابت ہر شخص کا رویہ دوسرے سے جدا ہوتا ہے یوں اس سے گزر کر ہر شخص اپنی آزمائش کروالیتا ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (الكهف:٧)

روئے زمین پر جو کچھ پایا جاتا ہے اس کو ہم نے زمین کی آرائش بنا دیا ہے تاکہ ہم ان کو آزمالیں کہ ان میں سے کون عمدہ عمل کرنے والا ہے

اوپر کی آیت میں ان خواہشات وشہوات کا اجمالاً ذکر کر دیا گیا جو نفس انسانی میں موجزن ہوتی ہیں اور پھر اس کو ایک خاص قسم کے افعال اور رویے اختیار کر لینے پر مجبور کرتی ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ یہ مقام اجمال کا ہے نہ کہ تفصیل کا۔[1] مگر نفس کے انفعالات، نفس کی رغبتیں اور شوق، جذبات اور خیالات، خواہشات اور آرزوئیں اتنی ہیں کہ شمار نہیں ہوسکتیں۔ نہ یہ کبھی ختم ہونے میں آتی ہیں۔ نہ یہ زور لگانے سے کبھی رکتی ہیں۔ یہ چھوٹ چھوٹ کر نکلنے کیلئے ہمیشہ پر تولتی ہیں۔ انسان، جب تلک زندہ ہے اس کے اہداف کبھی سر ہوں گے اور نہ اس کے مطالبے کبھی رکنے میں آئیں گے۔ چنانچہ یہ 'آزمائش' ہر لحظہ قائم ہے۔ جب ایسا ہے تو پھر 'تربیت' کی ضرورت بھی ہر لحظہ قائم ہے۔ یہاں تک کہ نفس کو استقامت پر لے آیا جائے۔ نفس کو جس وضع پر لایا جانا اس آزمائش میں مطلوب ہو عین وہاں رہنے پر اسے مجبور کر دیا جائے۔ نفس خواہشات وشہوات کی بندگی سے نجات پائے اور پھر استقامت کی اس راہ پر رہنا گویا اس کی سرشت

(۱) جبکہ اس کی تفصیل دیگر آیات میں اور احادیث کے اندر آتی ہے۔

بن جائے یہاں تک کہ اس کیلئے اصل یہ ہو کہ وہ اس راستے پر چلے اور اس راستے سے پیر کبھی باہر پڑ جانا خلاف معمول واقعہ ہو جائے۔ یوں اس پر خدا کا یہ قول (منطبق) ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ (حم السجدة: ۳۰)

جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ "نہ ڈرو، نہ غم کرو، اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے

پھر بھی انسان خطا سے معصوم نہیں۔ کسی کو یہ ضمانت نہیں کہ وہ کبھی بھی اپنے نفس کے جھانسے میں نہ آئے گا اور خواہشات کے جال میں اس کا پیر کبھی نہ پھنسے گا۔ لیکن اگر ایسا ہے تو دوسری طرف توبہ کا دروازہ ہر بشر کے آگے کھلا ہے اور ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔

كل بنى آدم خطاء وخير الخطائين التوابون (رواه احمد وابن ماجة)

آدم کی سب اولاد غلطی کر لینے والی ہے۔ مگر ان خطا کاروں میں سب سے بہتر وہ ہیں جو پلٹ آتے رہیں

یہاں 'تربیت' کی اہمیت سامنے آتی ہے اور بنی آدم کیلئے اس کا ناگزیر ہونا اور آخری حد تک اس کا اہتمام کرنا ایک حتمی ضرورت کے طور پر واضح ہوتا ہے۔

'تربیت' صرف اس معنی میں مطلوب نہیں کہ یہ نفس کی شہوت و خواہش اور نفس کے انفعال اور شوریدگی کو ضبط میں لانا ہے، گو یہ تربیت کی اہم اور ناگزیر بنیادوں میں سے ایک ہے۔ 'تربیت' دراصل رویہ و سلوک کے اور بہت سے مدارج اور اعلیٰ قدروں کو نفس میں گہرا لے جانے کے اور بہت سے مقامات کیلئے بھی مطلوب ہے......

دُنیا کی زندگانی میں اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے جو 'آزمائش' رکھی ہے وہ کوئی ایک ہی قسم کی نہیں۔ یہ قسما قسم آزمائش ہے۔ 'آزمائش' کی بعض صورتیں اس کے درون سے ہی اس پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ یہ اس کی داخلی اشتہا ہے اور اس کے اندر کی خواہش اور للچاہٹ۔ پھر آزمائش کی بعض صورتیں بیرون سے حملہ آور ہوتی ہیں اگرچہ یہ اس کے درون میں پائی جانے والی چاہت اور ہوس کے بل پر ہی اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ سیاسی عوامل ہوتے ہیں، معاشی حالات ہوتے ہیں اور سماجی اسباب۔ اسی میں لوگوں کے مابین پائے جانے والے رجحانات، رسوم اور فیشن آتے ہیں۔ یہ سب مل کر 'انسان' کو اپنے تقاضوں کے آگے سرنگوں کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ ان میں کا ایک بڑا حصہ،

خصوصاً ایک جاہلی زندگی میں، انسان کی حقیقی ضرورت سرے سے نہیں ہوتا بلکہ یہ محض اھواء اور شرورِ نفس ہوتا ہے۔ اھواء اور شرورِ نفس کو ایک بدترین رخ دینے میں ایک بڑا کردار پھر ان مستکبرین کا ہوتا ہے جو مستضعفین کیلئے زندگی کا رخ متعین کرتے ہیں۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ (المؤمنون: ٧١)
حق اگر کہیں ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین اور آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا

تا آنکہ زندگی اس اعلیٰ سطح پر آ کر استقامت اختیار کر لے جو زمین میں انسان کے شایان شان ہے، کہ انسان وہ مخلوق ہے جس کو خدا نے ایک خاص تکریم دے رکھی ہے اور بے شمار مخلوقات پر نمایاں فضیلت عطا فرمائی ہے...... لازم ہے کہ انسان اپنے درون اور بیرون سے حملہ آور دباؤ کی ان سب صورتوں کے آگے ایک سخت مزاحمت کرے، بے شک وہ اپنی اس مزاحمت کے باعث اپنی بہت سی جائز خواہشات کو پورا کرنے سے محروم کیوں نہ رہ جائے......

نفس کو اگر کسی بھی دیکھ بھال اور نگہداشت کے بغیر چھوڑ دیا جائے تو اس کا معدن کمزور پڑ جاتا ہے۔ پھر یہ ایک ناتواں نفس ہوتی ہے جو کسی دباؤ اور کسی حملہ کے آگے مزاحمت کی طاقت نہیں رکھتی۔ مختلف عوامل کے آگے یہ بڑے آرام سے مُڑ جاتی ہے۔ 'خواہشات' اور 'واقعات' اس کو جو صورت دیں بس یہ وہی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ بات مستکبرین کو اور بھی انگیخت دیتی ہے کہ کمزور نفوس پر وہ اپنا دباؤ بڑھا دیں تا کہ وہ اپنے شرورِ نفس اور اپنی پراگندہ خیالی کیلئے لوگوں کو اور بھی جھکائیں۔ تب پھر زمین میں ایک بڑا فساد برپا ہو اور ہر طرف بگاڑ اور انحراف پھیل جائے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الروم: ٤١)
بحر و بر میں، لوگوں کی بداعمالیوں کے باعث، فساد پھیل گیا ہے

"لوگوں کی بداعمالیوں کے باعث"...... چاہے یہ جباروں کی سرکشی ہو اور چاہے کمزوروں کا ان کے مطالبوں کے آگے سر جھکانا، سب فساد ہے جو زندگی کو اس رخ پر نہیں آنے دیتا جس پر کہ، خدا کے حکم کی رو سے، اسے ہونا چاہئے......

یہاں ایک بار پھر تربیت کا وہ کردار نمایاں ہوتا ہے جو نفس میں وہ ٹھوس پن پیدا کرنے کیلئے ناگزیر ہے جو اس کو دباؤ کی ان مختلف صورتوں کے آگے جم جانے کی صلاحیت دے۔ اسلام کی فکری

بنیادوں اور نظریاتی اصولوں پر محنت انسان کی نفسیات اور اس کے کردار میں وہ قوت لے آنے کا باعث ہوتی ہے جو کسی حملے کے آگے ڈھیر ہو جانے یا کسی دباؤ کے تحت لچک اپنانے سے نفس انسانی کا تحفظ کرے۔ جس قدر ان فکری اصولوں اور اخلاقی قدروں سے اس کا تمسک زیادہ ہوگا اسی قدر نفس میں وہ ٹھوس پن آئے گا جو اس معرکۂ خیر وشر میں اس کی قوتِ مدافعت اور فعالیت میں اضافہ کرے۔ فکری بنیادوں اور اخلاقی قدروں سے یہ 'تمسک' جس چیز کا نتیجہ ہوتا ہے وہ ہے درست تربیتی عمل جس پر ایک لگاتار اور درجہ بدرجہ محنت ہوتی ہو۔ مگر فکری اصولوں اور نظریاتی بنیادوں سے انسان کا یہ تمسک بھی اسی بات کا محتاج ہے کہ پہلے نفس کو اھواء پر ضبط پانے کا باقاعدہ طور پر عادی کیا جائے جبکہ نفس کو عملاً کسی بات کا عادی کرنے کیلئے ایک مسلسل محنت کی ضرورت بہرحال مسلم ہے۔ چنانچہ فکری اصولوں اور اخلاقی قدروں پر محنت اور نفس کو عملاً مشقت اور برداشت کا عادی کرنا، یہ وہ دو باتیں ہیں جن کے بغیر اس مشن کے فرائض اور تکالیف کا قیام عمل میں آنا ممکن نہیں۔ 'تمسک' سے یہ دونوں ہی پہلو مراد ہیں:

| | |
|---|---|
| فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِیْ أُوحِیَ إِلَیْكَ إِنَّكَ عَلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (الزخرف: ٤٣) | تم پر جو کچھ وحی ہو، پس تم اسی سے پورا تمسک رکھو، یقیناً تم ہی سیدھے راستے پر ہو |
| وَالَّذِينَ يُمَسَّكُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُواْ الصَّلاَةَ إِنَّا لاَ نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ (الاعراف: ١٧٠) | جو لوگ کتاب وحی سے تمسک اختیار کر کے رکھتے ہیں اور جنہوں نے نماز قائم کر رکھی ہے، یقیناً ایسے نیک کردار لوگوں کا اجر ہم ضائع نہیں کریں گے |

تربیت کی ضرورت یہاں پر بھی ختم نہیں ہو جاتی۔ نہ ہی تربیت کے تحت دین کا یہ کل مطلوب ہے۔ خصوصاً اس امت میں۔

خدا کی مشیئت اس بات کی متقاضی ہوئی ہے کہ سب کے سب انسان ایک ہی امت نہ ہوں:

| | |
|---|---|
| وَلَوْ شَاء رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلاَ يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلاَّ مَن رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ (ھود: ١١٨-١١٩) | بے شک تیرا رب اگر چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک گروہ بنا دیتا۔ مگر وہ اختلافات کرتے ہی رہیں گے سوائے وہی جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی (آزادیِ اختیار) کیلئے ہی تو اس نے انہیں پیدا کیا ہے |

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنکُمْ کَافِرٌ وَمِنکُم مُّؤْمِنٌ (التغابن:۲) — وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن ......

خدا کی یہ سنت ٹھہری ہے کہ زمین کی اس دُنیا میں مومنوں اور کافروں کے مابین ایک کشمکش برپا ہو اور اہل حق اور اہل باطل اپنے اپنے مسلکِ زندگی کے حق میں اور ایک دوسرے کے منہجِ عمل کے خلاف اپنا زور صرف کریں۔ تا کہ زمین میں غلبۂ باطل کے باعث نا قابل تدارک حد تک فساد نہ پھیل جائے۔

وَلَوْلاَ دَفْعُ اللّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الأَرْضُ وَلَـكِنَّ اللّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ (البقرۃ:۲۵۱) — اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے نہ ہٹاتا رہتا، تو زمین کا نظام بگڑ جاتا، لیکن دُنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے

خدا اس بات سے عاجز نہیں کہ وہ اہل باطل کو خود ہی تباہ کر دے اور ان کی سرکشی اور طغیانی کا آپ ہی صفایا کر دے جبکہ وہ وہی ذات تو ہے جو کسی چیز کو، ہو جانے کیلئے، صرف ''کُن'' کہتی ہے:

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَن نَّقُولَ لَهُ كُن فَيَكُون (النحل:۴۰) — ''ہمیں کسی چیز کو وجود میں لانے کیلئے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرنا ہوتا کہ اسے حکم دیں ''ہو جا'' اور بس وہ ہو جاتی ہے......''

مگر خدا کی سنت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ اہل باطل کی تباہی اہل حق کے ہاتھوں ہو اور اُس کی اپنی مدد و تائید سے ہو، اور یہ کہ اہل حق کے حق میں یہ اس آزمائش کا ایک حصہ ہو جس کا، سنت خداوندی کی رو سے، اس زندگی میں پیش آنا ٹھہر گیا ہے۔ مگر بیک وقت یہ ان کے لئے ایک بڑا اعزاز اور شرف کا غیر معمولی مقام بھی ہو:

ذَلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَكِن لِّيَبْلُوَ بَعْضَكُم بِبَعْضٍ (محمد:۴) — یہ ہے تمہارے کرنے کا کام۔ اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا مگر (یہ طریقہ اس نے اس لئے اختیار کیا ہے) تا کہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَـكِنَّ اللّهَ رَمَى وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلاء حَسَناً إِنَّ اللّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (الانفال:۱۷) — پس حقیقت یہ ہے کہ تم لوگوں نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا (اور مومنوں کے ہاتھ جو اس کام میں استعمال کئے گئے) تو یہ اس لئے تھا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے، یقیناً اللہ سننے اور جاننے والا ہے

دین اسلام کا یہ پہلو، یعنی باطل کے خلاف مجاہدہ، زمین کی اصلاح اور۔فساد سے اس کا تحفظ کرنے کی غرض سے۔باطل کے پیرا کھاڑ دینے میں مسلسل مصروف عمل رہنا...... یہ اس 'آزمائش' کی وہ بلند ترین چوٹی ہے جس تک انسان کو اس زندگی میں پہنچنا ہوتا ہے۔یہی "**ذروۃ سنام الاسلام**" ...... اسلام کے کوہان کی چوٹی ہے۔یعنی یہ منہتائے سعی و کاوش ہے۔

ألا أخبرك برأس الأمر، وعموده، وذروة سنامه؟ قلت: بلى يا رسول اللّٰه۔ قال رأس الأمر الاسلام، وعموده الصلاة وذروة سنامه الجهاد (اخرجه الترمذی)

کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ دین کی اساس کیا ہے، دین کا ستون کیا ہے اور اس کے کوہان کی چوٹی کیا ہے؟ میں (معاذ بن جبلؓ) نے عرض کی: کیوں نہیں اے اللہ کے رسولؐ! فرمایا: دین کی اساس حقیقت اسلام ہے۔دین کا ستون نماز ہے اور دین کے کوہان کی چوٹی جہاد ہے

اب یہ امر ایک اور بھی خاص درجے کی استعداد اور ایک طویل تربیتی عمل کا ضرورت مند ہے۔ جسمانی اور مادی استعداد سے پہلے ایک نفسیاتی اور روحانی استعداد۔ یہ تربیت کی ایک ایسی سطح ہے جس تک نہیں پہنچا جا سکتا تا آنکہ انسان اس سے پہلے کے دونوں مدارج کو پہنچ لے۔یعنی نفسیاتی ونظریاتی صلاحیت اور ضبط خواہشات۔یوں تربیت کے یہ تین مدارج سامنے آتے ہیں: ضبط اھواء سے شروع ہو کر جہاں یہ نفس کیلئے ایک عادت اور معمول کا درجہ اختیار کر لے......اور فکری اصولوں اور اخلاقی قدروں میں پختگی کے مرحلہ سے گزرتے ہوئے......نفس اور مال کے ساتھ جہاد کی استعداد تک پہنچنا اور اس پر صبر اور ثبات اختیار کرنا۔

اس کے بعد پھر ایک آخری سطح ہے۔خیر القرون کی بابت اپنی اس گفتگو میں اس کی جانب اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے، خاص طور پر امت کی نسلِ اول (صحابہ) کی بابت۔ یہ عبادت کی رضا کارانہ صورتوں کے ایک اعلیٰ معیار کا التزام ہے۔ یہ درجہ واجبات اور فرائض سے گزر کر آتا ہے۔ یہ "مندوبات اور مستحبات" کی سطح کو چھونا ہے جس میں آدمی مندوبات و مستحبات کو بھی اپنے حق میں واجبات کا درجہ دے لیتا ہے، بغیر اس کے کہ اللہ اور رسولؐ اس کو اس بات کا پابند کریں۔مگر اللہ اور رسولؐ کی محبت میں آدمی از خود یہ ذمہ اٹھا لیتا ہے۔ یہ عبادت کو اللہ کیلئے خالص کر دینے اور اس کی خوشنودی کی چاہت کرنے کا آخری درجہ ہے کہ ایک بات جو اس پر فرض نہ کی گئی ہو مگر وہ اس کو فرض ہی کی طرح ادا کرنے پر کاربند ہو۔

یہ ایک ایسی سطح ہے جس کے اعلیٰ ترین مقامات تک رسول اللہ ﷺ کے زیر تربیت رہنے والی صحابہ کی وہ منفرد ترین نسل پوری کامیابی کے ساتھ پہنچی تھی۔ اگرچہ امت کی بعد کی نسلوں میں سے کوئی بھی نسل اور کوئی بھی دور ایسے افراد سے خالی نہ رہا جو بلندی کے اس عظیم مقام کو کامیابی سے چھو لیتے رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

یہ امور واضح ہو جانے کے بعد ہمارے لئے اس محنت کا اندازہ کر لینا ممکن ہو جاتا ہے جو مربیِ اعظم ﷺ نے اپنے زیر تربیت نفوس کو اس بلند ترین مقام تک پہنچانے کیلئے صرف کی جس تک وہ بالفعل پہنچ گئے تھے اور جو کہ ایک ایسا مقام ہے جس کی انسانیت کی تاریخ میں اس سے پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی......

اس محنت کا اندازہ کرنے کیلئے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کی تربیت پر کی شاید یہ بات ہمارے لئے مددگار ہو کہ ہم تربیت کے اس عظیم ترین وسیلہ سے شناسائی حاصل کریں جس کو آپؐ نے اپنے اصحاب کے تزکیہ کیلئے اختیار فرمایا۔ یہ وہ وسیلہ ہے جو اسلام پر تربیت پانے کیلئے ہر دور اور ہر نسل کی ضرورت ہے۔ یہ ہے اللہ اور یوم آخرت کو نفوس میں گہرا کرنا اور خدا کی معیت میں زندگی صرف کرنا......

کوئی چیز بھی نفس کو درجہ بدرجہ ترقی دینے میں ایمان کی طرح نہیں۔ ایمان پر محنت ہی وہ چیز ہے جو اس بات کا انتظام کرتی ہے کہ نفس انسانی جب ایک بار راہ راست پر آ جائے تو پھر دامن چھڑا کر بھاگنے نہ پائے اور شہوات وخواہشات کا بوجھ اس کو بلندی سے پستی کی جانب کھینچ لے جانے میں ناکام رہے۔ ایمان پر محنت ہی وہ چیز ہے جو نفس میں یہ شوق پیدا کرتی ہے کہ وہ پستیوں کی جانب کھنچنے کی بجائے بلندیوں اور رفعتوں کی جانب بڑھنے کیلئے زور لگائے اور مدارج سالکین میں اعلیٰ ترین درجات پانے کو بے تاب ہو۔

جس قدر انسان خدا کی معیت میں رہنے لگتا ہے، جس قدر خدا کی محبت اور خشیت دل میں پیدا کرتا ہے، جس قدر خدا کو ظاہر اور باطن میں یاد کرتا ہے اور اس کی رضا جوئی کرتا ہے......اور جس قدر وہ یوم آخرت اور اس کے بعث ونشور، حساب وجزا اور جنت وجہنم کو سامنے رکھ کر زندگی بسر کرتا ہے اسی قدر اس میں خواہشات پر ضبط آتا ہے۔ اسی قدر اس میں اعلیٰ قدروں کا آئینہ دار ہونے کی ہمت آتی ہے۔ اسی قدر وہ اپنے آپ کو خدا کی راہ میں جہاد کیلئے تیار کرتا ہے اور اسی قدر وہ ___ خدا کی خوشنودی پانے کیلئے ___ عبادت کی رضا کارانہ صورتوں کے ایک اعلیٰ معیار کا التزام کرتا ہے۔

اگر ہم قرآن مجید کی آیات کا ایک استقراء کریں تو ہمیں ان امور پر بطور خاص ترکیز دی گئی نظر آتی ہے......

جہاں تک خدا کی پہچان کرانے کا تعلق ہے...... اس کے اسماء حسنیٰ اور صفات علیٰ کے ذریعے......اس کی قدرت کے تذکرے کر کے جس کو کوئی چیز عاجز کر دینے والی نہیں۔ اور اس کے علم کا وصف بیان کر کے جس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں، اور اس کے ہمہ وقت نگران ہونے کا تصور کر کے جس سے کوئی چیز اوجھل نہیں، اور اس کی رحمت کا بیان کر کے جو ہر چیز پر وسیع ہے، اور اس کی قوت وجبروت کا ذکر کر کے جس کی راہ میں کوئی چیز ٹھہرنے والی نہیں......تو خدا کا یہ تعارف قرآن میں اتنا زیادہ اور اتنا واضح ہے کہ محتاج بیان نہیں۔ یہ قرآن کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا موضوع ہے۔ قرآن میں جتنی جگہ اس موضوع نے گھیر رکھی ہے اور جتنی ترکیز اسے حاصل ہے، اور جس قدر تکرار اس کی قرآن میں ہوئی ہے وہ کسی اور موضوع کو حاصل نہیں۔ پھر خدا کی پہچان ہو جانے کے تقاضے بھی اتنے ہی زور اور اتنی ہی شدت اور تکرار سے بیان ہوئے ہیں......جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کی بلاشرکت غیرے بندگی ہو، قلبی اعتقادات کے اندر بھی اور شعائرِ عبادت مانند نماز وروزہ وزکوۃ وحج، استعانت وفریاد، ذبیحہ ونذر ودُعاء وغیرہ کے اندر بھی اور اس کے اتارے ہوئے اوامر ونواہی، تشریعات واحکام اور قوانین وحدود کے اندر بھی۔

جہاں تک مناظرِ قیامت کا تعلق ہے، اپنے تمام تر متنوع اسالیب کے ساتھ اور کثرتِ تذکرہ اور تعددِ مقامات کے ساتھ اور آخرت کی نعمتوں اور سختیوں کے محضر ناموں کے ساتھ......تو وہ بھی اتنا زیادہ اور اتنا واضح ہے کہ دیکھنے والے کو قرآن میں گویا بس یہی نظر آتا ہے۔ ایک قابلِ التفات بات یہ ہے کہ قرآن مجید کی مدنی سورتوں میں بالخصوص ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر، دونوں کو سلباً وایجاباً ربط دیا جاتا ہے اور پھر اس کو انسان کے عقائد، شعائر، شرائع، اخلاق، اقدار اور رویہ وسلوک کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے......ایک مومن کے حق میں بھی اور ایک کافر کے حق میں بھی:

| | |
|---|---|
| إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحاً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرۃ:٦٢) | نبی عربی کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں، صابی جو بھی اللہ اور روز آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے |

| | |
|---|---|
| وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاء فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلاَ تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْاْ بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ذَلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكُمْ أَزْكَى لَكُمْ وَأَطْهَرُ وَاللّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لاَ تَعْلَمُونَ (البقرۃ:۲۳۲) | جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں، تو پھر اس میں مانع نہ ہو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں، جبکہ وہ معروف طریقے سے باہم مناکحت پر راضی ہوں۔ تمہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا، اگر تم اللہ اور روز آخر پر ایمان لانے والے ہو |
| يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تُبْطِلُواْ صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالأذَى كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاء النَّاسِ وَلاَ يُؤْمِنُ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ (البقرۃ:۲۶۴) | اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو، جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ روز آخرت پر |
| يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَطِيعُواْ اللّهَ وَأَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلاً (النساء:۵۹) | اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں صاحب امر ہوں۔ پھر اگر تم میں کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقہ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے |
| قَاتِلُواْ الَّذِينَ لاَ يُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَلاَ بِالْيَوْمِ الآخِرِ وَلاَ يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّهُ وَرَسُولُهُ وَلاَ يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُواْ الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُواْ الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (التوبۃ:۲۹) | جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں |
| لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيراً (الاحزاب:۲۱) | درحقیقت تمہارے لئے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے |

'اللہ' اور 'یوم آخرت' پر ایمان میں یہ ربط ہمیں اگر مدنی سورتوں میں اس قدر واضح اور بار بار متصل نظر آتا ہے تو وہ مکی سورتوں میں بھی بہت نمایاں ہے گو وہاں ان دونوں کا ذکر علیحدہ علیحدہ زیادہ ہے:

| | |
|---|---|
| إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ فَالَّذِينَ لاَ يُؤْمِنُونَ بِالآخِرَةِ قُلُوبُهُم مُّنكِرَةٌ وَهُم مُّسْتَكْبِرُونَ (النحل:۲۲) | تمہارا معبود تو بس ایک ہی معبود ہے۔ مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کے دلوں میں انکار بس کر رہ گیا ہے اور وہ گھمنڈ میں پڑ گئے ہیں" |

وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى
الْأَرْضِ هَوْناً وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ
قَالُوا سَلَاماً وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَقِيَاماً وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ
عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ
غَرَاماً إِنَّهَا سَاءتْ مُسْتَقَرّاً
وَمُقَاماً وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا
وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَاماً
وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهاً آخَرَ
وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا
بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَن يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ
أَثَاماً يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
وَيَخْلُدْ فِيهِ مُهَاناً إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ
وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحاً فَأُوْلَئِكَ يُبَدِّلُ
اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللَّهُ
غَفُوراً رَّحِيماً وَمَن تَابَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى
اللَّهِ مَتَاباً وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ
مَرُّوا كِرَاماً وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ
يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمّاً وَعُمْيَاناً وَالَّذِينَ
يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا
وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ
إِمَاماً أُوْلَئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا
صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَاماً
خَالِدِينَ فِيهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرّاً وَمُقَاماً
(الفرقان:۶۳-۷۶)

رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں بھئی تم کو سلام ہے۔ وہ جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ جو دُعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب، جہنم کے عذاب سے ہم کو بچا لے، اس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے، وہ تو بڑا ہی برا مستقر اور مقام۔ جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے، اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں ___ یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا، قیامت کے روز اس کو مکرر عذاب دیا جائے گا اور اسی میں وہ ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ الا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو۔ ایسے لوگوں کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور رحیم ہے۔ جو شخص توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے ___ (اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو وہاں سے بڑے وقار کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ جنہیں اگر ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے۔ جو دُعائیں مانگا کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا" یہ ہیں جو اپنے صبر کا پھل منزل بلند کی شکل میں پائیں گے۔ آداب وتسلیمات سے ان کا استقبال ہوگا......

اس امر کی جو تربیتی دلالت ہمیں یہ نظر آتی ہے وہ ہے: ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر دونوں کا پہلے قائم بالذات انداز میں پایا جانا اور ان میں سے ہر ایک کا نفس کی گہرائیوں تک جا پہنچنا، اور پھر وہاں دونوں کا آپس میں مل جانا اور لازم وملزم ہو جانا اور ایک دوسرے کی تکمیل کرنا...... یہ اسلام کے منہجِ تربیت

کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ یہی وہ محنت ہے جس سے مطلوبہ ثمرات حاصل ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اس کی مسلسل نگہداشت ہو اور اس پر ایک قیادت اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دے۔ یہی وہ کام ہے جو رسول اللہ ﷺ نے انجام دیا اور اس میں عمدگی کا وہ معیار رکھا جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی......

رسول اللہ ﷺ کی، خصوصاً مکہ کے اندر، جو مسلسل محنت ہوئی وہ اپنے اصحاب کے نفوس میں ایمان باللہ کو گہرا کرنا تھا اور ایمان بالیوم الآخر کو گہرا کرنا...... پھر اس ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر کو ان نفوس میں باہم جوڑ دینا...... یہاں تک کہ ان میں سے ایک کا ذکر ہو تو دوسرا خود بخود ساتھ آئے: اگر انسان کو خدا کی بابت متنبہ کیا جائے تو وہ خود بخود یوم آخرت کی بابت متنبہ ہو اور آخرت کے ٹھاٹھ اور آخرت کی سختی خود بخود اس کی نگاہوں میں آ جائے...... اور اگر کبھی آخرت کا تذکرہ ہو تو خدا کا مرتبہ اور مقام آپ سے آپ اس کی نگاہ میں آ جائے جو کہ دُنیا اور آخرت کا مالک ہے اور کائنات کی ہر چیز کا حاکم و متصرف۔

تربیت کی اس زبردست بنیاد کو اختیار کر کے رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کی تربیت کو جس بلندی پر لے جانے میں کامیاب ہوئے...... اگر یہ دیکھنا ہو کہ یہ تبدیلی اصحاب رسول اللہ ﷺ میں جس سرچشمۂ حیات سے سیراب ہو کر آئی وہ سرچشمہ کیا تھا اور پھر یہ کہ اس سرچشمہ حیات سے خاص منادیِ ایمان (نبی ﷺ) کے ہاتھوں سیراب ہو کر جو تبدیلی آئی وہ تبدیلی کس پائے کی تھی...... تربیت کی یہ بنیاد بھی اور تربیت کی یہ بلندی بھی دونوں اگر دیکھنی ہوں تو وہ ہمیں قرآنی آیات کے اس خوبصورت بیان میں واضح نظر آتی ہیں:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لِّأُولِي الألْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّهَ قِيَاماً وَقُعُوداً وَعَلَىَ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ رَبَّنَا إِنَّكَ مَن تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ رَّبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِياً يُنَادِي لِلإِيمَانِ

زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری آنے میں ان ہوشمند لوگوں کیلئے بہت نشانیاں ہیں جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اُٹھتے ہیں) پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے ہمارے رب! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے، تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اسے درحقیقت بڑی ذلت اور رسوائی میں ڈال دیا، اور پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ مالک! ہم نے ایک پکارنے والے

| | |
|---|---|
| أَنْ آمِنُواْ بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الأبْرَارِ رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدتَّنَا عَلَى رُسُلِكَ وَلاَ تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّكَ لاَ تُخْلِفُ الْمِيعَادَ (آل عمران:۱۹۰۔۱۹۴) | (منادی) کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ پس اے ہمارے آقا جو قصور ہم سے ہوئے ان سے درگزر فرما، جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ خداوندا! جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے |

اللہ رب العالمین نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں تیار ہونے والی اس جماعت کا یہ وصف جو خود بیان فرمایا بہت ہی عظیم الشان ہے۔ یہ وصف اس معاملے میں بہت واضح ہے کہ تربیت میں وہ لوگ کس رفعت کو پہنچے ہوئے تھے۔ اللہ کی یاد اور اس کا ذکر ایک لمحہ کیلئے بھی ہو تو وہ نفس پر اپنے آثار چھوڑتا ہے۔ پھر ان لوگوں کا کیا حال ہو گا جو ''اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں''! خدا کی اس یاد اور اس ذکر کا ان کے نفوس پر بھلا کیا کیا اثر نہ ہوتا ہو گا!

ایک اور جہت سے دیکھیے تو خدا کی یاد اور خدا کی آگہی اور خدا کی طلب ایک نفس پر اس حالت میں وارد ہوتی ہی نہیں جب وہ خواہشات کی کششِ ثقل سے پستی کی جانب کھینچ رہی ہو اور جب وہ متاع فانی کی چاہت کے ڈھلوان پر 'اترائی' کی جانب لڑھک رہی ہو...... کیونکہ یہ 'غفلت' کے لمحات ہوتے ہیں جب انسان خدا کے مرتبہ و مقام سے غافل ہوتا ہے۔ جبکہ خدا کی یاد اور خدا کی طلب کا لمحہ تو وہ لمحہ ہے جب انسان 'چڑھائی' کی جانب بڑھ رہا ہو! یہ پیمانہ جب ہم مدنظر رکھ کر دیکھتے ہیں تو خدا کی یاد اور چاہت کا ہر لمحہ ہمیں رفعت، بلندی اور 'چڑھائی' کا لمحہ نظر آتا ہے...... اگر ایسا ہے تو پھر ان لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے جو ہر لمحہ خدا کی جانب متوجہ رہتے ہیں! جو ''اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے'' ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں''! یہ لوگ کتنی 'چڑھائی' چڑھے ہوں گے اور اس بلندی پر ٹک رہنا کس قدر عزیمت کا کام ہو گا!؟ اس امر کی حقیقت کا ذرا واقعی تصور کیجئے کہ یہ کس قدر عظیم الشان کام ہے......

'چڑھائی' کا کام نفس انسانی پر ہمیشہ ہی شاق گزرتا ہے کجا یہ کہ نفس کو اس کا عادی ہی کر دیا جائے! یہ ایک واقعتاً مشکل کام ہے۔ 'مشت خاک' بہر حال ایک بوجھ رکھتی ہے۔ 'بوجھ' ہمیشہ پستی کی جانب کھینچتا ہے۔ اوپر جانے کیلئے بلاشبہ زور لگتا ہے۔ نفس کو پستی میں گرنے نہ دینا ہی ایک خاص درجے کی قوت چاہتا ہے پھر اس کو اوپر اٹھانا تو اور بھی اس بات کا متقاضی ہے کہ بلندی کی جانب اٹھنے والی قوت

پستی کی جانب کھینچنے والی قوت پر برتری پائے......

یہ حق ہے کہ اوپر جانے کا محرک بھی انسان کی ذات میں رکھ دیا گیا ہے۔ یہ اس کی فطرت کی تہہ میں موجود ہے۔ یہ نفخۂ بریں ہے جو خدا نے انسان میں پھونک رکھی ہے:

| | |
|---|---|
| إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَراً مِن طِينٍ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ (ص:۷۱-۷۲) | جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا "میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح بنادوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ |

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بلند ہونے کے اس محرک کو، جو کہ انسان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے، جلا دینے پر ہرگز کسی محنت کی ضرورت نہیں۔ اسی محنت کا نام دراصل 'تربیت' ہے۔ خواہشات و اغراض جہاں نفس انسانی کے اندر خود بخود متحرک ہوتی ہیں اور اپنی چمک دمک کے باعث یہ نفس پر زود اثر ہوتی ہیں اور ہیجان خیز ثابت ہوتی ہیں وہاں آلۂ ضبط جو خواہشات و اغراض کو قابو میں لاتا ہے انسان کے اندر ایک خاص انداز میں فٹ کیا گیا ہے۔ یہ خواہشات کی طرح بھڑکنے والی چیز نہیں۔ یہ آہستگی سے عمل کرتا ہے مگر دوررس ہوتا ہے کہ اسے انسان کو لے کر خدا تک پہنچنا ہوتا ہے۔ یہ انسان سے ایک خاص درجے کی توجہ اور ذہنی و نفسیاتی شرکت چاہتا ہے۔ یہ آپ سے آپ ہو جانے والا عمل نہیں۔ انسان کو شعوری طور پر اس کا ساتھ دینا ہوتا ہے۔ اس کیلئے عزیمت مطلوب ہے۔ بلند قدروں اور اعلیٰ اخلاقی معیاروں تک پہنچنا اور معالی الامور کو اپنا رکھنا۔ جو کہ خدا کو بے حد پسند ہے، ایک خاص درجے کی محنت چاہتا ہے...... انسان کی یہ صلاحیت جو اس کو پستی سے بلندی کی طرف لے جاتی ہے ایک باقاعدہ تربیت اور مشق چاہتی ہے۔ ایک بچہ زمین کی کشش ثقل کو مات دینے کیلئے اُٹھ کر کھڑا ہوتا ہے اور چلنا سیکھتا ہے تو اس پر اس کی بہت مشق ہوتی ہے، باوجود اس کے کہ چلنے اور بھاگنے پھرنے کی صلاحیت اس کی ہستی میں ودیعت کر دی گئی ہوتی ہے۔ یہ مشق نہ ہو تو چلنے کا عمل اتنا ہی موخر ہوگا اور وہ بے حرکت رہے گا۔

| | |
|---|---|
| زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ قُلْ أَؤُنَبِّئُكُم بِخَيْرٍ مِّن ذَلِكُمْ | لوگوں کے لئے مرغوبات نفس ___ عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں ___ بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں، مگر یہ سب دُنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں، حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو: میں تمہیں بتاؤں کہ اس سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں، اُن کے لئے اُن کے رب کے پاس باغ ہیں |

لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ (آل عمران:۱۴۔۱۷)

جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی، پاکیزہ بیویاں اُن کی رفیق ہونگی اوراللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ”مالک ہم ایمان لائے، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتش دوزخ سے بچالے“۔ یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں، راستباز ہیں، فرماں برداراور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دُعائیں مانگا کرتے ہیں

ایک طرف ’خواہشات‘ کا بوجھل وجود ہے، اور دوسری جانب اُوپر چڑھنے کا نسخہ بیان کر دیا گیا ہے!

اسلام کا اس معاملے میں سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ جب وہ انسان کو بلندی کی جانب لے جاتا ہے اور ’خواہشات کے بوجھ‘ کو ایک توازن دیتا ہے تو وہ انسان کو کسی ایسے منطقہ میں نہیں لے جاتا جہاں زمین کی کشش سرے سے ختم ہوجائے، جیسا کہ رہبانیت اور ہندومت اور بدھ مت ایسے دھرم انسان کے ساتھ کرتے ہیں۔ ایسی پرواز انسان کو فضا میں اڑان کا مزہ تو بہت دیتی ہے مگر زمین سے اس کا رشتہ منقطع ہوجاتا ہے۔ ایسی تربیت پایا ہوا انسان پھر زمین کی تعمیروآبادی میں کوتاہ ثابت ہوتا ہے اور زمین کو فساد سے تحفظ دینے اور جہاد اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر ایسے فرائض سے غافل رہتا ہے۔ جبکہ وہ خدا کی جانب سے ان سب باتوں کا بیک وقت مکلّف ہے۔ اس لئے کہ خدا کے علم میں اسی بات کے اندر انسان کی اور زمین پر انسانی زندگی کی صلاح وفلاح ہے۔ اسی نے اس انسان کو پیدا کیا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کونسی چیز اس انسان کو درست رکھ سکتی ہے اور کونسی چیز خود اس انسان کیلئے درست ہے:

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (الملک:۱۴)

کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا؟ وہ تو باریک بین ہے اور زبردست باخبر

هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا (هود:۶۱)

وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا، پھراسی میں اس نے تمہاری آبادی چاہی

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (الحج:۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ

(الصف: ۱۰۔ ۱۱)

'اے لوگو جو ایمان لائے ہو میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمہیں عذاب الیم سے بچادے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے، یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو

پھر اسی طرح جب وہ انسان کو زمین آباد کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور اس میں طیبات یعنی پاکیزہ نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی تلقین کرتا ہے تو وہ اس کو خواہشات کی دلدل میں دھنسنے بھی نہیں دیتا۔ کیونکہ یہ دوسری انتہا ہے۔ تب بھی وہ فساد کا شکار ہوتا ہے اور مقصدِ حیات کی نسبت اس کا زمین میں پایا جانا بے سود ثابت ہوتا ہے۔ خواہشات واغراض کے بوجھ تلے دب کر وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ ایسے فرائض کا بار کیسے اٹھا سکے گا۔ تب یہ فرائض اس کے لئے بے حد بھاری ہوجائیں گے۔ یہ فرائض پھر ایسے انسان کو حیاتِ فانی کی لذتوں میں ایک بڑی رکاوٹ نظر آئیں گے اور خدا کی جانب بڑھنے کا راستہ اس کے لئے دشوار ہوجائے گا۔

لَوْ كَانَ عَرَضاً قَرِيباً وَسَفَراً قَاصِداً لَّاتَّبَعُوكَ وَلَكِن بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ

(التوبۃ:۴۲)

اے نبی! اگر فائدہ سہل الحصول ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تمہارے پیچھے چلنے پر آمادہ ہوجاتے، مگر ان پر تو راستہ بہت کٹھن ہوگیا

وَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ آمِنُواْ بِاللّهِ وَجَاهِدُواْ مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُوْلُواْ الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُواْ ذَرْنَا نَكُن مَّعَ الْقَاعِدِينَ رَضُواْ بِأَن يَكُونُواْ مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لاَ يَفْقَهُونَ

(التوبۃ:۸۶۔۸۷)

جب کوئی سورت اس مضمون کی نازل ہوئی کہ اللہ کو مانو اور اس کے رسولؐ کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو تم نے دیکھا کہ جو لوگ ان میں سے صاحب مقدرت تھے وہی تم سے درخواست کرنے لگے کہ انہیں جہاد کی شرکت سے معاف رکھا جائے اور انہوں نے کہا کہ ہمیں چھوڑ دیجئے کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہیں۔ ان لوگوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا اور ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا گیا پس اب وہ فہم سے عاری ہیں

دراصل اسلام انسان کو جس مقام پر لاتا ہے وہ ایک توازن ہے جو انسان کے وجود کے دونوں عناصر کے مابین ایک زبردست انداز میں قائم ہو جاتا ہے: مشتِ خاک کا عنصر اور نفخۂ روح کا عنصر۔ تب یہ ایک ہی وقت میں دُنیا کیلئے بھی سرگرم ہوتا ہے اور آخرت کیلئے بھی۔ یہ زمین کے سینے پر چلتا اور دُنیا کے ہنگاموں میں شریک ہوتا ہے مگر یہ بیک وقت اس کیلئے آخرت کی کامیابی کا راستہ ہوتا ہے اور مر کر جی اٹھنے کی تیاری کا درجہ رکھتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْأَرْضَ ذَلُولاً فَامْشُوا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَکُلُوا مِن رِّزْقِهِ وَإِلَیْهِ النُّشُور (الملک:۱۵)

وہی تو ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے پست و مطیع کر دیا، چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق، اسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے

☆☆☆☆☆☆☆

رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنے ساتھیوں کو تربیت دینے اور اسلام کیلئے کارآمد بنانے کیلئے جو سب سے بڑا عملی ذریعہ ہمیں نظر آتا ہے وہ ہے اللہ اور آخرت پر ایمان کو گہرا کر دینا۔ خدا کو ان کا ہمہ وقتی موضوع بنا دینا اور ان کو اس بات کا عادی کر دینا کہ ان میں کا ہر ہر آدمی اپنی ہمت کے بقدر خدا کے ساتھ وقت گزارنا سیکھے...... جبکہ اس معاملہ میں، دین کے ہر معاملہ ہی کی طرح، آپؐ خود ان کے لئے سب سے بڑا نمونہ تھے......

حقیقت یہ ہے کہ تربیت کے عمل میں 'نمونہ' سب سے زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے......

خدا تعالیٰ جو کہ نفسِ انسانی کا خالق ہے، خوب جانتا ہے کہ خالی وعظ و نصیحت کافی نہیں چاہے وہ کتنا ہی بلیغ اور مؤثر کیوں نہ ہو، جب تک کہ وہ ایک انسانی دل میں جگہ نہ پالے اور جب تک کہ وہ اس کو اپنے رنگ میں نہ رنگ لے اور لوگوں کے سامنے اس کی ایک جیتی جاگتی صورت نہ بن جائے۔ تب جا کر وہ لوگوں کو اس کی جانب بلائے جبکہ وہ عملی نمونہ کی صورت میں ان پر واضح کر چکا ہو کہ 'حق کی اتباع' دراصل ہوتی کیا ہے؟

خدا تعالیٰ یقیناً اس بات پر قادر تھا کہ وہ قرآن کو کسی قرطاس میں لکھا لکھایا نازل کر دے اور پھر عرب امیوں کے اندر یہ الہامی قدرت پیدا کر دے کہ وہ اس کو پڑھنے لگیں......مگر وہ لطیف اور خبیر جانتا ہے کہ انسانی نفوس کے اندر کسی حقیقت کو یوں نہیں اتارا جاتا اور نہ ہی اس راہ سے ان میں وہ تاثیر پیدا کی جا

سکتی ہے جس کا پیدا کیا جانا اس میں مطلوب ہوا کرتا ہے اور جو کہ ایک مطلق حقیقت کو ایک متحرک حقیقت بنا دیتی ہے اور انسانی زندگی میں ایک ہلچل لے آتی ہے۔ قرآن کو لکھا لکھایا اتارنے کی بجائے اس نے اس کو ایک بشر کے قلب پر نازل کیا۔ اس کلام نے اس دل میں گھر کر لیا اور وہ اس کے رنگ میں رنگ کر اس کا عملی پرتو بنا جسے ساری دُنیا دیکھ اور محسوس کر سکتی تھی۔ اب قرآن کے اس عملی پرتو کو دیکھ کر ہر وہ انسان اس کی طرف لپکا جس کا سینہ خدا نے اسلام کیلئے کشادہ کیا۔ لوگوں کے دل اس کی طرف مائل ہوئے۔ بلکہ وہ اس کے تابع فرمان ہوئے اور خدا کے دین میں جوق در جوق آنے لگے۔

عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا گیا: رسول اللہ ﷺ کا اخلاق بیان کریں۔ فرمایا:

”آپؐ کا اخلاق قرآن ہی تھا“۔ (مسند احمد)

عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول کی روشنی میں ہی ہم اس آیت کا مطلب سمجھیں گے:

وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِين (النور:۵۴) رسول کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف پیغام پہنچا دے

اور اس آیت کا بھی:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (النحل:۴۴) ہم نے تم پہ ذکر نازل کیا ہے تا کہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح وتوضیح کرتے جاؤ جوان کیلئے اتاری گئی ہے

سو 'پہنچا دینا' محض یہ نہیں کہ رسولؐ لوگوں سے کہہ دے: ”تمہارا رب تمہیں فلاں اور فلاں حکم فرماتا ہے“...... 'بیان' سے مراد کوئی لیکچر نہیں اور نہ کوئی درسی انداز کا سبق ہے جو رسولؐ لوگوں کو دے آیا کرے...... اگرچہ 'پہنچا دینا' اور 'بیان کر دینا' اس معنی میں بھی مطلوب ہے تا کہ لوگ اپنے دین کے امور کا باقاعدہ علم لے لیں...... رہا یہ کہ یہ علم نفوس کے اندر گہری اتر جانے والی ایک حقیقت بنے اور پھر نفوس میں اتر جانے والی یہ حقیقت ایک عملی اور معاشرتی واقعہ بنے...... تو یہ ایک اور بات ہے۔ اس کیلئے ضرورت یہ ہے کہ رسولؐ ان تک اپنے رب کی بات کو کچھ یوں پہنچائے کہ پہلے یہ ایک انسانی حقیقت بن چکا ہو اور عمل میں ڈھل چکا ہو۔ تا کہ لوگ اس کی اقتدا کریں اور اس کا ایک عملی سبق لیں کہ اس پر عمل کیونکر ہونا ہے۔ اس میں داعیوں کیلئے ایک بہت بڑا سبق ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل کی جانب اگرچہ ہم ذرا دیر بعد آئیں گے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا اپنا حال یہ تھا کہ خدا کو اپنی سوچ اور اپنی تمام حرکات وسکنات کا محور بنا رکھا تھا۔ آپؐ کی زندگی خدا کا ہمہ وقت ذکر تھا۔ آپؐ کا ہر لحظ خدا کے ساتھ گزرتا تھا، نہ دل کسی وقت خدا کی

یاد سے غافل۔ نہ زبان سے اس کی یاد روپوش۔ خدا نے آپ ؐ کی تربیت فرمائی اور کیا ہی خوب تربیت فرمائی۔ آپ ؐ کو وہ خاص طاقت اور ہمت بخشی جو خدا سے اس ہمہ وقتی تعلق کی تاب لا سکے...... ایک بشر کیلئے یہ ایک بے حد جان جوکھوں کا کام تھا......

خدا کے ساتھ رہنے کی یہ بلند ترین سطح جس پر رسول اللہ ﷺ رہے...... یہ انسانوں کے بس کی بات نہ تھی۔ حتی کہ یہ صحابہؓ کے بس کی بات نہ تھی۔ ہر حال، ہر لحظہ اور ہر شکل میں خدا کی یاد رکھنا اور خدا کے ساتھ زندگی بسر کرنا۔

یہ تو بہر حال ایک خاص صفت ہے جو اللہ تعالیٰ نے خاص اپنے رسولوں کو عطا فرمائی اور پھر ان میں سے سید المرسلین ﷺ کو اس میں سب سے بڑا حصہ نصیب فرمایا۔ جہاں تک صحابہؓ کا تعلق ہے تو انہوں نے آپ ؐ سے عرض کی بھی کہ جب وہ آپ ؐ کے پاس ہوتے ہیں تو ان کی اور ہی حالت ہوتی ہے پھر جب وہ آپ ؐ سے دور ہوتے ہیں تو تب ان کی وہ حالت باقی نہیں رہتی، تب آپ ؐ نے فرمایا: ''بخدا تم پر اگر ہمیشہ وہی حالت برقرار رہے جو میرے پاس رہ کر تم پہ طاری ہوتی ہے اور اگر تم ہمیشہ ذکر میں رہو تو فرشتے تمہارے بچھونوں پر اور تمہارے راستوں میں تم سے آ کر ہاتھ ملایا کریں۔ مگر حنظلہ ایک گھڑی (کوئی حالت) ہوتی ہے اور ایک گھڑی (کوئی دوسری)''۔ (رواہ مسلم و الترمذی و احمد و ابن ماجة)

اس کے باوجود وہ گھڑی بھی جس کی صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی تھی وہ کوئی گراوٹ کی گھڑی نہ تھی۔ وہ کوئی خدا سے یکسر غافل ہو جانے کی گھڑی نہ تھی۔ خدا کا صحابہؓ کی بابت خود یہ وصف بیان کر دینا ہی ہمیں کفایت کرتا ہے کہ وہ (قیاماً و قعوداً و علی جنوبهم) کھڑے، بیٹھے اور لیٹے خدا کی یاد میں مگن رہتے ہیں۔ وہ فرق جو اِس گھڑی میں اور اُس گھڑی میں جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوتے تھے محض درجے کا فرق تھا نہ کہ ماہیت کا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوتے ہوئے تو وہ کسی اور ہی دُنیا میں پہنچے ہوتے تھے!

ہم اس وصف کی جانب لوٹ آتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کا بیان فرمایا ہے:

یہ وہ لوگ تھے جو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے خدا کی جانب متوجہ اور خدا کی یاد میں محو ہوتے۔ صحابہؓ کا خدا کی یاد اور خدا کے ذکر میں محو ہونا کس طرح تھا؟ کیا یہ وہ ذکر ہے جو آدمی کو 'فنا' تک لے جاتا ہے جیسا کہ صوفیہ کے ہاں ملتا ہے جو کہ 'فنا' کو ہی وجود کی اصل حقیقت قرار دیتے ہیں؟ یا یہ وہ ذکر ہے جو انسان کی

تمام تر چستی اور توانائی کو ایک جیتے جاگتے معاشرے میں متحرک کرتی ہے اور ایک بھرپور زندگی کے اندر اس کو خدا کی خوشنودگی پانے پر تیار کرتی ہے؟

وہ خدا کو ہر دم یاد کرتے اور اپنے آپ سے سوال کرتے کہ خدا اُن سے عین اس لمحے کیا چاہتا ہے؟ اس سوال کا جواب جس لمحہ 'جہاد فی سبیل اللہ' ہوتا یہ 'ذکر' اس لمحہ ان سے جہاد فی سبیل اللہ کروا رہا ہوتا تھا ......جس لمحہ اس سوال کا جواب 'علم وآگہی کا حصول' ہوتا اور جو کہ ہر مسلم پر فرض ہے یہ 'ذکر' اس لمحہ ان کو علم کے حصول پر مجبور کر رہا ہوتا تھا......جس لمحہ اس سوال کا جواب رزق حلال کا حصول ہوتا یا انفاق فی سبیل اللہ ہوتا یا زمین کی خدائی نقشے پر تعمیر وآبادی ہوتا اس لمحہ یہ ذکر ان سے یہ سب کام کروا رہا ہوتا تھا...... جس لمحہ اس سوال کا جواب ''عاشروھن بالمعروف''[1] ہوتا اس لمحہ وہ اس فرض کی ادائیگی کو خدا کے ذکر کا تقاضا سمجھتے......یہی حال ان کا دین کے سب فرائض اور زندگی کے سب میدانوں میں ''خدا کے ذکر'' کی بابت تھا۔

وہ خدا کو ہر دم یاد کرتے اور اپنے آپ سے سوال کرتے کہ خدا کی چاہت پوری کرنے میں وہ اب تک کیا کر پائے ہیں اور یہ کہ وہ جس حال میں ہیں وہ خدا کو خوش کر دینے والا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب اثبات میں پاتے تو خدا کی حمد اور تعریف اور شکر کرنے میں لگ جاتے اور اس کا تقرب پانے میں اس سے بھی بڑھ کر مصروف عمل ہو جانے کے متمنی وکوشاں ہوتے اور اگر وہ اس کا جواب کسی وقت نفی میں پاتے تو 'خدا کی یاد' ان سے استغفار کروانے لگتی! یعنی اس حال میں بھی وہ خدا کو یاد کرتے مگر اس لئے کہ وہ اپنے اس حال سے، جس میں خدا ان کو دیکھنا نہیں چاہتا، نکل آئیں۔ یہ چیز بھی ان کیلئے 'خدا کا ذکر' کرنا تھا!

| | |
|---|---|
| وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلاَّ اللّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ أُوْلَـئِكَ جَزَآؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ (آل عمران:۱۳۵۔۱۳۶) | اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ ان کو یاد آ جاتا ہے۔ تب وہ اس سے اپنے قصوروں کی معافی مانگنے لگتے ہیں ___ اور کون ہے اللہ کے سوا جو گناہ معاف کر دے ___ جبکہ وہ دیدہ ودانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انہیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے، ایسے نیک عمل کرنے والوں کیلئے |

(۱) النساء:۱۹ ''اور ان سے (عورتوں سے) اچھا برتاؤ کرو''

اب ذرا انہی آیات کو دیکھ لیجئے جن میں صحابہؓ کا کھڑے بیٹھے اور لیٹے 'خدا کے ذکر' میں مشغول ہونا بیان ہوا ہے......

| | |
|---|---|
| الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّهَ قِيَاماً وَقُعُوداً وَعَلَىَ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ (آل عمران:۱۹۱) | وہ جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی ساخت پر غور کرتے ہیں |

اس لمحہ خدا کی یاد میں محو ہونے کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ زمین اور آسمان کی ساخت میں بھی ذرا غور کریں اور یوں وہ زمین اور آسمانوں کی ساخت میں اور ان کے مابین جو جہان پائے جاتے ہیں ان کی تخلیق اور پیدائش کے معاملہ میں کسی 'مقصد' اور 'غایت' تک پہنچیں اور اس کارخانۂ ہستی میں جو 'حق' ایک خاموشی کی زبان میں محو گفتگو ہے اس سے شناسائی حاصل کریں۔

| | |
|---|---|
| خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ (التغابن:۳) | اس نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے، اور تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی ہے، اور اسی کی طرف آخرکار تمہیں پلٹنا ہے |
| وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاء وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلاً ذَلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ (ص:۲۷) | ہم نے آسمان اور زمین کو اور اس جہان کو جو ان کے درمیان ہے، فضول پیدا نہیں کر دیا ہے۔ یہ تو ان لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا ہے، اور ایسے کافروں کیلئے بربادی ہے جہنم کی آگ سے |

چنانچہ یہ لوگ خدا نے ان کو جو علم عطا کیا ہے اس علم کی بنا پر اور کائنات اور انسانی زندگی کے اندر جو خدائی سنتیں اور خدائی قوانین کارفرما ہیں ان کے تجزیہ ومشاہدہ کی بنا پر اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ اس کارخانۂ حیات کا وجود عبث اور بے مقصد ہو یہ ممکن ہی نہیں اور یہ کہ اس کی ایک ایک جزئیات میں جب بے پناہ حکمتیں پائی جاتی ہیں پھر یہ 'کل' ایک عبثِ محض کیونکر ہوسکتا ہے...... پھر جب وہ اس نتیجے تک پہنچتے ہیں تب یہ دُنیا کی زندگانی ان کی نظر میں منتہائے وجود نہیں رہتی۔ نہ ان کی نظر میں یہ ممکن ہی رہتا ہے کہ یہ دینا ہی وجود کا نقطۂ آخرین ہو۔ کتنے انسان اس ہنگامۂ حیات میں مخلوق پر ظلم وقہر ڈھاتے ہیں اور زندگی کی آخری سانس تک ظلم کئے جاتے ہیں۔ کتنے انسان یہاں ظلم سہتے ہیں اور زندگی کی آخری سانس تک ظلم سہے جاتے ہیں۔ اگر یہ دُنیا کی زندگانی ہی منتہائے وجود ہے تو پھر ''حق'' یہاں کہاں ہے؟؟ پھر تو یہ عبث اور باطل ہوگی کہ اس میں 'حق' ہی روپوش ہے۔

اب یہاں ان کا 'خدا کا ذکر' کرنا اور تخلیق میں چھپے ہوئے 'حق' پر ان کا غور وفکر کرنا ان کے شعور و وجدان کو یوم آخرت کی جانب لے چلتا ہے۔ جہاں وہ جنت اور جہنم کو موجود پاتے ہیں۔ تب وہ جہنم سے خدا کی پناہ مانگنے لگ جاتے ہیں:

وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران:۱۹۱)

اور وہ آسمان وزمین کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں (تب وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) "پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے تو پاک ہے (اس سے کہ عبث کام کرے) پس اے رب! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے

آگ کے ذکر پر آگ سے خوفزدہ ہونا اس ایمان کا تقاضا ہے۔ اب یہ اس آگ سے نجات کا پروانہ پانے کیلئے یہیں دُعا گو ہونے لگتے ہیں۔ یوں یہ 'ذکر' 'دُعا' میں بدل جاتا ہے:

رَبَّنَا إِنَّكَ مَن تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَار (آل عمران:۱۹۱)

"خدایا! تو نے جس کو دوزخ میں ڈالا اسے درحقیقت بڑی ہی ذلت ورسوائی میں ڈال دیا اور پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا"

پھر ان کی نگاہ متلاشی ہونے لگتی ہے کہ وہ مالک کے حضور میں کیا پیش کریں جو ان کی خلاصی اور کامیابی کیلئے سفارش کا کام دے سکے اور ان کو خدا کے ہاں سرفراز کردے:

رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِياً يُنَادِي لِلإِيمَانِ أَنْ آمِنُواْ بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الأبْرَارِ رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدتَّنَا عَلَى رُسُلِكَ وَلاَ تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّكَ لاَ تُخْلِفُ الْمِيعَاد (آل عمران:۱۹۳۔۱۹۴)

"مالک! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کرلی۔ پس اے ہمارے آقا! جو قصور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما، جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کردے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ خداوندا! جو وعدے تو نے رسولوں کے ذریعے سے کئے ہیں، ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے روز ہمیں رسوائی میں نہ ڈال۔ بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے"

**فاستجاب لهم ربهم......**

تب خدا کی طرف سے جواب آتا ہے!

خدا ان کی اس گریہ زاری اور اس مناجات کو باریابی بخشتا ہے۔ مگر کلام کی خوبصورتی دیکھیئے۔ خدا کس چیز کو باریابی بخشتا ہے؟ کیا محض ذکر کرنے کو؟ کیا محض ان کے غور وفکر کرنے کو؟ کیا محض تدبر اور تفکر

کرنے کا ان کو یہ صلہ دیتا ہے؟ کیا محض گریہ زاری کا یہ جواب دیتا ہے؟ یہ سب کچھ ایک مومن سے بلاشبہ مطلوب ہے مگر دیکھیے جواب میں کیا آتا ہے:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَى بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّن عِندِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ

(آل عمران:۱۹۵)

جواب میں اُن کا رب فرماتا ہے: ''میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔ لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لئے لڑے اور مارے گئے ان کے سب قصور میں معاف کر دوں گا اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے''

یہاں ہے 'تربیت' سے متعلق وہ درس جو ان آیات میں دیا گیا ہے۔ آیات میں یہ بات شروع جس چیز سے کی گئی وہ صحابہؓ کا یہ وصف ہے جو یہاں بیان ہوا ''وہ جو کھڑے، بیٹھے اور کروٹوں پر لیٹے خدا کا ذکر کرتے اور خدا کی یاد میں محو رہتے ہیں'' ...... مگر اس ذکر کی ماہیت کیا ہے؟ یہ وہ ذکر ہے جو ایک جیتی جاگتی اور حرکت و عمل سے پر زندگی کو جنم دیتا ہے۔ یہ وہ ذکر ہے جو زمین کے اندر ہلچل برپا کرتا ہے...... یہ ہجرتوں میں لگے ہوئے لوگ...... یہ دیس نکالا پانے والے انسان...... یہ لوگ جو خدا کی خاطر اور اس کے مشن کی تکمیل کی راہ میں اذیت پاتے اور اذیت سہتے ہیں...... اور اس پر صابر و ثابت قدم رہتے ہیں...... یہ باطل سے برسرِ پیکار لوگ اور خدا کی خاطر موت کو گلے لگا لینے والے انسان...... **فاستجاب لهم ربهم** خدا ان کی پکار سن لیتا ہے اور ان کی مناجات کو شرف باریابی بخش دیتا ہے!

'ذکر' کے کچھ ایسے ہی تصور پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحابؓ کی صورت گری کی تھی، سب سے پہلے اپنی شخصیتِ بابرکات کے اسوہ سے مدد لے کر، پھر ارشاد اور تلقین اور تعلیم سے کام لے کر اور پھر ایک مسلسل نگرانی، محنت اور احتساب کی راہ سے...... یہاں تک کہ وہ انسانی بلندی کی ان سطحوں کو چھونے لگے جن کی تاریخ میں واقعتاً کہیں مثال نہیں ملتی۔

☆☆☆☆☆☆☆

اب آیئے ذرا یہ دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ہدف کیا تھا؟ یعنی اس قدر عظیم الشان محنت جو آپؐ نے اپنے اصحابؓ کی تربیت اور تیاری پر صرف فرمائی، اس سے آپؐ ہدف کیا حاصل کرنا چاہتے تھے؟ کیا یہ اتنی محنت محض اس لئے تھی کہ اصحابؓ آپؐ کے مخلص حواری بن جائیں؟ کیا محض یہ مقصد تھا کہ صحابہؓ پکے سچے مومن بن جائیں؟ بلاشبہ یہ ایک غایت درجہ کا نیک مقصد ہے اور اس پر محنت کرنا بنتا ہے۔ مگر! کیا اتنی ساری محنت!؟

رسول اللہ ﷺ نے جتنی محنت صرف کی اس کا ایک حصہ بھی اس مذکورہ بالا ہدف کو حاصل کرنے کیلئے کافی ہوسکتا تھا بلکہ اس حد تک باحسن انداز ہوسکتا تھا جس کا کہ کوئی رسول اپنی امت کیلئے خواہشمند ہو۔ اس کیلئے وہ محنت بھی کافی تھی جو عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے اپنے حواریوں کی تربیت میں میں صرف کی تھی جوکہ آپؑ کے گرد اگرد اکٹھے ہوگئے تھے اور آپؑ کے مخلص پیروکار بنے اور پھر آپؑ کے بعد آپؑ کے دین کی نشر و اشاعت میں جت گئے جبکہ وہ رافت اور رحمت اور زہد و اخلاق میں ایک زبردست مثال تھے۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَى آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ (الحدید:۲۷)

ان کے بعد پے درپے ہم نے اپنے رسول بھیجے، اور ان سب کے بعد عیسیٰ بن مریم کو مبعوث کیا اور اس کو انجیل عطا کی اور جن لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا اور رھبانیت انہوں نے خود ایجاد کرلی، ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا، مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انہوں نے آپ ہی یہ بدعت نکال لی

مگر محمد ﷺ کا ہدف اپنے سے پہلے رسولوں کی طرح اہل ایمان کی محض ایک جماعت تیار کردینا نہ تھا۔ آپؐ کا ہدف اس سے کہیں بڑا اور کہیں زیادہ جلیل القدر تھا۔ آپؐ کا مقصد ایک ایسی مضبوط جمعیت کی تیاری تھا جو زمین پر **خیر امة اخرجت للناس** کی صورت دھارلے۔

وہ فرق جو محمد ﷺ سے پہلے کے کسی بھی رسول کی تیار کردہ اہل ایمان کی جمعیت اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں تیار ہونے والی اہل ایمان کی جمعیت کے مابین ہے...... یہ فرق پوشیدہ ہے دراصل ان ذمہ داریوں کے اندر جن کا خدا نے ان پہلوں کو مکلّف کیا تھا اور ان ذمہ داریوں کے اندر جو خدا نے اس امت پر عائد کی ہیں۔ یہ فرق اس کردار کے اندر پوشیدہ ہے جو زمین میں ان پہلے والوں سے مطلوب تھا اور جو اس امت سے مطلوب ہے۔

جہاں تک پہلی مومن جماعتوں کا تعلق ہے تو ان کی بابت اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا ہے:

| | |
|---|---|
| وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاء وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ (البینۃ:۵) | اوران کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کیلئے خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں۔ یہی نہایت صحیح و درست دین ہے |

جہاں تک رسول اللہ ﷺ کی جماعت کا معاملہ ہے تو ان پر عین یہی ذمہ داری بھی عائد ہے، یعنی یہ کہ یہ دین اور بندگی کو خدائے وحدہ لاشریک کیلئے خالص اور مختص کرتے ہوئے خدا کی عبادت کریں اور ہر طرف سے یکسو ہو کر خدا کی جانب رخ کر لیں اور یہ کہ نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں وغیرہ......

مگر اس سے بڑھ کر ان کو ایک اور بات کا بھی پابند بنایا ہے اور یہ بس اسی امت کے ساتھ خاص ہے:

| | |
|---|---|
| كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّهِ (آل عمران:۱۱۰) | تم وہ بہترین امت ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کیلئے میدان عمل میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو |
| وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً (البقرۃ:۱۴۳) | اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک "امت وسط" بنایا ہے تا کہ تم دُنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو |

پہلی امتوں کو برپا کیا گیا تھا کہ وہ اللہ پر ایمان لائیں اور خود اپنی ذات میں اللہ پر ایمان کی راہ پہ کاربند و ثابت قدم رہیں۔ مگر اس امت کو انسانیت کیلئے برپا کیا گیا ہے۔ اس کو ایک ایسا نمونہ بننا ہے جسے دیکھ کر ساری کی ساری بشریت سیدھے راستے کا پتہ پائے۔ کتنا بڑا فرق ہے کہ ایک شخص کو محض اپنی ذات کے اندر اور اپنی قوم کے ایک محدود دائرے میں نیک اور پاکباز بن کر رہنا ہے جبکہ ایک دوسرے شخص کو جہان میں نمونہ بن کر دکھانا ہے۔ صرف اپنی قوم کے اندر نہیں بلکہ پوری انسانیت کی سطح پر۔ اس کو زمین کے ہر خطے پر اثر انداز ہونا ہے۔

بلاشبہ دونوں کی اساس ایک ہے۔ یعنی خدائے وحدہ لاشریک کی خالص اور بلاشرکت غیرے بندگی۔ مگر وہ فرق ان دونوں میں اس لحاظ سے بہرحال قائم ہے کہ ان دونوں کو اس مشن میں کہاں پہنچنا ہے۔ اساس بلاشبہ ایک ہے مگر ایک کی بنیاد اٹھائی جاتی ہے کہ اس پر ایک چھوٹے مجمع کی اور محدود گنجائش کی عمارت کھڑی کی جائے اور ایک دوسری کی بنیاد اٹھائی جاتی ہے کہ اس پر ایک عظیم الشان اور ایک فلک

بوس عمارت کھڑی کی جاتا ہے۔ دونوں کی بنیاد اٹھانے میں عمدگی سے کام لیا جاتا ہے۔ دونوں کی بنیاد اٹھانے پر محنت اور مشقت ہوتی ہے مگر کہاں وہ بنیاد اور کہاں یہ بنیاد۔ کہاں وہ محنت اور کہاں یہ محنت۔ کہاں وہ عمدگی جو وہاں مطلوب ہے اور کہاں وہ عمدگی اور مضبوطی کا معیار جو یہاں مطلوب ہے!......

یہ فرق سب سے پہلے ہمیں خدا کی کتاب کے اندر ہی واضح طور پر نظر آتا ہے۔

ہر امت کو ہی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان کی دعوت دی جاتی رہی ہے۔ مگر کوئی آسمانی کتاب ایسی نہیں جس میں اس مسئلہ یعنی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان کو اتنا زیادہ پھیلایا گیا ہو اور پھر اس قدر اس پر زور دیا گیا ہو جتنا کہ ہم خدا کی آخری کتاب میں دیکھتے ہیں۔ ہر امت کا ہی معاملہ یہ رہا ہے کہ اس سے جن فرائض کو ادا کرنے کا مطالبہ کیا جاتا رہا ان فرائض کو اس جوہری قضیہ (اللہ اور آخرت پر ایمان) کے ساتھ براہ راست جوڑا گیا کیونکہ یہی ہر چیز کی بنیاد ہے اور یہی ہر چیز کا مصدر ومنبع۔ مگر جس طریقے سے دین کے سب فرائض اور اعمال کو اس آخری رسالت کے اندر اس جوہری قضیہ (اللہ اور آخرت پر ایمان) کے ساتھ جوڑا گیا، باوجود اس کے کہ اس امت پر عائد کردہ ذمہ داریاں کہیں زیادہ وسیع تر اور زندگی کے جوانب پر محیط تر ہیں، اور جس شدت سے فرائض کو ایمان سے برآمد کرنے کی تاکید ہوئی ہے وہ کہیں کسی اور رسالت میں نہیں پائی گئی۔[1]

پھر قرآن کے اس اندازِ ہدایت کے عین متوازی ہم رسول اللہ ﷺ کی اس سنت اور منہج کو دیکھتے ہیں جس پر آپؐ نے اصحابؓ کی تربیت فرمائی۔ خواہ یہ آپؐ کے منہج کا وہ پہلو ہو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان پہ انسان کی تمام تر توجہ اور محنت کو مرکوز کراتا ہے اور خواہ یہ آپؐ کے منہج کا وہ پہلو ہو جو اسلام کے تمام تر اعتقادی اور سلوکی فرائض کو اس جوہری قضیہ (ایمان باللہ و الیوم الأخر) کے ساتھ جوڑتا اور اسی سے برآمد کراتا ہے۔

مکی دور میں ابھی وہ احکام اور وہ ہدایات اور تعلیمات نازل ہوئی ہی نہیں تھیں جو مومن جماعت کی سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی زندگی کو چلانے کیلئے بعد ازاں نازل کی گئیں۔ یہ سارا مکی دور رسول اللہ ﷺ کی دعوتی اور تربیتی زندگی میں مختص ہی اس بات کیلئے کر دیا جاتا ہے کہ انسانی نفوس کے اندر عقیدہ کے بیج

(۱) اس موضوع پر تفصیل کیلئے آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں ہماری (محمد قطب) کتاب "لا الہ الا اللہ عقیدۃ و شریعۃ ومنہاج"، کی فصل "مقتضیات لا الہ الا اللہ فی الشریعۃ المحمدیۃ"

بہت گہرے کر کے بو دیں اور یوں ان نفوس کو ان تقاضوں کیلئے تیار کر دیں جو اس عقیدہ سے آگے چل کر جنم لیں گے اور جن کی بابت خدا کو علم تھا کہ ان کا وقت آنے والا ہے......

اب ہم ان اہل ایمان کی بابت بھی کچھ بات کریں گے جو اس حقیقت پر ایمان لائے تھے کہ ''نہیں کوئی بندگی و پرستش کے لائق خدائے وحدہ لاشریک کے سوا، اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں'' اور جو کہ بعث ونشوز اور حساب وجزا پر ایمان لائے تھے...... کیونکہ یہی وہ بنیادی جمعیت تھی جو رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں تیار ہوئی تھی اور جو کہ ہماری اس فصل کا اصل موضوع ہے...... البتہ اس گفتگو کے دوران ہمیں ہرگز اس بات سے توجہ نہ ہٹانی چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ اس قضیہ کو پیش کرنے اور اس کو لوگوں تک پہنچانے میں کس قدر تھکے ہوں گے۔ چاہے یہ آپ ؐ کی وہ محنت ہو جو آپ ؐ کو قریش کے ان طاغوتوں کے بالمقابل کرنا پڑی جو ہر دم اس دعوت کے خلاف گھات لگائے رہتے تھے اور ہر ہر طرح سے اس کے خلاف برسر جنگ رہے اور چاہے یہ آپ ؐ کا وہ مجاہدہ ہو جو آپ ؐ نے عوام کے بالمقابل جو کہ اس وجہ سے آپ ؐ کی دعوت کے خلاف برسر جنگ تھے کہ یہ ان کے موروثی عقائد اور ان کے باپ دادا کے راستے کے خاتمہ کی دعوت تھی اور پھر اس لئے بھی کہ وہ ان طاغوتوں کی زنجیرِ غلامی میں جکڑے ہوئے تھے چاہے ان میں سے کسی کو اس بات کا ادراک ہو یا نہ ہو اور چاہے کوئی اس غلامی کو بخوشی قبول کرتا ہو یا نہ۔

یہ مرحلہ، جس کی ہم بات کر رہے ہیں، آپ ؐ کی زندگی میں کچھ اس طرح گزرتا ہے کہ **لا الہ الا اللّٰہ** کے تقاضوں میں سے کچھ خاص تقاضوں پر تمام تر زور صرف کر دیا جاتا ہے اور پوری توجہ مرکوز کر دی جاتی ہے......

جہاں تک اس **لا الہ الا اللّٰہ** کی زبان سے ادائیگی کا معاملہ ہے تو وہ اس مرحلہ میں اس دعوت پر ایمان کی ایک ظاہر اور واضح علامت تھی۔ کیونکہ ابھی اس مرحلے میں شہادتین کو زبان سے ادا کر دینا سوائے ایک ایسے شخص کے جو اس پر واقعتاً اور دل سے ایمان لا چکا ہو، کسی کے بس کی بات تھی ہی نہیں۔ اس کا برتہ صرف وہی شخص رکھتا تھا جو رسول اللہ ﷺ کے روبرو ہدیۂ ایمان پیش کر کے اپنے آپ کو خطرات کے سپرد کر سکے اور اپنی جان کو چاروں طرف سے پیش آنے والی اذیت رسانی کی نذر کر سکے۔ جبکہ جاہلیت ہر طرف اس دعوت کے خلاف اعلان جنگ رکھتی تھی اور اس کے خلاف دشمنی اور عداوت کا بازار گرم کر چکی تھی۔ سو اگرچہ **لا الہ الا اللّٰہ** کا اقرار کر لینا اس وقت تک ایمان کی ایک قطعی اور یقینی علامت تھی

کیونکہ اس اقرار کی قیمت ادا کیے بنا اس وقت کوئی چارہ نہ تھا اور سوائے ایک ایسے شخص کے جو اس قیمت کے ادا کر دینے پر پوری طرح تیار ہو چکا ہو اور لا الہ الا اللّٰہ کی حقیقت کو دل سے قبول کر چکا ہو کوئی شخص اس کلمہ کا زبان سے اقرار کر ہی نہ سکتا تھا مگر پھر بھی کیا رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو کافی جانا کہ ان لوگوں نے اس لا الہ الا اللّٰہ کی دل سے تصدیق کر دی ہے اور زبان سے اقرار کر لیا ہے!؟؟

اگر رسول اللہ ﷺ بس اس بات کو کافی جان لیتے تو کیا وہ ٹھوس اور مستحکم جمعیت وجود میں آتی جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کا پورا رُخ ہی تبدیل کر دیا؟؟؟

یہ بات کافی تھی تو آخر آپ ﷺ کی دار الارقم میں ان کے ساتھ مجلسیں کیا ہوئیں؟ یہ صحبت وملاقات جو کئی سال چلی پھر کیا ہوئی؟ گھنٹوں کے گھنٹے آپ ﷺ کا ان کے ساتھ گزار دینا پھر کیا تھا؟ کیا صرف 'یہ' بتانے کیلئے ان کو لا الہ الا اللّٰہ پر ایمان لے آنا چاہیے، جبکہ وہ ایمان لا کر ہی تو آپ ﷺ کی صحبت میں بیٹھنے لگے تھے!؟ کیا ان سے لا الہ الا اللّٰہ کا 'زبان سے اقرار' کروانے کیلئے، جبکہ اس کا زبان سے اقرار کر کے ہی تو وہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے!؟ یہ سب محنت، یہ سب صحبت تو لا الہ الا اللّٰہ کے تقاضوں پر ان کو تربیت دینے کیلئے اور لا الہ الا اللّٰہ کے نقشے پر ان نفوس کو تشکیل دینے کیلئے تھی جبکہ اس سارے کام میں عملی نمونہ خود آپ ﷺ کی اپنی ذات اور شخصیت تھی۔

اس مرحلے میں بطور خاص، اور دعوت کے ہر مرحلے میں بطور عموم، اس لا الہ الا اللّٰہ کے تقاضوں میں سے ایک تقاضا حق کے معاملے میں اذیت ملنے پر صبر کرنا تھا۔ اس حقیقت کو قبول کرنا تھا کہ عقیدۂ حق کو جب آدمی قبول کر لے تو پھر اس کی راہ میں سب کچھ برداشت کرنا اس عقیدہ کا ہی ایک تقاضا ہے..... تو پھر کیا محض ایمان لے آنا اور لا الہ الا اللّٰہ کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کر لینا خود بخود انسان کو صابر بنا دیتا ہے یوں کہ اس عقیدہ کی راہ میں جو بھی اذیت آئے، آدمی اس پر صبر واستقامت کا ثبوت دے اور اس دعوت کو قبول کرنے کی جتنی بھی بڑی قیمت جان یا مال کی صورت میں دینی پڑے آدمی دے دے؟ کیا یہ کام لا الہ الا اللّٰہ کی 'تصدیق اور اقرار' سے آپ سے آپ ہونے لگتا ہے یا اس کیلئے ایک بہت ہی خاص انداز اور خاص نوعیت کی 'محنت' کرانا پڑتی ہے تا کہ انسان نفسیاتی اور شعوری طور پر وہ پختگی حاصل کر لے جو اسے ہر قسم کے دباؤ کا سامنا کرنے کی طاقت دے، بغیر اس کے کہ اس دباؤ کی شدت اور بوجھ سے انسان بے بس ہو جائے یا سرے سے راستہ چھوڑ جائے؟ اور پھر یہ

بات وہ کہاں سے سیکھیں گے؟ کیا بس یہ کہہ دینے سے کہ 'صبر کرو' سب جذبات قابو میں آ جائیں گے، عزیمتیں جوان ہو جائیں گی اور دُنیا اپنی تمام تر کشش وجاذبیت کے باوجود آدمی کی نگاہ میں حقیر و بے قیمت ہو جائے گی اور انسان اس سے کسی عظیم تر ہدف پر ہی نگاہ جمار کھے گا اور اس کی خاطر ہر قسم کی اذیت برداشت کرنے پر تیار ہو جائے گا مگر حق کے معاملے میں اپنے کردار پر کوئی آنچ نہ آنے دے گا؟؟؟ بخدا نہیں۔ بے حد ضرورت ہے کہ اس کی باقاعدہ تعلیم ہو۔ تلقین ہو۔ تربیت ہو۔ ٹریننگ دی جائے۔ شخصیتوں کو بنایا سنوارا جائے اور باقاعدہ نگہداشت کا انتظام کیا جائے ...... محض کلمات کے ساتھ نہیں بلکہ عملی نمونہ کے ذریعے جسے وہ اپنے سامنے مجسم طور پر دیکھیں، جس میں ان کو وہ سب کچھ دکھائی دے جس کی ان کو دعوت دی جا رہی ہے اور اس نمونہ کا ایک اعلیٰ معیار ہو۔ تب وہ اس سے سیکھیں اور اس پر عمل پیرا ہوں......

چنانچہ سید الرسل ﷺ کو اس ظلم واذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے پہاڑ ہوں تو وہ بھی ہل جائیں......

جھٹلائے جانے کی اذیت، جبکہ ایک صادق اور امین کو صاف جھوٹا کہہ دیا جائے تو یہ کس قدر شاق گزرتا ہے...... مذاق اور استہزاء کی اذیت اور جبکہ حق پر ایمان رکھنے والے کو ٹھٹھہ اور مذاق ہو تو یہ کس قدر اذیت ناک ہے جبکہ وہ جانتا ہو کہ جس چیز پر وہ ایمان رکھتا ہے حق دراصل وہی ہے۔ خیر بھی وہی ہے۔ ہدایت بھی وہی ہے اور نجات اور فلاح بھی اسی میں ہے اور یہ کہ ٹھٹھہ اور استہزاء کرنے والے پرلے درجے کے جاہل اور گمراہ ہیں...... یہ سب کتنی بڑی اذیت ہے۔ پھر آپ ؐ کو مخالفانہ پراپیگنڈہ کی اذیت دی جاتی ہے۔ ہر طرف بدنام کر دیا جاتا ہے۔ اچھوت بنا دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لوگوں کیلئے ایک ہوّا بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ لوگ چاہیں بھی تو کسی کو آپ ؐ کی آواز میں آواز ملانے کی آزادی نہیں۔ حتیٰ کہ بات سننے کی اجازت نہیں۔ لوگ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر پاس سے گزرتے ہیں۔ جسمانی طور پر اذیت دی جاتی ہے۔ نفسیاتی طور پر مجروح کیا جاتا ہے۔ پتھر پڑنے تک نوبت آتی ہے۔ یہاں تک کہ خون بہہ کر پیروں تک پہنچتا ہے، راستے میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں جیسا کہ ابولہب اور اس کی بیوی کرتے رہے۔ سجدے میں پڑے ہوئے سر پر غلاظت لا کر دھر دی جاتی ہے جبکہ آپ اپنے رب کا ذکر کرنے میں مصروف ہیں...... غرض اذیت کی ہزاروں صورتیں ہیں جو آپ ؐ پر حملہ آور ہوتی ہیں۔

یہ سب کچھ آپ ﷺ کو حق کے ساتھ تمسک میں اور بھی پختہ کر دیتا ہے۔حق پر آپ ﷺ اور بھی بڑھ کر اصرار کرنے لگتے ہیں ...... پھر دوسری طرف لالچ دیے جاتے ہیں۔دل فریب پیشکشیں ہوتی ہیں۔ انسان کو دُنیا میں جس کسی بات کی چاہت ہو سکتی ہے، وہ لا حاضر کی جاتی ہے۔اقتدار و بادشاہت، دولت و سرمایہ، جاہ و حشمت، چودھراہٹ۔مگر وہ اپنے چچا کو پیشکش لانے والوں کیلئے جواب دے دیتے ہیں "بخدا اے چچا۔یہ لوگ کبھی سورج لا کر میرے دائیں ہاتھ پہ دھر دیں اور چاند میرے بائیں ہاتھ میں تھما دیں، اس امید پر کہ میں اس مشن سے باز آ جاؤں تو بھی میں اس کو چھوڑنے والا نہیں چاہے میں اس کو سرے پہنچانے میں ہلاک کیوں نہ ہو جاؤں"۔(۱)

یوں اس طریقے سے رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کو ایک سبق پڑھاتے ہیں۔یہ سبق محض کلمات کے ساتھ نہیں۔گو کہ کلمات بھی سبق اور تعلیم دینے میں مطلوب ہوتے ہیں۔دراصل یہ ایک عملی سلوک ہے جو کہ کلمات کی عملی شرح کا کام دیتا ہے اور یوں 'کلمات' کو 'عملی حقائق' میں بدل دیتا ہے۔جس کی بدولت یہ عملی حقائق دنیائے واقع میں نظر آنے لگتے ہیں۔

**لا الہ الا اللہ** کے اس وقت کے تقاضوں میں ___ بلکہ ہر وقت کے تقاضوں میں ___ یہ بات تھی کہ آدمی دل کو خدا کی محبت سے بھر لے۔خدا کی عظمت و کبریائی کو ہر دم نگاہ میں رکھے۔خدا سے جڑا رہے۔خدا کی جانب رخ کئے رکھے اور اپنے ہر رویہ و سلوک کے اندر خدا کے تصور اور شعور کو جلی کرے۔تو کیا ایسا ممکن تھا کہ آدمی زبان سے اس **لا الہ الا اللہ** کا اقرار کر لے اور 'تصدیق' کے فریضہ سے عہدہ برآ ہو جائے تو بس اتنا ہو جانے سے آپ سے آپ ہی آدمی کے اندر یہ شعور اور احساس گھر کر لے اور اس کے رویہ و سلوک میں خدا کا ہمہ وقتی تصور بولنے لگے؟ یا پھر اس کیلئے تعلیم اور تلقین اور یاددہانی اور تربیت کی ضرورت تھی؟

نفوس کو یہ رخ دینا اور دلوں میں یہ چیز پیدا کرنا مربی اعظم ﷺ کے سوا کس کا کام ہو سکتا تھا؟ یہ عمل بھی صرف الفاظ کا ضرورت مند نہیں بلکہ یہ ایک عملی کردار تھا کہ جس کو اصحاب رضی اللہ عنہم چھوئیں۔محسوس کریں اور سیکھیں۔آپ ﷺ کو ہر لحظہ خدا کے ذکر میں مشغول پائیں۔خدا کی جانب متوجہ پائیں۔آپ ﷺ کو ہر لحظہ خدا کی رحمت پہ نظر جمائے ہوئے دیکھیں۔خدا کے آگے عاجز اور منکسر، تائب، دُعائیں کرتے ہوئے اور خدا کو

(۱) یہ واقعہ بیشتر کتبِ سیرت میں دستیاب ہے

پکارتے ہوئے، انابت کا نمونہ بنے ہوئے آپ ﷺ کو وہ ہر وقت دیکھیں۔

**لا الہ الا اللّٰہ** کے اس وقت کے تقاضوں میں ___ بلکہ ہر وقت کے تقاضوں میں ___ یہ بات تھی کہ خدا کی قضاء اور قدر پر ایمان پیدا کیا جائے۔ اس بات پر ایمان پختہ کیا جائے کہ بس وہی ہے جو ہر معاملے کی تدبیر کرتا ہے۔ وہی ہے جو فیصلے کرتا ہے۔ جو چاہے کر گزرتا ہے۔ زمام امور اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اکیلا وہی رزق دیتا ہے۔ تنہا وہی نفع نقصان کا مالک ہے۔ زندگی اور موت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ہر چیز کا مالک وہی ہے۔ ہر واقعہ اسی کا رہین اشارہ ہے۔ کائنات کے اندر اور انسانوں کے سب معاملات میں اسی کا تصرف چلتا ہے۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی چیز رونما نہیں ہوتی۔ جب تک وہ نہ چاہے کچھ نہیں ہوتا اور جو وہ چاہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

تو کیا محض **لا الہ الا اللّٰہ** کی تصدیق کر دینا اور اس کا بس زبان سے اقرار کر لینا اس بات کیلئے کافی تھا کہ اتنا ہونے سے آپ سے آپ ہی قضا و قدر پر ایمان دلوں میں جنم پالے اور نفوس کے اندر گہرا اتر جائے؟ یا پھر اس کیلئے تعلیم اور تلقین کی ضرورت تھی اور نفوس کو ایک رخ دینے اور رویہ و سلوک کو خاص انداز سے تربیت دینے کی احتیاج تھی؟ اور کیا اس بات کو دلوں میں راسخ کرنے کیلئے اتنا کافی تھا کہ آپ ﷺ ایک تقریر یا چند تقاریر فرما دیں یا کوئی درس دے دیں یا کسی سلسلہ دروس کو کافی جانیں؟ یہ کوئی 'نظریہ' نہیں جس کو درسی انداز میں پڑھایا جائے یا حفظ کرایا جائے اور پھر اس میں آدمی کا درسی انداز میں ٹیسٹ لیا جائے۔ یہ تو عملی سبق ہے اور عملی امتحان۔ یہ مرغوبات نفس سے ہر لحظہ کا ٹکراؤ ہے۔ شہواتِ نفس سے ہر وقت کی مڈ بھیڑ ہے۔ نفس کے وسوسوں کے خلاف ہر لحظہ مزاحمت ہے۔ یہ زندگی کے ہر مشکل مقام سے ایمان اور استقامت کے ساتھ گزرنا ہے۔ زندگی کے تلخ و ترش سے ایمانی اسباق لینا ہے۔ اس میں سبق یاد کرنا تو ہے مگر یہ صرف دماغی کام نہیں یہ وجدان کی شرکت بھی چاہتا ہے، شعور کی بھی۔ یہ اعصاب کا بھی امتحان ہے۔ یہ اعضاء کا بھی عمل ہے۔ یہ روح کو بھی مشغول کرتا ہے اور نفس کو بھی تسخیر کرتا ہے۔ غرض انسان کی کل ہستی ہی اس ایمان کا سبق یاد کرتی ہے۔

پیشتر ازیں، میں اپنی کسی کتاب (۱) میں کہہ چکا ہوں:

"اگر آپ کسی انسان سے پوچھیں: تمہیں رزق دینے والا کون ہے؟ تو وہ جھٹ سے بولے

---

(۱) کتاب "واقعنا المعاصر"

گا: خدا کی ذات! گویا یہ ایک بدیہی بات ہے مگر خدانخواستہ جب اس پر کبھی رزق کی تنگی ہو ہو یا یوں کہیے جب اس کے رزق کا نقصان ہوتا ہوا نظر آئے، تب وہ کیا کہتا ہے؟ فلاں نے میری روزی چھین لی، یا یہ کہ 'فلاں میری روزی چھیننے کے درپے ہے'! اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ اس سے ثابت یہی ہوتا ہے کہ جو بات اس نے جھٹ سے کر دی تھی اور جو ہم کو 'سامنے کی بات' لگتی تھی اس کو 'حقیقت' بن جانے کیلئے وقت چاہیے تھا اور ایک شدید محنت بھی۔ یا یوں کہیے جو چیز عقلی اور ذہنی طور پر ایک بدیہی حقیقت نظر آئے اس کو وجدان بننے کیلئے کئی مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔ ذہن میں اترنے کے باوجود دل میں گھرنے کیلئے ایک حقیقت کو وقت چاہیے اور محنت بھی۔ پھر اس دل میں اتری ہوئی حقیقت کو رویہ وسلوک میں ڈھلنے پر تو اور بھی محنت ہوتی ہے۔ زبان سے مان لی جانے والی چیز احساسات کے اندر بھی بسنے لگے اور وہ احساسات پھر ایک رویہ اور کردار کو جنم دیں، بلاشبہ یہ ایک محنت طلب کام ہے"۔

سورۃ بقرہ کی ایک آیت پڑھتے ہوئے ایک بار میری توجہ معاً ایک بات پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُم مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ (البقرہ:۴۹)

"یاد کرو وہ وقت جب ہم نے تم کو فرعونیوں کی غلامی سے نجات بخشی۔ انہوں نے تمہیں سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ تمہارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس حالت میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی"۔

دو باتیں یکجا کر دی گئیں: بنی اسرائیل پر 'بدترین عذاب' آل فرعون کی جانب سے روا رکھا جاتا ہے (آل فرعون يسومونكم سوء العذاب يذبحون ابناء كم ويستحيون نساء كم) مگر 'ابتلا' یہ خدا کی جانب سے ہے (وفي ذلكم بلاء من ربكم عظيم)!

جب کسی انسان پر کوئی انسان ظلم وستم ڈھائے تو کیا 'جھٹ سے' یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ یہ ابتلا خدا کی جانب سے ہے؟ ذہن فوری طور پر اسی شخص کی جانب جاتا ہے جس کے ہاتھ میں کوڑا نظر آئے۔ بڑی محنت کے بعد جا کر انسان کو یہ بات سمجھانے اور ذہن نشین کرانے میں کہیں کامیابی ہوتی ہے

کہ بظاہر تو یہ اسی شخص کا فعل ہے مگر اس کے پیچھے خدا کی فاعلیت ہے۔ سو یہ فعل کسی انسان کی جانب سے ہے مگر ابتلا خدا کی جانب سے۔ پھر جب وہ اس بات کو پا لیتا ہے اور یہ بات اس کے قلب وشعور میں جاگزیں ہو جاتی ہے تب وہ اس ابتلاء کو دور کرانے کیلئے کس کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور کس سے درخواست کرتا ہے؟ یہی وہ درس ہے جو ہمیں ایمان کی اس حقیقت سے لینا اور یاد کرانا ہوتا ہے!

اس کا یہ مطلب نہیں کہ مومن جب خدا کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور تبدیلیِ حالت کیلئے خدا سے درخواست کرتا ہے تو وہ 'اسباب' کو نظر انداز کر دیتا ہے مگر اب وہ 'اسباب' پہ سہارا نہیں کرتا اور نہ وہ یہ سوچتا ہے کہ اسباب میں آپ سے آپ کچھ کر دینے کی خاصیت ہے۔ اب وہ یقین رکھتا ہے کہ اسباب خواہ وہ ہوں جو وہ خود اختیار کرتا ہے یا اسباب وہ ہوں جو اس کے خلاف اختیار کئے جاتے ہیں سب خدا کے اشاروں کے پابند ہیں۔ خدا کی مقرر کی ہوئی حدود میں رہ کر کام کرتے ہیں۔ تب اس کا تمام تر رخ اس ذات کی جانب رہتا ہے جو فیصلے کا اصل مالک ہے جس کے اذن سے ہی کوئی حادثہ جنم لے سکتا ہے اور جس کے حکم سے ہی کوئی شخص حرکت کر سکتا ہے...... اور وہ ذات اللہ ہے جو ہر چیز پہ انتہائی دسترس رکھنے والا ہے۔

لا الہ الا اللہ کے اُس وقت کے تقاضوں میں ___ بلکہ ہر وقت کے تقاضوں میں ___ یہ بات تھی کہ آدمی خدا واسطے کی اخوت رکھے۔ کسی سے محبت رکھے تو خدا واسطے کی محبت ہو۔ بغض رکھے تو خدا واسطے کا بغض ہو۔ دوستی ہو تو خدا واسطے کی۔ براءت ہو تو خدا واسطے کی (الولاء والبراء فی اللہ)...... اب یہ سب باتیں اس عرب ماحول کے لحاظ سے، بلکہ قدیم اور جدید ہر جاہلی ماحول کے لحاظ سے، کچھ ایسی باتیں تھیں جو کہیں سننے میں آئیں اور نہ دیکھنے میں۔ یہ ماحول اور رسم کے بالکل برخلاف چلنا تھا......

جہاں تک عرب جاہلیت کی بات ہے تو اس کے اندر خونی رشتہ ہی وہ اصل رشتہ تھا جو کہ توانا اور دیرپا جانا جائے۔ اس کے سوا ہر رشتہ یا تو کمزور و لاغر تھا اور یا پھر سرے سے غیر موجود......

اپنی اس آج کی جاہلیت میں پرانی جاہلیت کے اس محدود 'رشتۂ قرابتِ خون' کی جگہ 'قوم' اور 'وطن' کے رشتے نے لے لی جو کہ آج کی جاہلیت کی نظر میں تفاخر کی بنیاد ہے اور جس کی عصبیت آج ویسے ہی پائی جاتی ہے جیسی عصبیت پرانی عرب جاہلیت کے اندر خون اور قبیلہ وبرادری کیلئے پائی جاتی تھی

......پس اگر کوئی اختلاف آیا ہے تو وہ 'حجم' میں آیا ہے نہ کہ 'جوہر' میں!

جہاں تک محبت اور بغض کا تعلق ہے تو وہ پرانی عرب جاہلیت ہو یا کسی بھی اور دور کی جاہلیت، اس کی بنیاد انسان کے مفادات ہیں اور زیادہ تر یہ مادی اور عارضی مفادات ہوتے ہیں...... یا پھر ایک اور جہت سے، اس کی بنیاد انسان کی انا ہوتی ہے: 'میں'، 'میری بڑائی'، 'میری دولت'، 'میرا اقتدار'، 'میری قوم' اور 'میں' اگر کوئی لیڈر رہوں تو 'میرے پیچھے چلنے والے' اور 'میں' اگر کوئی عام شخص ہوں تو 'میرے بڑے' اور 'میرے لیڈر'......!

پھر جہاں تک (ولاء و براء) دوستی و دشمنی کا تعلق ہے تو اس کا معاملہ بھی محبت اور بغض جیسا ہی ہے۔ اس کا بھی کوئی مستقل اصول نہیں سوائے ان مفادات کے جو آج یہاں پائے جا سکتے ہیں تو کل وہاں ......سو اس کی صورتیں بدلتی ہی رہیں گی۔ یہ کہیں ایک جگہ پر رک جانے والا معاملہ نہیں۔ آج جو دوستی ہے کل وہ دشمنی میں بدل سکتی ہے۔ آج کے دشمن کل کے دوست ہو سکتے ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کہ کسی کے اصول بدل جائیں گے یا قدروں اور معیاروں میں کوئی تبدیلی آئے گی بلکہ اس وجہ سے کہ مفادات کوئی اور صورت دھار سکتے ہیں۔ 'مفادات' کا کیا ہے آج کہیں ہیں تو کل کہیں اور ہوں۔ 'وفاداریوں' کو ان کے ساتھ ہی جگہ بدلنی ہوگی...... جاہلیتیں سب کی سب، ہر جگہ اور ہر دور کی جاہلیتیں اس معاملے میں ایک سی ہیں!

تو کیا محض لا الہ الا اللّٰہ کی تصدیق کر دینا اور اس کا بس زبان سے اقرار کر لینا اس بات کیلئے کافی تھا کہ ایک اتنی بڑی تبدیلی قلب و ذہن کے اندر جنم لے لے اور جاہلیت کا پورا نظام، جاہلیت کی رسم اور ریت، جاہلی سیاست، جاہلی معیشت، جاہلی اجتماعیت، جاہلی سوچ اور جاہلی رویے...... غرض جاہلیت کی پوری عمارت جس بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے شعور کی دُنیا میں وہ سب جاہلی بنیاد دھڑام سے گر جائے؟ یا پھر اس کیلئے تعلیم و تلقین کی ضرورت تھی اور نفوس کو ایک خاص رخ دینے اور رویہ و سلوک کی ایک خاص انداز میں صورت گری کرنے کی احتیاج تھی؟

بے شک لا الہ الا اللّٰہ انسانی نفس کو ایک بڑی تبدیلی کیلئے تیار کر دیتا ہے اور اس کو تبدیلی کی راہ پر بھی ڈال دیتا ہے...... پھر بھی اس لا الہ الا اللّٰہ کی بنیاد پر جنم پانے والی نئی قدریں، نئے معیار، نئے پیمانے، نئے حقائق، نئے رشتے اور نئی زندگی، سب کچھ ایک لحظہ کے اندر وجود میں نہیں آ جاتا۔ سب کچھ آپ سے نہیں ہو جاتا...... باوجود اس کے کہ وہ ایمان ہی کا لحظہ ہوتا ہے۔ نئی عمارت بہر حال ایک ایک

اینٹ کر کے بنتی ہے تا آنکہ وہ ایک خاص حد تک استوار ہو جائے......

یہ کام بہر حال 'تربیت' کا متقاضی ہے۔

اور یہ وہ کام ہے جو مربی اعظم ﷺ نے بااحسن انداز انجام دیا۔ ایک تسلسل کے ساتھ لگا تار محنت کر کے، توجہ کے ساتھ، ہوشمندی کے ساتھ، ہمہ وقت نگرانی، پوری پوری نگہداشت، ترغیب، تحریص، جائزہ، احتساب...... یہاں تک کہ آپ اس کام کو اس اعلیٰ مقام تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ تب خدا واسطے کی اخوت نفوس کے اندر خونی رشتوں پر برتری لے جانے لگی۔ محبت اور بغض کو ارضی مفادات سے کوئی سروکار نہ رہا۔ جہاں ایک طرف مفادات اور انا کا پلڑا ہوتا اور دوسری جانب خدا واسطے کے رشتے اور خدا واسطے کی وفاداری کا سوال اٹھتا، وہاں 'خدا واسطے' کا پلڑا ہی جھک جاتا۔ دوستی و دشمنی ایمانی قدروں کے ساتھ ہی مستقل طور پر وابستہ ہوتی...... یوں نفس کو ان سب معنوں میں اللہ کیلئے خالص کر دیا گیا۔

**لا الہ الا اللہ** کے اس وقت کے تقاضوں میں ___ بلکہ ہر وقت کے تقاضوں میں ___ کچھ اعلیٰ اخلاقی قدریں بھی آتی تھیں۔

**لا الہ الا اللہ** کے تقاضوں میں کچھ تو وہ اخلاقی قدریں تھیں جو عرب ماحول کے اندر پائی تو جاتی تھیں مگر جاہلیت نے ان کو خراب کر کے کچھ اور رخ دے دیا تھا اور جس کے باعث وہ اصل معنی میں مکارم اخلاق نہ رہے تھے...... مثلاً دلیری اور بہادری جو کہ عربوں کے ہاں پائی جاتی تھی مگر جاہلیت نے اس کو جاہلی حمیت میں تبدیل کر دیا تھا جیسا کہ سورۃ فتح(۱) میں اس کا ذکر ہوا...... یا جیسے مثلاً جود و سخاوت تھی جو عربوں میں بے پناہ پائی جاتی تھی اور جس کو جاہلیت نے مکارم اخلاق کی بجائے کچھ اور رخ دے دیا تھا، اور اس جود و سخاوت کو مال لٹا کر دھوم پانے کی چاہت میں تبدیل کر دیا تھا، جیسا کہ اس کا سورہ البقرہ(۲) میں ذکر ہوا ہے اور جس کی کہ تصحیح کرنے کی ضرورت تھی کہ کرم و سخاوت اپنی اصل فطری روش پہ آ جائے اور خالصتاً ایک اخلاقی قدر بن جائے اور تا کہ کرم اور سخاوت بھی خدا واسطے کا ہو جائے۔

جبکہ **لا الہ الا اللہ** کے تقاضوں میں کچھ اخلاقی قدریں وہ تھیں جو عرب جاہلیت میں کہیں نہیں پائی جاتی تھیں اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ وہ دُنیا کی کسی جاہلیت میں پائی جائیں۔ مثلاً انسانوں کو آپس

(۱) سورۃ الفتح: ۲۶ "جب کفر کرنے والوں نے اپنے دلوں میں حمیت پیدا کی، نری جاہلی حمیت"
(۲) سورۃ البقرۃ: ۲۶۴ "مانند اس شخص کے جو خرچ کرتا ہے اپنا مال محض لوگوں میں دھوم کرنے کیلئے"

میں ایک دوسرے پر ظلم سے روکنا اور انسانی زندگی کو جنگل کے قانون کی بجائے عدل اور قسط پر قائم کرنا اور انسان کا، اس کے رنگ یا اس کی قومیت یا اس کی زبان یا اس کے وطن یا اس کی سماجی حیثیت یا اس کی سیاسی اور معاشی اوقات سے قطع نظر، محض بطور انسان ہی احترام کرنا(۱)...... جو کہ ممکن ہی نہیں جب تک کہ نفس اللہ کیلئے تجرد حاصل نہ کرلے۔

یہاں ہمارے پیش نظر یہ نہیں کہ ہم لا الہ الا اللہ کے سب تقاضوں کا کوئی علی سبیل الحصر ذکر کریں۔ حتی کہ لا الہ الا اللہ کے ان تقاضوں کا احاطہ بھی یہاں ہمارے ہاں پیش نظر نہیں جو مکی دور میں سامنے لائے گئے۔ یہاں ہمارے اس بات کرنے کا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ یہ کلمہ، جب سے یہ خدا کے ہاں سے نازل ہوا ہے، کبھی بھی محض تصدیق کرنے اور زبان سے اقرار کرنے کا نام نہ تھا جیسا کہ ارجائی فکر لوگوں کو باور کراتا ہے...... اور یہ کہ محض تصدیق کرنا اور زبان سے اقرار کرنا، حتی کہ اُس وقت بھی جب زبان سے لا الہ الا اللّٰہ بول دینا دل گردے کا کام تھا اور اس کا اعلان کردینا دُنیا بھر کے خطرات کو دعوت عام دینا تھا اور اس پر صرف وہی شخص تیار ہوتا تھا جو واقعتاً اس پر ایمان لاچکا ہو، لا الہ الا اللّٰہ کا یہ اقرار اور تصدیق آپ سے آپ اُس وقت بھی انسان سے وہ کارنامے نہ کرواتی تھی جو کہ اس لا الــــہ الا اللہ کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں تربیت پاکر آدمی سے رونما ہونے لگتے تھے۔

وہ سب کچھ جو مسلمانوں کی اس مٹھی بھر جماعت نے مکی دور میں کر دکھایا تب ہی ممکن ہوا جب وہ اس لا الہ الا اللّٰہ پر اس کے تقاضوں سمیت ایمان لائے اور پھر ان تقاضوں پہ تربیت پانے پر سرگرم ہوئے اور پھر دُنیائے واقع میں اس کو عمل کی حقیقت میں بدل دینے پر تیار ہوئے......

اس گفتگو سے ہمارے پیش نظر یہ ثابت کرنا بھی نہیں کہ لا الہ الا اللّٰہ کے تقاضوں پر اس مسلم جماعت کی تربیت کر دینا ہی وہ منفرد ترین کام تھا جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کے مکی دور میں انجام

---

(۱) جمہوریت کو زعم ہے کہ اسی نے سب سے پہلے دنیا میں یہ اصول متعارف کرائے اور ان پر عمل کر کے دکھایا اور ''فریقِ دیگر'' کو وجود کا حق دیا اور آزادیِ اظہار کا حق بھی۔ مگر یہ جمہوریتیں بوسنیا ہرزگووینا، چیچنیا، فلپائن، کشمیر، فلسطین، بلکہ شاید اب تو ہر جگہ جہاں مسلمانوں پر یہود و نصاریٰ یا دیگر کفار کا اقتدار ہو، اپنی حقیقت کو طشت از بام کرنے سے نہیں رہ سکتیں۔ اس کے مقابلے میں تاریخ کے وہ ادوار بھی ذرا دیکھ لئے جائیں جب مختلف خطوں میں مسلم اقتدار کے تحت یہود اور نصاریٰ و دیگر اہلِ کفر رعایا بن کر رہتے تھے کہ وہاں ان کو کیسا انصاف اور عدل اور رواداری میسر رہی تھی۔

دیا۔لا الـــه الا اللّٰـــه کے تقاضوں پر ایک مسلم جماعت کی تربیت اور تیاری تو ہر اس داعی اور مربی سے مطلوب ہے جو کسی بھی بقعۂ ارض میں یا تاریخ کے کسی بھی دور میں اسلام کی دعوت کو کھڑا کرنے کے کام کو ہاتھ ڈالتا ہے۔ یہ تو ہر قیادت سے ہمیشہ ہی مطلوب ہے۔ دراصل وہ منفرد ترین کام جو رسول اللہﷺ نے اس سلسلہ میں بالفعل انجام دیا، یہ تربیت کی وہ حیرت انگیز حد تک بلند سطح تھی جس تک رسول اللہﷺ نے صحابہ کو پہنچا دیا تھا۔لا الہ الا اللّٰہ کے تقاضوں پر ایک انسانی جماعت کی اس درجہ کی تربیت رسول اللہﷺ ہی کا کام تھا......تربیت کی وہ سطح جس میں واقعیت اور مثالیت ایک ہو گئی تھی۔ جس میں مندوبات اور مستحبات نفوس کے اندر فرائض اور واجبات کا درجہ اختیار کر گئے تھے۔ نیکیاں جو محض مستحب تھیں اور خدا ورسول ان کو اس کا پابند تک نہ کرتے تھے یہ آپ سے آپ اس کے پابند ہو جاتے تھے...... یہ یوم آخرت پر ایمان کی وہ بلند سطح تھی جس پر وہ پہنچ گئے تھے یوں کہ گویا ان کا ہر لحہ اِس جہان میں نہیں بلکہ اُس جہان میں گزرتا تھا۔ عالم آخرت کے آنے میں ان کے ہاں 'صدیاں' باقی نہ رہی تھیں۔ یہ ہے وہ اصل امتیاز جو اسلام کی اس نسلِ اول نے اس مربی اعظمﷺ کے ہاتھوں تربیت پا کر قائم کر لیا تھا۔ یہ محض لا الـــه الا اللّٰـه کے تقاضوں کی پابندی نہ تھی، جو کہ ہر دور کے داعیوں سے ہی مطلوب ہوا کرتی ہے بلکہ یہ اس لا الـه الا اللّٰہ کے تقاضوں کی پابندی میں ایک منفرد ترین سطح تک پہنچنا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

لا الـه الا اللّٰه کے یہ تقاضے پھر رفتہ رفتہ وسعت اختیار کرنے لگے۔ ان میں اب نفسِ انسانی اور حیاتِ انسانی کے نئے نئے جوانب شامل کر دیئے جانے لگے۔ جن کو ایک ایک کر کے وہ علیم و خبیر وحی کے پیغامات کی صورت میں اتار رہا تھا۔ اس کے علم اور حکمت کا جب اور جیسا تقاضا ہوتا ویسی ہی وحی اترتی اور اہل ایمان لا الـه الا اللّٰـه کے ایک کے بعد ایک تقاضے کے پابند ہوتے چلے گئے۔ جونہی کسی نئے تقاضے کا اضافہ ہوتا پہلے تقاضے ایک صاحب ایمان کو صاحب ایمان رہنے کیلئے کافی نہ رہتے۔

امام ابو عبید القاسم بن سلام (۱۵۷ھ۔۲۲۴ھ) اپنی کتاب الایمان [1] کے صفحہ ۵۴ و مابعد فرماتے ہیں:

---

(۱) بہ تحقیق علامہ ناصر الدین البانی، مطبوعہ سن ۱۴۰۵ھ دار الارقم کویت

''ہم نے جب اس مسئلہ کو بعثتِ نبوی اور تنزیلِ خداوندی کی جانب لوٹایا تو یہی پایا کہ خدا نے ایمان کی اساس اس بات کو بنایا کہ آدمی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت وبندگی کے لائق نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ پس نبی ﷺ مکہ کے اندر ایک عشرہ سے زائد قیام کے دوران اسی شہادت کو ادا کر دینے کی دعوت دیتے رہے۔ تب ابھی ''ایمان'' جو بندوں پر فرض تھا اس ''شہادت'' کو ادا کر دینے کے سوا کچھ نہ تھا۔ پس جس نے اس پر لبیک کہا وہ مومن ٹھہرا۔ اس کے علاوہ ابھی دین کے اندر وہ کسی بات کا پابند نہ تھا۔ نہ ابھی اس پر زکات فرض تھی نہ روزے اور نہ دوسرے شرعی احکام۔ لوگوں پر اُس وقت جو یہ تخفیف تھی، جیسا کہ علماء بتلاتے ہیں، خدا کی جانب سے بندوں پر نرمی اور مہربانی تھی۔ کیونکہ وہ ابھی ابھی جاہلیت کو اور جاہلی گم گشتہ راہی کو چھوڑ کر اسلام میں آئے تھے۔ اگر وہ فوراً ان کو سب کے سب فرائض کا پابند کر دیتا تو ان کے دل اس سے فرار اختیار کرنے لگتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا زبان سے اقرار کیا جانے کو ہی وہ ''ایمان'' جانا جو کہ ان سے تاحال مطلوب تھا۔ مکہ کی زندگی وہ اسی حال پر رہے۔ مدینہ کے اندر بھی ڈیڑھ سال کے لگ بھگ عرصہ یہی معاملہ رہا۔ پھر جب اسلام کے اندر وہ خوب انابت اختیار کر گئے اور اس میں انکی رغبت بڑھی تب اللہ تعالیٰ نے ان پر کچھ مزید ''ایمان'' فرض کر دیا اور وہ یہ کہ ان کو بیت المقدس کی بجائے اب کعبہ کی طرف کر کے نماز پڑھنا تھا...... پس اگر وہ کعبہ کی جانب تحویلِ قبلہ کر دیا جانے کے بعد ایک دن بھی کعبہ کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنے سے انکاری ہوتے اور ''ایمان'' کی اُسی پچھلی حالت کو اپنے لئے کافی جانتے جس کی بنا پر اس سے پہلے وہ مومن کہلانے کا حق رکھتے رہے تھے...... اور اُسی قبلہ پر مصر رہتے جس کی جانب ان کی پڑھی ہوئی نماز اس سے پہلے قبول ہو جاتی رہی تھی تو اب وہ ان کو ہرگز ہرگز کفایت نہ کرتا بلکہ ایسا کرنے سے ان کا وہ پہلا اقرار ہی کالعدم ٹھہرتا۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے وہ جو اطاعت کرتے رہے تھے وہ اِس اطاعت سے کوئی بڑھ کر ''ایمان'' کہلانے کی حقدار نہ تھی جو کہ ان کو اب کرنا تھی۔ اب جب انہوں نے فریضۂ نماز کو بھی ویسے ہی قبول کیا جیسے کہ اس سے پہلے

اقرارِشہادت کے فریضہ کو قبول کر کے مسلمان ٹھہرے تھے تو اب یہ دونوں ہی باتیں ان کیلئے وہ ''ایمان'' کہلاتا تھا جو کہ اب تک ان پر فرض ہوا تھا۔یعنی''فریضہَ اقرار'' کے ساتھ اب''فریضہَ نماز'' کو بھی شامل کردیا گیا تھا......اب وہ کچھ عرصہ اس حالت پر رہے۔پھر جب نماز میں ان کو جس طرف کو کہا گیا وہ ادھر ہی کو اور بلا تاخیر رخ کر لینے پہ آمادہ ہوئے اور دلوں میں اس پر شرح صدر پایا تب اللہ نے ان کے''ایمان'' میں زکوٰۃ کا فرض شامل کردیا۔اب ایمان کے پہلے سے موجود فرائض کے ساتھ زکوٰۃ آ شامل ہوئی۔جیسا کہ ارشاد ہوا: وأقیموا الصلوۃ وآتوا الزکوۃ (البقرۃ:۸۳،۱۱۰)اور فرمایا:خذ من أموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا (التوبۃ:۱۰۳)اب اگر وہ زکوٰۃ کو بس زبان سے قبول کرتے اور عملاً صرف نماز پڑھتے مگر زکوٰۃ نہ دیتے تو یہ بات ان کے پچھلے کئے پر بھی پانی پھیر دیتی اور یہ ان کے اقرارِشہادت اور اقامتِ صلوٰۃ ہردو کو کالعدم کردیتی جیسا کہ اس سے پہلے ان کا نماز پڑھنے سے انکاری ہونا،ان کے اقرارِ شہادت کے منافی ہوتا۔اس کی ایک زبردست دلیل ابوبکر صدیق ؓ کا مہاجرین اور انصار کی معیت میں زکوٰۃ نہ دینے کے مسئلے پر عربوں کے خلاف جہاد کرنا تھا۔ابوبکرؓ کا ان سے یہ جہاد کرنا ویسا ہی تھا جیسا رسول اللہ ﷺ کا اہل شرک کے خلاف جہاد کرنا۔ان دونوں میں کوئی بھی فرق نہ تھا۔چاہے وہ مانعینِ زکوٰۃ کی قتل وخونریزی ہو۔چاہے ان کی ذریت کو غلام بنانے کا مسئلہ ہو اور چاہے ان کے مال کو مال غنیمت بنانے کا۔جبکہ وہ محض مانعین زکوٰۃ تھے نہ کہ منکرین زکوٰۃ۔پھر ایسا ہی معاملہ اسلام کے باقی احکام وشرائع کا ہوا!......جب بھی شریعت کا ایک نیا حکم اترتا تو وہ شریعت کے اس سے پہلے کے نازل شدہ احکام کے ساتھ شامل کردیا جاتا۔جو پہلے احکام کی حیثیت ہوتی اب وہ اس نئے حکم کی حیثیت ہوتی،ان سب احکام پر عمل پیرا ہونے کو مجموعی طور پر''ایمان'' کا نام دیا جاتا اور ایسا کرنے والوں کو مومن۔یہ ہے وہ مقام جہاں وہ لوگ مغالطے کا شکار ہوئے جو ایمان کو محض زبان کا قول قرار دیتے ہیں''۔

☆☆☆☆☆☆☆

اگر ہم اس ٹھوس بنیادوں کی حامل ایمانی جمعیت پر نگاہ ڈالیں جسے رسول اللہ ﷺ نے تیار کیا تھا اور اس کی اٹھان پر ذرا غور کر لیں تو اس کے بعد پھر اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں کہ آخر وہ ہدف کیا تھا جس کی خاطر رسول اعظم ﷺ نے اپنے مکہ کے تیرہ سال اور مدینہ کے دس سال اس قدر عظیم الشان محنت کی اور کس مقصد کیلئے ایسے زبردست اور منفرد ترین انسانی نمونے تیار کئے؟ کیا محض اس لئے کہ آپ اہل ایمان کی ایک جماعت بنا جائیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو نماز قائم کرتی ہو زکوۃ دیتی اور خدا کی عبادت گزار ہو!؟

یہ ہدف حاصل کرنے کیلئے اس محنت کا ایک حصہ ہی کافی تھا جو آپ نے مبذول فرمائی تھی۔ بلاشبہ یہ ایک برگزیدہ ہدف ہے اور اس پر محنت کئے جانے کا حق بنتا ہے مگر رسول اعظم ﷺ اس عمل سے اس سے بھی ایک بڑے اور برگزیدہ ہدف کو حاصل کرنا چاہتے تھے، جیسا کہ پیچھے اس امر کی جانب ہم اشارہ کر آئے ہیں......

اس جمعیت کا مشن دراصل صرف اتنا نہیں تھا کہ جیسے اس سے پہلے کی مومن جماعتیں اپنی حد تک خدا کی عبادت کر لیتی رہیں ویسے ہی یہ بھی ___ اپنی حد تک ___ خدا کی عبادت گزار بن کر رہے۔ اس کا مشن دراصل یہ تھا کہ یہ توحید کو پوری دُنیا میں پھیلا دے اور انسانیت کو ایک بڑی سطح پر بندوں کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں لے آئے، جیسا کہ ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے فارس کے سپہ سالار اور وقت کے ایک طاغوت رستم کے روبرو کھڑے ہو کر کہا تھا......اب ایک ایسی جماعت بہرحال ایک خاص تیاری چاہتی ہے۔ اس کی تیاری کیلئے صرف اتنی محنت کافی نہیں جو ایک ایسی جمعیت کی تیاری کیلئے درکار ہو جسے اپنی حد تک اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لا کر رہنا ہو اور اپنی حد تک ہی خدا کا عبادت گزار بننا ہو۔

صنعت و تجارت کی دُنیا میں لوگ جانتے ہیں کہ مقامی کھپت کیلئے تیار کیا گیا مال اس مال سے بہت مختلف ہوتا ہے جسے برآمد Export کیلئے تیار کیا جاتا ہے۔ مقامی کھپت کیلئے تیار کیا گیا مال نسبتاً آسانی سے تیار ہوتا ہے اور اس میں کوئی سا بھی معیار چل جاتا ہے مگر برآمد کیا جانے والا مال عمدگی کی ایک خاص سطح کو پہنچا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس میں کوالٹی کا وہ معیار درکار ہوتا ہے کہ یہ باہر کی مارکیٹ میں اپنے آپ کو منوائے اور ہر دوسرے مال کو پیچھے چھوڑ جائے......

اگر دنیوی صنعت وتجارت کا یہ حال ہے تو اس تجارت میں اس اصول کا نگاہ میں رہنا بالا ولی ضروری ہے جو ایک برگزیدہ تجارت ہے اور جس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (الصّف:۱۰۔۱۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمہیں عذاب الیم سے بچادے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر، اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو

پوری انسانیت کی ہدایت کیلئے جس جمعیت کا وجود میں آنا درکار تھا اس کیلئے لازم تھا کہ وہ منفرد ترین جمعیت ہو۔ وہ اپنی ترکیب میں ہر دوسری جمعیت پر برتری لے گئی ہو۔ وہ محض اپنے رویہ وکردار اور اپنی شخصیت سے اس دین کیلئے چلتے پھرتے انداز میں یہ شہادت دے کہ یہی دین حق ہے اور یہی واجب اتباع ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی دین اور کوئی طرز زندگی، اس کی ٹکر کا نہیں۔ بلکہ اس کے پاسنگ بھی نہیں اور نہ دُنیا میں اس کا کوئی متبادل ہے......

یہاں ایک ایسا انسانی نمونہ درکار تھا جو پوری کی پوری جاہلیت کا سامنا کر سکے۔ نہ صرف اس کی برابری کر سکے بلکہ اس پر برتری پالے اور اس کی بنیادوں کو ہلا ڈالے اور اس کی جگہ پر ایک نئی عمارت اٹھا سکے، ایک ایسی عمارت جو صحیح بنیادوں پر اٹھائی گئی ہو اور جس میں ایمان کی ایک نئی حقیقت بسنے لگے...... عین یہی وہ چیز تھی جو رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں انجام پا گئی تھی......

رسول اللہ ﷺ کی تیار کی ہوئی اس منفرد جمعیت کی ٹکر محض عرب جاہلیت کے ساتھ نہ تھی، بے شک واقعاتی ترتیب کے لحاظ سے یہی وہ پہلی جاہلیت تھی جو اس جمعیت کے راستے میں سب سے پہلے اس کے مدمقابل آئی......دراصل پوری زمین ہی اس وقت جاہلیت کے اندھیروں میں روپوش تھی چاہے وہ بت پرست جاہلیت ہو، جیسے مثلاً آتش کے پجاری، یا جنات کے پوجنے والے یا بتوں کو ماننے والے یا ستاروں کی پرستش کرنے والے یا اور طرح کے طاغوتوں کی بندگی کرنے والے، اور یا پھر وہ تحریف شدہ آسمانی ادیان کے پیروکار ہوں......

ان ساروں کے مدمقابل ہی یہ نیا دین کھڑا تھا۔ اس ساری جاہلیت کے مدمقابل رسول اللہ ﷺ کھڑے تھے اور آپ ﷺ کے زیرِ سایہ آپ ﷺ کی وہ جماعت جو آپ ﷺ سے تربیت پا رہی تھی......

تو کیا محض ایک مسلم جماعت جو اپنی ذات کی حد تک درست طور پر خدا کی عبادت گزار ہو، کافی تھی کہ وہ اس پوری جاہلیت کے ساتھ ٹکر لے سکے؟ کجا یہ کہ اس کو تبدیل بھی کر دے؟ کجا یہ کہ اس کو ہٹا کر اس کی جگہ صحیح دین بھی قائم کر دے؟!

ہرگز نہیں! ضروری تھا ایک ایسی جماعت کھڑی ہوتی جو ایک غیر معمولی ساخت کی حامل ہوتی اور دُنیا کے اندر ایک نئے انداز کے معاشرے کو جنم دیتی۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی جماعت تھی: ایک مضبوط جمعیت جس کے اوپر تاریخ کی ایک بہت بڑی بنیاد اٹھائی گئی اور جس نے کہ اپنے وجود سے زمین کی کایا پلٹ دی۔

کتبِ سیرت ہمارے لئے اس مضبوط ایمانی جمعیت کے بارے میں بہت کچھ بیان کرتی ہیں اور اس بلند معیار کی بھی نشاندہی کرتی ہیں جس پر وہ لوگ پہنچ گئے تھے...... یہاں اگرچہ ہمارا موضوع صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی سوانح بیان کرنا نہیں جبکہ کتب سیرت بآسانی دستیاب ہیں۔ یہاں ہمارا موضوع صحابہ میں سے کچھ خاص متعین شخصیات پر گفتگو کرنا بھی نہیں باوجود اس کے کہ ان شخصیات کو اور ان کے کردار کو جب بھی موضوع بحث لایا جاتا ہے تو نفوس کو ایک نشاط ملتا ہے اور ان شخصیات کی عظمت کی دلوں پر دھاک بیٹھتی ہے۔ یہاں ہمارے پیش نظر صرف ان صفات کا علم لینا ہے جو اس منفرد انسانی جمعیت کی بنیادوں میں پڑی تھیں...... جس سے اصل مقصد یہ ہے کہ اس پر غور و فکر کیا جائے اور اپنے لئے فکر و عمل کی ایک تصویر بنائی جائے۔

اس کے باوجود کچھ نمونے تو ایسے ہیں جو مجھے مجبور کئے جاتے ہیں کہ ان کی جانب کچھ اشارہ کر ہی دیا جائے۔ یہ سب تصویریں، جن کے یہ چند نمونے ہیں، ان سے متاثر ہوئے بغیر آدمی رہ ہی نہیں سکتا۔ یہ تصویریں صحابہ میں سے بڑی بڑی شخصیات کی بھی نہیں بلکہ بعض نمونے تو ان میں سے ایسے ہیں جو ایسے اشخاص سے تعلق رکھتے ہیں جن کا تاریخ نے چند سطروں سے زیادہ ذکر نہیں کیا۔ بعض کے نام تک ذکر نہیں کئے۔ مگر یہ تابناک تصویریں ہیں، ان پہ کچھ دیر رک جانے میں حرج نہیں۔

☆ یہ ایک عورت ہے۔ اس پر غشی کا دورہ پڑتا ہے۔ جس کے دوران یہ برہنہ ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر شکایت کرتی ہے اور دُعا کی درخواست کہ غشی سے شفا پائے۔ رسول اللہ ﷺ اس سے فرماتے ہیں: ”تم چاہو تو میں تمہارے لئے دُعا کر دیتا ہوں، اور چاہو تو صبر کرو

اور جنت پاؤ" یہ عرض کرتی ہے: "یارسول اللہ ﷺ میں صبر ہی کروں گی بس دُعا کر دیجئے کہ میں برہنہ نہ ہوں" آپؐ اس کیلئے دُعا کرتے ہیں جس کے بعد وہ برہنہ نہیں ہوتی"۔

☆ یہ ایک گھرانہ ہے۔ فاقے سے بُرا حال ہے۔ آخر شوہر ایک دن بیوی سے کہتا ہے: رسول اللہ ﷺ کے پاس سے ضرورت مند خالی نہیں آتے۔ کیا ہم بھی رسول اللہ ﷺ کو اپنا ماجرا نہ سنائیں۔ آپؐ کے پاس کچھ ہوگا تو ہم کو بھی مرحمت فرمائیں گے۔ عورت بولتی ہے: "تم چاہتے ہو کہ خدا کا شکوہ رسولؐ کے ہاں جا کر کرو" تب بیوی بھی صبر کئے رہتی ہے اور شوہر بھی۔

☆ حضرت عمرؓ رعایا کا احوال جاننے کیلئے رات کے وقت گشت کیلئے نکلتے ہیں۔ کہیں سے بچوں کے رونے کی آواز سنتے ہیں۔ آواز کے پیچھے چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوتے ہیں تو دیکھتے ہیں ایک عورت ہے جو چولہے پہ ہنڈیا دھرے بیٹھی ہے۔ پاس بچے بیٹھے روئے جا رہے ہیں۔ عمرؓ پوچھتے ہیں: "یہ بچے کیوں روتے ہیں؟" عورت جواب دیتی ہے: "بھوکے ہیں"۔ عمرؓ سوال کرتے ہیں: "یہ ہنڈیا میں کیا دھرا ہے؟" عورت کہتی ہے: "پتھر ڈال رکھے ہیں انہی کو ہلاتی جاتی ہوں کہ یہ بہل جائیں آخر تو سو ہی جائیں گے۔ گھر میں پکانے کو کچھ نہیں ہے۔ عمرؓ کو ہمارا خیال ہی نہیں"۔ عورت نہیں جانتی کہ وہ عمرؓ ہی سے بات کر رہی ہے۔ عمرؓ کہتے ہیں: "بھلا عمر کو تمہارے ماجرے کی کیا خبر؟" عورت جواب دیتی ہے: "تو پھر اس نے مسلمانوں کی امارت سنبھالی ہی کیوں؟" عمرؓ رو پڑتے ہیں۔ بیت المال میں جاتے ہیں۔ ساتھ میں خادم ہے۔ روغن اور آٹا اٹھاتے ہیں اور عورت کے گھر کی جانب رخ کرتے ہیں۔ خادم اصرار کئے جاتا ہے "امیر المؤمنین یہ مجھے اٹھانے دیجئے" عمرؓ نہیں مانتے۔ جواب دیتے ہیں "تو کیا قیامت کو میرا بوجھ تم اُٹھاؤ گے؟" عورت کے ہاں پہنچ کر کھانا پکانے لگتے ہیں۔ آٹا ہنڈیا میں ڈالتے ہیں اور روغن سے بھونتے ہیں"۔ بار بار آگ میں پھونکنے کیلئے جھکتے ہیں دھواں ہے کہ آپؓ کی گھنی داڑھی کے آر پار ہو رہا ہے...... وقت کا خلیفہ آدھی دُنیا کا حکمران جب تک تسلی نہیں کر لیتا کہ بچے سیر ہو کر سو گئے واپس نہیں لوٹتا!

☆ ایک مجاہد جنت اور شہادت کی طلب میں معرکۂ قتال کیلئے نکلتا ہے۔اس کے ہاتھ میں چند کھجوریں ہیں۔اس کو ہاتھ میں پکڑی کھجوریں ختم کرنا دوبھر ہورہا ہے۔ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیتا ہے اور گویا ہوتا ہے۔ان کے ختم ہونے تک میں زندہ رہا تو یہ تو بڑی لمبی زندگی ہے! یہ کہنے کے ساتھ ہی معرکہ میں جا شامل ہوتا ہے اور شہادت جس کیلئے دیوانہ ہورہا تھا، آخر پالیتا ہے!

☆ ایک مجاہد معرکۂ قتال کی تیاری کیلئے زرہ بکتر پہنتا ہے۔اس کا ساتھی اسے متنبہ کرتا ہے: "تمہاری زرہ بکتر میں گردن کے پاس ایک کڑی ٹوٹی ہے اور وہاں سوراخ ہوگیا ہے" تب یہ اپنے ساتھی سے مسکراتے ہوئے کہتا ہے: "ارے واہ! اس اتنی سی جگہ سے پار ہوکر اگر مجھے کوئی تیر لگنا ہے پھر تو میرا خدا کے ہاں بڑا مول ہے" یہ معرکے میں اترتا ہے۔عین اسی سوراخ سے تیر گزرتا ہے اور یہ خدا کی راہ میں شہادت پالیتا ہے......

ایسی مثالیں صحابہؓ کی زندگی میں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

شاید ان صفات کا تعین کرنے کیلئے جن کو بنیاد بنا کر اسلام کی اس پہلی جمعیت کی تیاری عمل میں لائی گئی، بہتر طریقہ یہ ہو کہ ہم ان اوصاف کو جمع کریں جو اللہ نے یا اس کے رسولؐ نے اس منفرد ترین جماعت کے وصف میں بیان فرمائے، یا پھر اللہ اور اس کے رسولؐ کے ان احکامات کا ایک جائزہ لیں جو اس جماعت کو دیے گئے اور انہوں نے اس کا پابند ہوکر دکھانے میں اطاعت کا بہترین نمونہ پیش کیا، یا پھر ان ہدایات کو ذہن میں لائیں جو ان اصحاب کو دی گئیں اور وہ ان پر پورے شوق اور لگن سے پورا اترنے پر کاربند ہوئے۔یہ سب مل کر ہمارے لئے وہ اوصاف ٹھہرتے ہیں جن کو ہم اس منفرد ترین انسانی جمعیت کی تیاری کی بنیاد قرار دیں۔

| | |
|---|---|
| قَدۡ أَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُونَ الَّذِينَ هُمۡ فِي | فلاح پاگئے ایمان لانے والے، جو |
| صَلَاتِهِمۡ خَاشِعُونَ وَالَّذِينَ هُمۡ | اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں |
| عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُونَ وَالَّذِينَ هُمۡ | جو لغویات سے منہ موڑ رکھتے ہیں |
| لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ وَالَّذِينَ هُمۡ لِفُرُوجِهِمۡ | جو زکوٰۃ کے فاعل ہیں |
| حَافِظُونَ إِلَّا عَلَى أَزۡوَاجِهِمۡ أَوۡ مَا | جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، سوائے اپنی بیویوں |

مَـلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ فَمَنِ ابْتَغَى وَرَاء ذَلِكَ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْعَادُونَ وَالَّـذِيـنَ هُـمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ أُوْلَئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُون (المؤمنون:١-١١)

کے اوران عورتوں کے جوان کی ملکِ یمین میں ہوں۔(ہاں ان کی بابت) یہ قابل ملامت نہیں ہیں البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں

جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں

جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں

یہی وارث ہیں

جو میراث میں فردوس پائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے

أَفَمَن يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَى إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُوْلُوا الأَلْبَابِالَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللّهِ وَلاَ يِنقُضُونَ الْمِيثَاقَ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الحِسَابِ وَالَّذِينَ صَبَرُواْ ابْتِغَاء وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُواْ الصَّلاَةَ وَأَنفَقُواْ مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرّاً وَعَلاَنِيَةً وَيَدْرَؤُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُوْلَئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَالمَلاَئِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِم مِّن كُلِّ بَابٍ سَلاَمٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (الرعد: ١٩-٢٤)

بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے رب کی اس کتاب کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا ہو، اور وہ شخص جو اس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے، دونوں یکساں ہو جائیں؟ نصیحت تو دانشمند ہی قبول کیا کرتے ہیں وہ جو اللہ کے ساتھ کیا ہوا اپنا عہد پورا کرتے ہیں اور پہچان کر لینے کے بعد اس کو توڑتے نہیں" وہ جو ان سب روابط کو، جن کو برقرار رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، برقرار رکھتے ہیں۔ اپنے رب سے ڈر کر رہتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے جن کا حال یہ ہوتا ہے کہ محض اپنے رب کا چہرہ پا لینے کی غرض سے صبر کئے رہتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے اعلانیہ اور پوشیدہ خرچ کئے جاتے ہیں، اور برائی کو بھی بھلائی سے ٹالتے ہیں۔ آخرت کا گھر انہی لوگوں کیلئے ہے خلد کے باغات ان ہی کی قیامگاہ ہوں گے۔ یہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے اور ان کے آباؤ اجداد اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو جو صالح ہیں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں جائیں گے۔ فرشتے ہیں کہ ہر ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے کہیں گے! سلامتی ہو تم پر، اس صبر کے بدلے جو تم کرتے رہے، کیا ہی اچھا (بدلہ) ہے اس دار آخرت کا

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَاناً وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلاَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ أُوْلَـئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقّاً لَّهُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (الأنفال:٢-٤)

بس ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں
وہ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں
ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے بڑے درجے ہیں ان کے رب کے پاس۔ مغفرت ہے اور بہترین رزق ہے

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلاَةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللّهَ وَرَسُولَهُ أُوْلَـئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّهُ إِنَّ اللّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (التوبة: ٧١)

مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے مددگار و معاون ہیں، بھلائیوں کا حکم دیتے ہیں۔ برائیوں سے روکتے ہیں۔ نمازوں کو پابندی سے بجالاتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمانبردار ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ بہت جلد رحمت فرمائے گا۔ بے شک اللہ غلبے والا حکمت والا ہے

لَـكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُواْ مَعَهُ جَاهَدُواْ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ وَأُوْلَـئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (التوبة: ٨٨)

لیکن خود رسول اللہؐ نے اور انؐ کے ساتھ کے ایمان لانے والوں نے اپنے مال اور جان لگا کر جہاد کیا۔ یہی لوگ بھلائیوں والے ہیں اور یہی لوگ کامیابی حاصل کرنے والے ہیں

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفّاً كَأَنَّهُم بُنيَانٌ مَّرْصُوصٌ (الصف: ٤)

اللہ تعالیٰ کو وہ لوگ بہت ہی پسند ہیں جو اس کی راہ صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں

وَسَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ
وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ
أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي
السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ
الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللّهُ
وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ
ذَكَرُوا اللّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ
وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللّهُ وَلَمْ
يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ
جَزَآؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ
تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ
فِيهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ

(آل عمران: ۱۳۳ - ۱۳۶)

اور دوڑ پڑو خدا کی مغفرت کی جانب اور اس جنت کی طرف جو زمین اور آسمانوں کی چوڑائی رکھتی ہے اور خدا سے ڈر کر رہنے والوں کیلئے تیار کی گئی ہے۔ وہ پرہیزگار کہ خوشحالی ہو یا بدحالی (خدا کی راہ میں) بدستور خرچ کرتے ہیں۔ جو غصے کو پی جاتے ہیں۔ دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی نیکوکاروں سے محبت کرتا ہے۔ اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آ جاتا ہے تب وہ اس سے اپنے قصوروں کی معافی مانگنے لگ جاتے ہیں ___ اور اللہ کے سوا ہے بھی کون جو گناہ معاف کر سکتا ہو ___ اور وہ دیدہ ودانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انہیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ خوب ہے بدلہ (ایسے) محنت کرنے والوں کا

التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ
السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدونَ
الآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ
الْمُنكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللّهِ
وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ (التوبة: ۱۱۲)

اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے۔ بندگی میں لگے ہوئے لوگ۔ اس کی تعریف کے گن گانے والے (راہ حق میں) سفر (بھاگ دوڑ) کرنے والے۔ رکوع کرنے والے۔ سجدوں میں پڑے رہنے والے۔ بھلائیوں کا حکم دینے والے۔ بدی سے روکنے والے۔ اللہ کی حدوں کے رکھوالے۔ اے نبی ایسے مومنوں کو خوشخبری دے دو

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ
وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ
وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ

مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، مطیع فرماں بردار مرد اور مطیع فرماں بردار عورتیں، راست باز مرد اور راست باز عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، عاجزی کرنے والے مرد اور

وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيراً وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْراً عَظِيماً

(الأحزاب: ٣٥)

عاجزی کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والیاں، بکثرت اللہ کا ذکر کرنے والے اور ذکر کرنے والیاں...... اللہ نے ان کیلئے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے

مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاء عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاء بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَاناً سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْراً عَظِيماً (الفتح: ٢٩)

محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحمدل ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت تورات میں۔ اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی، پھر اسے مضبوط کیا، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تا کہ کافر ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے

وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

(الحشر: ٩)

اور یہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، خواہ اپنی جگہ محتاج کیوں نہ ہوں۔ بات یہ ہے کہ جو بھی اپنے دل کے بخل سے بچایا گیا وہی کامیاب و بامراد ہے

وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنتَصِرُونَ وَجَزَاء سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ وَلَمَنِ انتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُوْلَئِكَ مَا عَلَيْهِم مِّن سَبِيلٍ (الشوریٰ: ۳۷- ۴۱)

جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے دامن بچا کر رکھتے ہیں اور اگر غصہ آ جائے تو درگزر کر جاتے ہیں

جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اور ان کا (ہر) کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے، اور ہم نے جو کچھ بھی ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں

اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے

پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے، اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا

اور جو لوگ اپنے پر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جا سکتی

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (آل عمران: ۱۳۹)

اور دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی برتر ہوا گر تم مومن ہو

قُلْ هَـذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَاْ وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللّهِ وَمَا أَنَاْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (یوسف: ۱۰۸)

کہہ دیجئے: میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی، اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں

هُوَ الَّذِيَ أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الأَرْضِ جَمِيعاً مَّا أَلَّفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَـكِنَّ اللّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (الانفال: ۶۲- ۶۳)

وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعہ سے تمہاری تائید کی اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیے ہیں۔ تم روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے، یقیناً وہ بڑا زبردست اور دانا ہے

الَّذِينَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاء لِلّهِ وَلَوْ عَلَى أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِينَ (النساء: ۱۳۵)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگر چہ (تمہارے انصاف اور تمہاری راست گوئی کی) زد تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو

يَـا أَيُّهَـا الَّذِيْنَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِيْنَ لِلّهِ شُهَدَاء بِالْقِسْطِ وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَـوْمٍ عَلَى أَلاَّ تَعْدِلُواْ اعْدِلُواْ هُوَ أَقْرَبُ لِلـتَّـقْـوَى وَاتَّقُواْ اللّهَ إِنَّ اللّهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْن (المائدة: ٨)

اے ایمان والو! اللہ کی خاطر راستے پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَارَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (البقرة: ١-٥)

الف، لام، میم۔ یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے ان پرہیز گاروں کیلئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہ ایمان لاتے ہیں اس پر جو تم پر نازل کیا گیا اور اس پر جو تم سے پہلے نازل کیا گیا۔ اور یہ آخرت کا یقین کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور یہی ہیں جو فلاح پانے والے ہیں

المؤمن للمؤمن كا لبنيان يشد بعضه بعضا (أخرجه الشيخان)

مومن کا معاملہ مومن کے ساتھ مل کر یوں ہوتا ہے جیسے عمارت، جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے

مثل المؤمنين فى توادهم وتراحمهم كمثل الجسد إذا اشتكىٰ منه عضو تداعىٰ له سائر الجسد بالسهر والحمى (متفق عليه)

باہمی مودت اور ایک دوسرے کیلئے دل پسیج جانے کے معاملے میں مومنوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک جسد۔ اس کا ایک عضو تکلیف میں مبتلا ہو تو سارا جسم ہی تپ اور بے آرامی سہتا ہے

ان اللّٰه قد أذهب عنكم عبية الجا هلية وفخرها بالأنساب، كلكم لأدم وآدم من تراب (رواه ابو دائود والترمذى)

یقیناً اللہ نے جاہلی انداز حمیت اور باپ دادا کے نسب پر فخر کرنے کو تم سے دور کر دیا۔ تم سب آدم کا نسب ہو اور آدم کا نسب مٹی۔

ليس الشديد بالصرعة، ولكن من يملك نفسه عندالغضب (أخرجه الشيخان)

طاقتور وہ نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے، طاقتور وہ ہے جو طیش کی حالت میں خود پر قابو پالیتا ہو

وتبسمك في وجه اخيك صدقة (رواه الترمذى)

اپنے بھائی کے روبرو تمہارا مسکرا دینا بھی صدقہ ہے

ان قامت الساعة وبيد أحدكم فسيلة فليغرسها (رواه احمد)

قیامت آجائے، جبکہ تم سے کسی کے ہاتھ میں کھجور کی قلم ہو تب بھی اس کو زمین میں ضرور ہی لگا دے

مثل القائم فى حدود الله، والواقع فيها، كمثل قوم استهموا على سفينة وكان بعضهم اعلاها وبعضهم اسفلها فكان الذين فى اسفلها إذا استقوا مروا على من فوقهم، فقالوا: لو أنا خرقنا فى نصيبنا خرقا ولم نؤذ من فوقنا! فلو تركوهم وما أرادوا هلكوا جميعاً ولو أخذوا على ايديهم نجوا ونجوا جميعاً (اخرجه البخارى)

ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی حدوں کی رکھوالی کرنے والے ہیں اور ان کی مثال جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کر جاتے ہیں کچھ یوں ہے کہ جیسے کچھ لوگ بحری جہاز پہ سوار ہوں اور قرعے ڈال کر جہاز میں اپنی اپنی جگہوں کا تعین کر لیں۔ کچھ لوگوں کے حصہ میں جہاز کی بالائی منزل آئے اور کچھ کے حصہ میں زیریں حصہ۔ زیریں منزل کے لوگوں کو جب بھی پانی کی ضرورت ہو تو ان کو اوپر والوں کے بیچ سے گزر کر جانا پڑے۔ آخر یہ کہتے ہیں: کیوں نہ ہم اپنے حصہ کے جہاز میں ایک سوراخ کر لیں اور اوپر والوں کیلئے باعث مزاحمت نہ ہوں! اب اگر وہ ان کو جو کرتے ہیں کرنے دیں تو سب مرتے ہیں۔ البتہ اگر وہ ان کو ہاتھ سے روک دیتے ہیں تو وہ بھی بچتے ہیں اور سارے ہی بچتے ہیں

ان اللّٰه كتب الاحسان على كل شيء، فاذا اقتلتم فأحسنوا القتلة، واذا ذبحتم فأحسنوا الذبحة، وليحد أحدكم شفرته وليرح ذبيحته (رواه مسلم والنسائى والترمذى وابوداود وابن ماجة)

خدا نے ہر چیز میں احسان فرض ٹھہرا دیا ہے۔ پس جب تم کو قتل بھی کرنا ہو تو قتل کرنے میں نیکی اور رحمدلی سے کام لو۔ جب تم کو (کوئی جانور) ذبح کرنا ہو تو ذبح کرنے میں احسان کا انداز اپناؤ۔ آدمی نے چھری تیز کر رکھی ہو اور ذبح ہونے والی مخلوق کو (مقدور بھر) آرام پہنچائے

الا انى أتقاكم لله وأخشاكم له، ولكنى أصوم وأفطر، وأقوم وأنام، وأتزوج النساء فمن رغب عن سنتى فليس منى (رواه الشيخان)

خبردار میں تم میں سب سے زیادہ خدا کا پرہیز گار ہوں اور سب سے زیادہ خدا کی خشیت کرتا ہوں۔ مگر میں روزہ رکھ بھی لیتا ہوں اور روزہ چھوڑ بھی لیتا ہوں۔ میں رات کو قیام بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ میں عورتوں سے رشتہ ازدواج میں منسلک بھی ہوں۔ پس جو میری سنت سے منہ موڑے وہ مجھ میں سے نہیں

☆☆☆☆☆☆☆

ایسی ہی منفرد صفات کی بنا پر، اوران صفات کے اعلیٰ ترین درجوں پر پہنچا کر رسول اللہ ﷺ نے اہل ایمان کی وہ بنیادی جمعیت تیار کی تھی۔ تب یہ جمعیت روئے زمین کے واقع میں کیا تبدیلی لے کر آئی؟

ابتدائی طور پر یہ وہ نیوکلیس تھا جس کے گرد جزیرۂ عرب کے اندر ہر طرف مسلمان اکٹھے ہونے لگے۔ موجودہ دور کی زبان استعمال کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ 'کور' Core تھی جس کے گرد پھر وقفے وقفے سے 'عوام' آ ملتے رہے اور جن کے بل پر پھر یہ دعوت انسانی وجود کے ہر افق پر پھیل گئی...... گو اس کی ابتدائی تجربہ گاہ اور کامیاب ترین تجربہ گاہ جزیرۃ العرب بنا......

حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ دعوت جس کو زمینی حقائق کے اندر ایک بنیادی تبدیلی لے کر آنا ہوتی ہے اس کیلئے عوام میں پذیرائی پانا اور عوامی رَو بننا ناگزیر ہوتا ہے۔ مگر ایسی 'عوامی پذیرائی' اور 'عوامی رَو' کو جس چیز کے گرد اکٹھا ہونا ہوتا ہے وہ ایک ایسی قیادت ہے جو اس کو تربیت دینے پر قدرت رکھتی ہو اور پھر اس قیادت کے گرد ایک ایسا نیوکلیس ہے جو اس قیادت اور اس کے افکار کا ایک زبردست عملی انعکاس بن گیا ہو یہاں تک کہ 'عوام' کی نگاہوں کو خیرہ کرنے لگا ہو۔ یہاں تک کہ لوگ آپ سے آپ 'قیادت' کے گرد بنے ہوئے اس 'نیوکلیس' کے گرد جمع ہونے لگیں اور اسی کے رنگ میں رنگے جانے لگیں۔ ہاں یہ بات اپنی جگہ ہے کہ یہ عوامی اکٹھ تربیت میں اس سطح کو بہرحال نہیں پہنچا ہوگا جس سطح پر 'قیادت' نے اس 'بنیادی جمعیت' کو ایک خاص محنت، تربیت اور نگہداشت کے نتیجے میں پہنچالیا ہوگا۔

خود رسول اللہ ﷺ کا تیار کردہ معاشرہ سارے کا سارا اس معیار کو نہیں پہنچا تھا جس تک آپ ﷺ کی تیار کردہ وہ ایک خاص کھیپ پہنچی ہوئی تھی جس کو کہ آپ ﷺ نے معاشرے کی قیادت کیلئے تیار کیا تھا۔ چنانچہ اس معاشرے میں جہاں علم اور ایمان کی بے مثال تصویریں پائی جاتی تھیں وہیں وہ لوگ بھی تھے جن کو قرآن نے 'مثاقلین' (بوجھل ہو رہنے والے) قرار دیا۔ انہی میں 'مبطئین' (جہاد کیلئے نکلنے میں پس و پیش کرنے والے) بھی پائے جاتے تھے۔ ان میں ضعیف الایمان بھی تھے۔ ان ہی میں وہ لوگ بھی تھے جو ہر نئے واقعے سے متاثر ہو جاتے تھے اور ہر نئی فتح یا شکست ان کے رخ پر اثر انداز ہوتی تھی اور جو کہ افواہوں تک سے متاثر ہو جایا کرتے تھے۔ معاشرے کے یہ سب طبقے ابھی منافقین کے علاوہ تھے، چاہے یہ وہ منافقین ہوں جن کا نفاق کھلا تھا اور چاہے وہ منافقین جو اپنے نفاق کو چھپا کر رکھتے تھے۔

يَـا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انفِرُواْ فِي سَبِيلِ اللّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الأَرْضِ (التوبة: ٣٨)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کیلئے کہا گیا تو تم زمین کی جانب بوجھل ہو گئے

وَإِنَّ مِـنكُمْ لَمَن لَّيُبَطِّئَنَّ فَإِنْ أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَالَ قَدْ أَنْعَمَ اللّهُ عَلَيَّ إِذْ لَمْ أَكُن مَّعَهُمْ شَهِيداً وَلَئِنْ أَصَابَكُمْ فَضلٌ مِّنَ اللّه لَيَقُولَنَّ كَأَن لَّمْ تَكُن بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُ مَوَدَّةٌ يَا لَيتَنِي كُنتُ مَعَهُمْ فَأَفُوزَ فَوْزاً عَظِيما (النساء: ٧٢- ٧٣)

اور یقیناً تم میں بعض ایسے بھی ہیں جو (جہاد کیلئے نکلنے میں) پس وپیش کرتے ہیں، پھر اگر تمہیں کوئی نقصان ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا اور اگر تمہیں اللہ کا کوئی فضل مل جائے تو اس طرح گویا تم میں ان میں دوستی تھی ہی نہیں، کہتے ہیں کاش! میں بھی ان کے ہمراہ ہوتا تو بڑی کامیابی کو پہنچتا

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّواْ أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُواْ الصَّلاَةَ وَآتُواْ الزَّكَاةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُواْ رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلا أَخَّرْتَنَا إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ قُلْ مَتَاعُ الدَّنْيَا قَلِيلٌ وَالآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَى وَلاَ تُظْلَمُونَ فَتِيلاً (النساء: ٧٧)

تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو! اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہیے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر۔ کہتے ہیں خدایا! یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟ ان سے کہو، دُنیا کا سرمایۂ زندگی تھوڑا ہے اور آخرت ایک خدا ترس انسان کیلئے زیادہ بہتر ہے اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہ کیا جائیگا

وَإِذَا جَاءهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُواْ بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُوْلِي الأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ وَلَوْلاَ فَضْلُ اللّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لاَتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلاَّ قَلِيلاً (النساء: ٨٣)

جہاں انہیں کوئی خبر امن کی یا خوف کی ملی تو یہ اسے لے کر پھیلانے لگے حالانکہ اگر یہ اسے رسولؐ اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجاتی جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں۔ تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے

رہے منافقین تو ان کا تو ذکر ہی کیا......

اب اگر یہ سب لوگ رسول اللہ ﷺ کے تعمیر کردہ معاشرے میں پائے جاتے ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ بنفسِ نفیس ان کے درمیان موجود ہیں اور لوگوں کی اصلاح کیلئے ایک کے بعد ایک وحی اترتی

ہے جس سے لوگوں کو اپنے احساسات اور رویے تک درست کر لینے میں مدد ملتی ہے تو اس سے واضح ہوا کہ 'عوامی اکٹھ' کی بابت یہ ضروری نہیں کہ وہ بھی سارے کا سارا 'معیاری' ہو۔ نہ یہ ممکن ہی ہے کہ یہ 'عوامی اکٹھ' بھی عین اس چنیدہ جمعیت کے پائے کا ہو جس کو قیادت نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ تیار کیا ہو...... مگر تاریخی حقائق اس بات پر گواہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جس چنیدہ قسم کی جمعیت کو تعلیم اور تربیت دے لی تھی اور خاص اپنی نگرانی میں اور اپنے زیر سرپرستی ان کی تیاری پروان چڑھائی تھی ...... وہ جمعیت بلاشبہ اپنے ایمان میں وہ رسوخ اور صدقِ عزیمت میں وہ مقام رکھتی تھی کہ وہ بھاری بھرکم معاشروں کا بوجھ بڑی آسانی سے اٹھا لے اور ان کو لے کر اپنے مقاصد کی جانب رواں دواں ہو لے اور یہ کہ ان معاشروں کے اندر جتنے بھی ''مثاقلون'' (بوجھل ہو رہنے والے) اور ''مبطئون'' (پست ہمتی دکھانے والے) اور ضعیف الایمان لوگ پائے جائیں یا جتنے بھی ایسے عناصر پائے جائیں جو ہر نئی خبر پہ چونک جانے والے اور ہر نئے واقعے سے متاثر ہونے والے ہوں، حتی کہ معاشرے کے منافق طبقے بھی کیوں نہ پائے جاتے ہوں اور سیدھے سیدھے دشمن بھی کیوں نہ موجود ہوں، یہ سب کو غیر موثر کر کے رکھ دے اور معاشرے کا رخ اپنے ہی اہداف کی جانب رکھے۔

یہ ہے وہ سبق جو ہمیں سیرت کے اس واقعہ سے لینا ہے۔ یعنی ایک مضبوط، راسخ الایمان اور ایک اعلیٰ معیار کی سمجھ بوجھ کی مالک جمعیت کی تیاری۔ کیونکہ ایک ایسی جمعیت پائے جانے کے بغیر عوام کو اگر دعوت کے گرد اکٹھا کر بھی لیا جائے تو معاشروں کو چلایا نہیں جا سکتا۔ 'معاشرے' ایک بھاری بھرکم چیز ہیں۔ کشش ثقل ان پر اثر انداز ہو کر رہتی ہے۔ ان کو تھام کر بلندی کی ایک خاص سطح پر برقرار رکھنا ایک خاص عمل چاہتا ہے۔ بھاری بھرکم معاشرے چلیں اور ٹھیک چلتے جائیں اور پیر پیر پر ان کا رخ درست ہوتا رہے اور ہر انحراف کا بروقت اور ساتھ ساتھ تدارک و سدباب ہوتا رہے...... یہ ہرگز معمولی کام نہیں اس کیلئے ایک خاص معیار کی انسانی جمعیت پہلے وجود میں لے آئی جانا ضروری ہے۔

پس ایک گہرے فہم اور ایک اعلیٰ ترین کردار کی مالک انسانی جمعیت کی تیاری ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ یہ 'تعیش' کے زمرے میں نہیں آتی۔ یہ 'زائد از ضرورت' نہیں۔ یہ وہ چیز نہیں جس کے بغیر بھی 'گزارا' ہو جائے۔ معاشروں کو چلانے میں اس کا کردار کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے معاشرہ پر اثر انداز ہو سکنے والی مضبوط ایمانی جمعیت تیار کر لی اور پھر اس کو 'عوام' کی قیادت پر بھی مامور کر دیا...... چاہے یہ عسکری اور جنگی قیادت کا معاملہ ہو، چاہے یہ انفرادی زندگی کے اندر ایک اخلاقی قیادت کا بہم پہنچانا ہو، چاہے معاشرتی زندگی کے اندر ایک سماجی قیادت کا لایا جانا ہو، چاہے یہ فکری اور نظریاتی قیادت کا معاملہ ہو جو معاشروں کو حقیقت اسلام سے آشنا کرے اور قول اور کردار سے معاشروں کو تعلیم دے...... غرض جب آپ نے یہ کام انجام دے لیا تو اصل میں آپ کی نگرانی کے اندر تربیت پا لینے والی یہ خاص جمعیت تھی جس نے پھر جزیرۂ عرب میں جاہلیت سے مڈبھیڑ کی اور بالآخر اس کو شکست دی، اس کو وجود سے ختم کیا، اس کی بنیادیں تک ملیامیٹ کر دیں اور اس کی جگہ ایک بالکل نئی عمارت کھڑی کر دی۔

یہ عمل درحقیقت کوئی اتنا آسان نہیں تھا۔

یہ اندازہ اسی کو ہو سکتا ہے جو وقائعِ تاریخ کا تتبع کرتا ہو اور جو قرآن کی ان آیات پر تدبر کرتا ہو جو حق اور باطل کے اس معرکے کی حقیقت بیان کرتی ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی زیر سرکردگی جزیرۂ عرب کے اندر لڑا گیا۔ وہی شخص یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کشمکش کے اندر کس قدر محنت اور جدوجہد صرف ہوئی تب جا کر کہیں پلڑا دین حق کے حق میں ایک فیصلہ کن انداز سے جھکا۔ خواہ وہ نفسیاتی جدوجہد ہو جو 'صبر' کی صورت میں صرف کی گئی اور جس کے بل پر بڑی دیر تک اس معرکے کی تپش سہی جاتی رہی اور اس کیلئے نفوس کو سرگرم رکھا گیا، یا پھر یہ بدنی اور مادی جدوجہد ہو۔ وہ قربانیاں کتنی بڑی ہیں جو حق و باطل کے اس بے نظیر معرکے کے اندر دی گئیں۔ وہ کیسی کیسی جانفروشی تھی جو اس راہ میں دکھائی گئی۔ کیسی کیسی اخلاقی قدریں اور مثالیں ہیں جو ہر ہر موڑ پر قائم کی گئیں...... پھر اسی شخص کو یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس چنیدہ انسانی جمعیت کی رہنمائی کیلئے اور پھر اس جمعیت کے ذریعے سے 'عوامی جمگھٹوں' کو ایک بار بہترین راہ پر ڈال دینے کیلئے نبی ﷺ کا بنفس نفیس موجود ہونا کیا معنی رکھتا ہے...... اور پھر وہی شخص یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ جہاد کے اس پورے عمل میں اس مٹھی بھر جمعیت کی کیا 'اہمیت' بنتی ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں تربیت پا کر بہت تھوڑے عرصے میں جزیرہ عرب کے اندر زندگی کا دھارا بدل دیا اور پھر روئے زمین کے اندر بھی زندگی کا دھارا بدل کر رکھ دیا۔

یہ کشمکش ہرگز کوئی معمولی کشمکش نہ تھی......ایک ایسی کشمکش جس کو ایک طرف فاسد عقائد اور گم گشتہ راہ نظریات کا سامنا ہے۔ دوسری طرف فساد زدہ قدریں ہیں۔ تیسری طرف فساد زدہ رویے اور طرز ہائے سلوک ہیں۔ چوتھی طرف فساد زدہ نفوس ہیں جو اس انحراف کے باعث جو عقائد کے اندر اور قدروں کے اندر اور معاشرہ وسماج اور رویوں کے اندر ایک مدت دراز سے آیا ہوا ہے نہ صرف منحرف ہو گئے ہیں بلکہ اسی کے قالب میں ڈھل گئے ہیں اور اسی انحراف کو اپنے لئے درست پوزیشن جانتے ہیں اور سیدھا کئے جانے کو اب سمجھتے ہیں کہ یہ ٹیڑھا کیا جانا ہے۔ باطل ان کیلئے حق ہو گیا ہے جس کا ان کے خیال میں ہر صورت تحفظ کیا جانا ہے اور اس کے راستے میں ان کو مرنا اور مرانا تک گوارا ہے!

بوجوہ اس کشمکش کو جو حق اور باطل کے مابین تھی اللہ تعالیٰ نے ان دھاتوں سے تشبیہ دی ''جنہیں زیور اور ساز وسامان بنانے کیلئے آگ میں تپاتے ہیں'':

| | |
|---|---|
| أَنـزَلَ مِنَ السَّمَاء مَاء فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَـدَرِهَـا فَـاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَداً رَّابِياً وَمِـمَّـا يُـوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاء حِلْيَةٍ أَوْ مَتَـاعٍ زَبَـدٌ مِّثْـلُـهُ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَـذْهَـبُ جُـفَاء وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الأَرْضِ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللّهُ الأَمْثَال (الرعد: ١٧) | اللہ نے آسمان سے پانی برسایا (جس سے) ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے بقدر بہہ نکلا۔ پھر پانی کے ریلے نے اوپر چڑھے جھاگ کو اٹھا لیا۔ اور ایسے ہی جھاگ ان (دھاتوں) پر بھی اٹھتے ہیں جنہیں زیور اور ساز وسامان بنانے کیلئے آگ میں ڈال کر تپاتے ہیں۔ اسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے۔ جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کیلئے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ اسی طرح مثالوں سے اللہ اپنی بات سمجھاتا ہے |

یہ واقعی ایک آگ ہے۔ تپش رکھتی ہے۔ داغ دیتی ہے۔ اس کے پاس آکر دماغ کھولنے لگتا ہے۔ برداشت مشکل ہو جاتی ہے۔ پھر بھی اہل ایمان اس کی تاب لے آتے ہیں۔ صبر اور عزیمت اختیار کرتے ہیں۔ خدا پر بھروسہ کرتے ہیں۔ توکل اور انابت سے کام لیتے ہیں۔ اسی کے اندر سے راستہ بنا کر خدا کی جانب بڑھنے پر مصر رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ ان مومن مجاہد صابر نفوس کی صفائی ہوتی ہے۔ ناخالص مادے جل جاتے ہیں۔ جو کچھ خالص ہے وہ نفوس کے اندر بچ رہتا ہے۔ نفوس اب مکمل طور پر خدا کے اور خدا کیلئے ہو رہتے ہیں۔ ایک اخلاص اور تجرد آتا ہے۔ اب یہ نفوس جب آگے

بڑھتے ہیں تو زمین کے اندر بھی جو ناخالص مادے پائے جاتے ہیں ختم ہونے لگتے ہیں۔ بدی اور برائی اور خباثت کا روئے زمین سے بھی خاتمہ ہونے لگتا ہے۔ باطل کی سلطنت اور کروفر خاک میں ملتا ہے اور معاشرے کے اندر حق سر اٹھالیتا ہے......

اسلام کی یہ اساسی جمعیت ان سب کٹھن مرحلوں سے گزر کر ہی آگے بڑھی تھی۔ اس کو یہ پورا راستہ چلنا پڑا تھا۔ آخر کار وہ اپنے گردوپیش میں اپنا پورا کردار ادا کرنے پر قادر ہوئی...... یہاں تک کہ جزیرۂ عرب میں معاملہ اسلام کے حق میں پوری طرح اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے استوار ہو گیا۔

تب اس جمعیت نے اس سے بھی وسیع تر کردار سنبھال لیا......

جزیرۂ عرب اس تحریک کا نقطۂ آغاز تھا، صحیح ہے۔ یہیں رہ کر اس کو تیار ہونا تھا۔ یہیں سے اس کو اپنے عمل کی ابتدا کرنا تھی مگر اس کا ہدف پوری زمین تھی!

یہ دین تمام انسانوں کیلئے نازل ہوا تھا۔ یہ مومن جو جزیرۂ عرب میں رسول اللہ ﷺ کی زیر قیادت کھڑے ہوئے وہ پوری انسانیت کے ہادی تھے۔ ان کو تمام دُنیا کے انسانوں کو دین حق کی طرف لے کر آنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ ان کو اس دین کی حقیقت پوری دُنیا پر ظاہر کرنا تھی اور بنی نوع انسان کو سب کے سب بنی نوع انسان کو تعلیم دینا تھی۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً (البقرة: ١٤٣)

اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک 'امت واسطہ' بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر شہادت قائم کرو اور رسول تم پر شہادت قائم کرے

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُون (آل عمران: ١٠٤)

تم میں ایک امت تو ایسی رہنی چاہیے جو (لوگوں کو) نیکی کی طرف لائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے

یہ ہرگز کوئی آسان کام نہ تھا......

تاریخ عموماً انہی معرکوں پر توجہ مرکوز کرتی ہے جو فوجوں کے درمیان لڑے گئے ہوں۔

یہ حقیقت شاید درست بھی ہے کہ فوجوں کے مابین لڑے جانے والے معرکے بالآخر کسی کشمکش کو سرے پہنچانے میں فیصلہ کن حیثیت اختیار کر جاتے ہیں مگر خود یہ کشمکش کیا ہے جس پر فوجیں آمادۂ جنگ ہیں، اصل سوال یہ ہوتا ہے۔ فوجوں کو مصروف جنگ دیکھ کر اس کشمکش سے جو اس جنگ کا باعث بنی،

صرف نظر کر لینا اور خود اس کشمکش کو بھی ایک فوجی اور جنگی کارروائی جان لینا کہ جس کا فیصلہ بس فوجوں ہی کے کرنے کا ہو! یہ زاویہ نگاہ اس کشمکش کی حقیقت کے اہم ترین جوانب کو روپوش کرا دیتا ہے اور اس کو بہت ہی محدود معنی میں محصور کر دیتا ہے اور معاملے کی اصل حقیقت اور اس کے اہم تر جواب کو معطل یا ثانوی اور حاشیائی کر دینے کا باعث بنتا ہے۔ یہ اصل اور اہم تر جوانب وہ عقائد، وہ نظریات اور وہ قدریں ہوا کرتی ہیں جن کے باعث ابتداءً یہ کشمکش برپا ہوئی ہوتی ہے۔

یہ کشمکش جو جزیرۂ عرب میں برپا ہوئی تھی اور پھر زمین کے ایک بڑے حصے پر پھیل گئی تھی...... دور حاضر کی زبان استعمال کی جائے تو دراصل ایک تہذیب کی جنگ تھی۔ ایک صحت مند تہذیب اور ایک فاسد تہذیب کی کشمکش۔ ایک ایمانی تہذیب اور ایک جاہلی تہذیب کی کشمکش۔ ایک ہمہ گیر کشمکش۔ جو نفس انسانی کے تمام جوانب کو گھیر لے۔ جو حیات انسانی کے تمام جوانب کا احاطہ کرے...... یہ الگ بات کہ اس میں فوجی اور جنگی کشمکش کی نوبت کا آنا اس کشمکش کا وہ اہم ترین نقطہ تھا جو ہمیشہ کیلئے نہ سہی پھر بھی کچھ دیر کیلئے ایک فیصلہ کن حیثیت اختیار کر لے!

تاریخ کے بعض ادوار میں غلبہ تاتاریوں نے بھی پایا اور زمین کے ایک بڑے حصہ کو روند ڈالا۔ مگر انہوں نے کوئی تہذیب کھڑی نہ کی۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ انہوں نے تہذیب کا صفایا کیا اور اس کی جگہ محض ایک بے تہذیبی اور ایک فساد برپا کیا اور کفر و سرکشی کا بول بالا کیا...... تا آنکہ خدا نے ان کو اسلام میں آ جانے کی توفیق دے دی۔

تاریخ جدید کے اندر مغرب کے لشکروں نے بھی دُنیا پر غلبہ پایا اور زمین کا ایک بڑا حصہ روند ڈالا مگر وہ کوئی حقیقی تہذیب کھڑی نہ کر پائے جس کے بارے میں کہا جائے کہ اس کو واقعی ہونا چاہیئے اور واقعی اس کو پھلنا پھولنا چاہیے۔ باوجود اس کے کہ مادی برتری اور ٹیکنالوجی اور سائنس ترقی میں کوئی ان کا ثانی نہیں انہوں نے بھی روئے زمین پر کچھ رائج کیا تو وہ جنگل کا قانون تھا: طاقتور کا حق ہے کہ کمزور کو کھا جائے یا پھر اس کو پچھاڑ کر آگے گزر جائے۔ نظریات کا وہ فساد پھیلایا اور اخلاق اور اعلیٰ قدروں کی وہ دھجیاں اڑائیں کہ جاہلیت کی تاریخ میں بھی اس کی مثال ملنا مشکل ہو۔

جنگی کشمکش اصل کشمکش ہوتی ہی نہیں۔ یا کم از کم یہ کہہ لیجئے کہ جنگی کشمکش تنہا وہ چیز نہیں جو اصل کشمکش ہو۔ اصل چیز وہ قدریں ہیں جو اس کشمکش کے پیچھے بولتی ہوں۔ اصل چیز وہ قدریں ہیں جن کی

خاطر فوجیں میدان میں اترتی ہیں۔ اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ کس فوج کی جیت کی صورت میں کن قدروں کی جیت ہوگی! یہ وہ چیز ہے جس میں اسلامی فتوحات دُنیا کی ہر توسیع پسندانہ جنگ سے متمیز وممتاز نظر آتی ہیں۔

یہ کوئی شہوتِ توسیع پسندی نہ تھی جو اسلامی فتوحات کے اس عظیم الشان واقعہ کے پیچھے کارفرما تھی۔ یہ نہ ملک گیری کی ہوس تھی اور نہ 'دیگر اقوام' کو ذلیل اور مسخر کرنے کا جذبہ تھا جو مسلم عرب افواج کو زمین کے ایک وسیع خطہ کے اندر متحرک کر رہا تھا۔ یہ وہ ہدف تھا جو خود خدا نے ان کیلئے متعین کر دیا تھا اور وہ یہ کہ یہ آگے بڑھ کر اطراف عالم میں توحید نشر کریں، جاہلیت کو انسانی زندگی کی قیادت سے بے دخل کریں اور اس کی سرکشی کا خاتمہ کریں تا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور دین ایک اللہ وحدہ لاشریک کیلئے ہو جائے:

وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين كله للّٰه (الأنفال:٣٩)

یہ ہدف وہ تھا جو سپہ سالار فارس کے روبرو ربعی بن عامرؓ کی زبان پر بے ساختہ آجاتا ہے:

| | |
|---|---|
| اخراج الناس | یہ کہ لوگوں کو نکال لایا جائے: |
| من عبادة العباد إلى عبادة رب العباد، | بندوں کی بندگی سے بندوں کے رب کی بندگی کی طرف |
| ومن جور الأديان الى عدل الاسلام، | ادیان کے جور وستم سے اسلام کے عدل کی جانب |
| ومن ضيق الدنيا الى سعة الدنيا والاخرة | اور دُنیا کی تنگی سے دُنیا وآخرت کی وسعت کی جانب"...... |

چنانچہ یہ اعلیٰ قدروں پر مشتمل ایک حسین تہذیب کی پیش قدمی تھی اور جس کے پیش نظر بنی نوع انسان کو طاغوت کی عبادت وبندگی سے آزادی دلا کر اللہ کی بندگی میں لانا تھا۔ انسان کو اوہام اور خرافات کے چنگل سے چھڑا کر حقیقت کو گلے لگانے کے قابل بنانا تھا۔ ظلم وجور سے نجات دلا کر عدل اور قسط اور خدا خوفی سے آشنا کرانا تھا۔ جہالت سے چھٹکارا دلا کر علم اور آگہی سے روشناس کرانا تھا اور ظلمات سے نکال کر روشنی میں لے کر آنا تھا۔

دُنیا کے اندر کسی ثقافتی تحریک نے بھی تاریخ کو وہ حسن نہیں دیا جو کہ اسلامی فتوحات کے حصے میں آیا۔

اسلامی فتوحات کے اس بے نظیر واقعہ پہ نگاہ ڈالیے، آدمی حیرت واعجاب کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔ حیرت واعجاب کی اس میں بس یہی بات نہیں کہ مسلم افواج کے ہاں ایک محیر العقول جنگی

صلاحیت نظر آتی ہے جس کی بنا پر اسلام کے دورِ اول کیلئے یہ واقعہ ایک معمول کی حیثیت رکھتا ہے کہ اہل ایمان کی مٹھی بھر افواج جو کہ ساز و سامان بھی پورا پاس نہیں رکھتیں اپنے سے کئی گنا زیادہ اور ساز و سامان سے لدی ہوئی افواج کو، جو کہ فارس و روم میں صدیوں کے عسکری فنون اور جنگی تجربات رکھنے پر اتراتی نہیں تھکتیں، یوں اپنے راستے سے ہٹا دیتی ہیں جیسے یہ کوئی چیز ہی نہ ہوں...... جس کی کوئی تفسیر کی ہی نہیں جا سکتی سوائے اس کے کہ خدا کی مدد شامل حال ہونے کے ساتھ ساتھ یہ اس منفرد عقیدہ کا ان کی زندگیوں میں اثر تھا جو کہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والوں کی شخصیت میں ضرور ایک اثر دکھاتا ہے اور یہ کہ یہ اس تربیت کا اثر تھا جو ایک صحیح عقیدہ کی بنا پر ان کو دی گئی تھی اور جس نے ان میں ہمت اور عمل کی وہ روح پھونک دی تھی کہ یہ تعداد میں بہت تھوڑے اور ساز و سامان میں معمولی ہونے کے باوجود نصف صدی سے بھی کم مدت کے اندر مغرب میں بحر اوقیانوس تک پہنچے اور مشرق میں ہندوستان تک۔ ایک تحریک کے پھیلنے کی یہ وہ رفتار ہے جو تاریخ میں اس سے پہلے کبھی سننے میں آئی اور نہ بعد میں۔

دیکھنے والے کے حیرت و اعجاب کی اس میں بس یہی بات نہیں کہ کس طرح اس مٹھی بھر جمعیت کو دُنیا کی عظیم ترین فوجی طاقتوں کے روبرو ایک محیر العقول جنگی صلاحیت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ کس رفتار سے دُنیا میں ہر طرف پیش قدمی کرتی ہے ___ باوجود اس کے یہ بات بھی تاریخ کا کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ بلاشبہ یہ بات بذات خود بھی تاریخی طور پر ایک بہت ہی بڑی اور غیر معمولی دلالت رکھتی ہے ___ مگر اس میں حیرت و اعجاب کی اصل بات تو یہ ہے کہ یہ تحریک محض شہر اور قلعے فتح نہیں کرتی بلکہ یہ دلوں کو فتح کرتی ہے۔ دل اس کے گرویدہ ہوتے ہیں اور ایک بے انتہا مختصر مدت میں روئے زمین کے کروڑوں انسان دین حق کو قبول کر لیتے ہیں...... بغیر کسی بھی زبردستی کے!

یہ قتال لوگوں پر قبول اسلام کیلئے زبردستی کرنے کی خاطر دراصل تھا ہی نہیں۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرۃ: ٢٥٦) "دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے"۔

یہ قتال تو تھا دراصل جاہلیت کو راستے سے ہٹانے کیلئے، جاہلیت جو محض کچھ عقائد اور نظریات کا نام نہیں تھا۔ بلکہ ان عقائد پر باطل کے باقاعدہ نظام قائم تھے اور اس باطل کو جاہلی فوجوں اور لشکروں اور طاقت کی حمایت حاصل تھی۔ اب اگر اس کا تسلط لوگوں کے اوپر سے ختم کر دیا جاتا ہے تو لوگ آزاد ہو

جاتے ہیں جس کے بعد وہ اپنے حق میں جو فیصلہ کرنا چاہیں کریں۔

قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لَا انفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (البقرة:٢٥٦)

صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کرکے اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا اتھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ (جس کا سہارا اس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے

اب اس جاہلیت کے تسلط سے آزاد کرا دیا جانے کے بعد وہ شخص بھی جو اپنے دین پہ باقی رہنا چاہتا ہے اور اپنی گمراہی کے واضح ہو جانے کے باوجود اسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے اس کو بھی اپنی جان اور مال اور اپنے دین اور اپنی پوری ہستی کا تحفظ حاصل ہے جب تک کہ وہ اہل ایمان پر ظلم و تعدی یا ان سے قتال کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا!

لا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (الممتحنة: ٨)

اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو یقیناً پسند کرتا ہے

یہ کروڑوں انسان جو دین اسلام میں بغیر کسی اکراہ کے اور جوق در جوق داخل ہوئے...... یہ اسلام میں تب داخل ہوئے جب انہوں نے اسلام کو انسانوں کی ایک جمعیت کے اندر حقیقت کا روپ دھارے ہوئے دیکھا۔ جب ان کو انسانوں کی ایک تعداد کے اندر یہ اسلام عملاً چلتا پھرتا نظر آیا اور اس دین کو انسانی شکل میں دُنیا کے اندر نمودار ہوتے دیکھا تو پھر وہ اس کو پسند کئے بغیر رہ ہی نہ سکے۔ لوگوں کے دل آپ مجبور ہو رہے تھے کہ وہ اس دین کو قبول کر لیں۔ اسلام کو ایک ایسی انسانی صورت میں اگر پیش نہ کیا گیا ہوتا...... عقیدہ کو اگر کردار میں یوں تبدیل نہ کیا گیا ہوتا اور لوگ اسلامی تصور حیات کو انسانی صورت میں چلتا پھرتا نہ دیکھ لیتے تو لوگوں کی اتنی بڑی تعداد اتنی محدود مدت میں اس نئے دین کے اندر داخل نہ ہو پاتی بے شک ان کو جنگ کے میدان میں شکست ہی کیوں نہ دے لی گئی ہوتی۔ تلوار خطۂ ارض فتح کر سکتی ہے مگر دلوں کو مفتوح نہیں کر سکتی!

خدا اگر خود اپنے رسول سے یہ کہتا ہے: **ولو کنت فظاً غلیظ القلب لا نفضوا من حولک** "اے نبی اگر کہیں تم تندخو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد سے چھٹ جاتے"...... جبکہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں تو پھر یہ فاتحین جو کہ نبی بھی نہیں کیونکر اقوام عالم کے دِل جیت سکتے تھے اگر وہ مکارم اخلاق اور اعلیٰ قدروں میں بلندی کی ایک خاص سطح کو نہ پہنچے ہوتے!؟

یہ واقعہ کہ تاریخ کی اس خاص گھڑی میں قوموں کی قومیں داخل اسلام ہو جاتی ہیں دراصل اس منفرد انداز تربیت کے ثمرات میں سے ایک ثمر ہے جس پر رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں اسلام کی اس تاسیسی جمعیت کی اٹھان ہوئی تھی۔ یہ انسانی جمعیت جس کی تربیت اور تیاری پر آپؐ نے اپنی تمام تر محنت اور توجہ صرف کر دی تھی بالآخر خدائی تقدیر کے روپزیر ہونے کا ایک عملی ذریعہ بنی۔ خدا نے انسانی تاریخ میں ایک واقعہ کو رونما تو کرنا تھا، یہ اس کی تقدیر تھی، مگر رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں تربیت پائی ہوئی اس جمعیت نے خدائی تقدیر کیلئے ایک ظاہری پردے کا کام بہرحال دیا۔

| | |
|---|---|
| هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى | وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے |
| وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ | تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا |
| وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (الصّف:9) | ہی ناگوار ہو |

یہ حیرت و اعجاب جو اسلامی فتوحات کو دیکھنے والے ہر شخص کے حصہ میں آتا ہے صرف یہ بھی نہیں کہ ایک مختصر ترین مدت میں قوموں کی قومیں اور ملکوں کے ملک داخل اسلام ہوتے ہیں بلکہ یہ حیرت و اعجاب اس عدل کو دیکھ کر بھی ہوتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں تربیت پائے ہوئے ان مسلمانوں نے اپنے مفتوحہ ممالک میں قائم کر کے دکھایا تھا۔ یہ عدل وانصاف جو مفتوحہ ممالک میں وہاں کے اسلام قبول کرنے والوں کے ساتھ ہی نہ تھا بلکہ یکساں طور پر ان کے ساتھ بھی تھا جو اپنے دین پر باقی رہنے پر مصر ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ آج ہر شخص جانتا ہے کہ عمرو بن العاصؓ کا بیٹا جب مصر میں ایک قبطی کے بیٹے کو چھڑی سے مارتا ہے تو وہ شکایت لے کر سیدھا مدینہ حضرت عمرؓ کے پاس پہنچتا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت عمرؓ کی زبان سے نکلا ہوا یہ جملہ بھی آج ہر شخص کی زبان پر ہے جو آپؓ نے اپنے گورنر عمرو بن العاصؓ کو مخاطب کر کے کہا تھا: "تم لوگوں نے انسانوں کو غلام کب سے بنا لیا جبکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا ہے" یہ تاریخ کا کوئی معمولی وقوعہ نہیں!

دیکھنے والوں کا حیرت واعجاب یہاں بھی نہیں رکتا۔ بے شمار باتیں ہیں جو دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ کرکے رکھ دیتی ہیں۔ قوموں کی قومیں صرف اس نئے دین میں ہی داخل نہیں ہوتیں بلکہ اس دین کی زبان کو بھی گلے سے لگاتی ہیں۔ کوئی زبردستی نہیں ہوتی مگر عربی زبان متعدد اقوام کی پسندیدہ زبان بن جاتی ہے۔ قومیں اس تہذیب پر یوں فریفتہ ہوتی ہیں کہ اپنی زبان تک بھول جاتی ہیں۔ (1) یہاں تک کہ ان قوموں کے وہ لوگ بھی جو اپنے دین پر باقی رہتے ہیں وہ بھی عربی زبان بولنے لگتے ہیں۔ سب کی زبان عربی ہو جاتی ہے۔ اب یہ عربی میں بولتے ہیں۔ عربی میں سوچتے ہیں اور عربی ہی میں مراسم بندگی بجالاتے ہیں۔

مزید یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا ایک منتخب جتھے کی تربیت و تیاری کی بابت حد سے بڑھا ہوا اعتنا اس بات کی ضمانت بھی بنا ___ گو اصل میں تو یہ خدا کا فضل تھا ___ کہ وہ منہج جو اس تحریک کی بنیاد تھا وہ تحریک کے بانی وموسس کے دُنیا سے چلے جانے کے بعد بھی اسی شان سے جاری وساری رہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت راشدہ ___ اپنی تمام تر آب وتاب کے ساتھ اور زندگی کے ہر پہلو میں اپنی قائم کی ہوئی اعلیٰ ترین اور حسین ترین قدروں کے ساتھ ___ اسی حقیقت کا مصداق نظر آتی ہے کہ یہ تحریک آپؐ کے بعد بھی اپنا تمام تر حسن برقرار رکھنے میں کامیاب رہی ہے اور بڑے بڑے بحران بھی اس کو پٹڑی سے ہلا نہ سکے۔

باوجود اس کے کہ وحی منقطع ہو گئی اور تحریک کا عظیم قائد ﷺ نظروں سے روپوش ہو گیا تحریک اسی کے منہج کا تسلسل بنی رہی ایک آدھی دُنیا میں پھیل جانے کے باوجود اس کے پایۂ استقلال میں کوئی لغزش آئی اور نہ چال میں کوئی فرق آیا...... 'خلافت راشدہ' اسی حقیقت کا نام ہے!

صحیح ہے کہ یہ دور بہت دراز نہ ہوا، اور نہ ہی یہ تقدیر میں تھا کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ تک باقی رہے، اور جلد ہی معاملہ نیچے بھی آنے لگا...... مگر وہ سطح جس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو پہنچا لیا تھا معاشرے کا اس سطح سے نیچے آنا دراصل 'اسلام' سے نیچے آنا نہ تھا۔ ایک مثالی دور کا باقی نہ رہنا 'اسلام' کا خاتمہ نہ تھا، جیسا کہ مستشرقین اور دُشمنانِ اسلام نے ایک بڑے خاموش انداز میں ہمارے پڑھے لکھوں کے ذہن میں ڈال دیا ہے۔ اسلام کا مثالی دور اخلاق اور کردار اور اقدار کے معاملے میں دراصل مسلم

---

(۱) اسلامی فتوحات سے پہلے عربی صرف جزیرہ نمائے عرب ہی کی زبان تھی، پورا 'عرب ورلڈ' جو کہ شمالی افریقہ (مراکش) تک چلا جاتا ہے بلکہ کبھی اسپین تک جاتا تھا، دراصل اسلامی فتوحات ہی کا مرہونِ منت ہے۔ مترجم

معاشرے کا آسمان کی بلندیوں پر پہنچ کر پرواز کرنا تھا اور اس کا بڑا حصہ اس بات پر مشتمل تھا کہ لوگ مستحبات کو بھی ازخود اپنے لئے فرائض کا درجہ دے رکھتے تھے جس کو کہ 'تطوع' کہا جاتا ہے...... اب اگر اس کے بعد لوگ فرائض کے التزام یا اس سے قریب قریب کی کسی سطح پر آ جاتے ہیں اور ان کے پروں میں وہ نشاط نہیں رہتا کہ یہ بھی بلندی کی اسی سطح پر پرواز کریں جس پر اس سے پہلے کا معاشرہ کرتا رہا تو اس کو تنزل تو بہر حال کہا جائے گا مگر یہ اسلام کی ایک مثالی حالت کو چھوڑ آنا ہے نہ کہ اسلام ہی کو چھوڑ آنا۔ چنانچہ اس بلندی سے نیچے اتر کر بھی مسلمانوں نے دُنیا میں جو توحید نشر کی اور دُنیا کو جس طرح تہذیب اور اعلیٰ قدریں سکھاتے رہے ___ یہاں تک کہ سترھویں صدی تک کا یورپ بھی مسلمانوں کی سکھائی ہوئی تہذیبی قدروں سے استفادہ کرتا نظر آتا ہے...... سترھویں صدی یعنی مسلمانوں کے مثالی دور کے بعد سے لے کر پوری دس صدیاں ___ اتنا عرصہ مسلمان جو دُنیا پر اپنی علمی اور اخلاقی برتری منوا کر رہے تو یہ بھی کیا کم ہے۔

اس کے باوجود اسلام کا وہ مثالی دور محض کوئی بجلی کی چمک ایسا واقعہ بھی نہ تھا جس نے کوئی لمحے بھر کو روشنی کی اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نگاہوں سے روپوش ہو گئی اور جس کی بابت بعد والے یہ پوچھیں کہ یہ واقعہ ہوا بھی یا نہیں۔ اسلام کا یہ مثالی دور ایک ایسا حسین واقعہ ہے جو آج تک اس راہ پر چلنے والوں کیلئے راستے کو روشن کر رہا ہے اور جب تک خدا چاہے یہ آنے والی نسلوں کیلئے روشنی فراہم کرتا رہے گا۔ اسلام کا یہ مثالی دور اپنی مثالی واقعیت کے ساتھ آج بھی ہر نسل کی رہنمائی کرتا ہے۔ ہر نسل صفحۂ تاریخ پہ لکھنے کیلئے اسی کی روشنائی استعمال کرتی ہے۔ ہر نسل اسلام کی جانب بڑھتے ہوئے اسی کے نشانات قدم کو دیکھتی ہے اور انہی کی سطح کو چھونے کی خواہش کرتی ہے۔ یہ اگر وہاں نہ بھی پہنچ پائے پھر بھی اس کا رخ اسی کی جانب رہتا ہے۔ کوئی نسل اسلام کی اس بلندی کو بے شک نہ پہنچ پائے یہ بھی کیا کم ہے اس کا رخ بہر حال بلندی ہی کی جانب ہو۔ وہ اپنے آپ کو اس بلندی کی سمت سے آوازیں پڑتی بدستور محسوس کرے۔ وہ اپنے اہداف کا تعین کرنے میں ذرہ بھر دشواری نہ پائے۔ وہ چڑھائی جو صحابہ نے چڑھ لی تھی کوئی دوسری نسل نہ چڑھ پائے محض اس کی کوشش کر لے تو بھی کیا کم ہے۔ بے ہدف اور بے سمت بیٹھ رہنے سے تو یہ بھی کہیں بہتر ہے، کیونکہ بیٹھ رہنے کا تو ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ یہ اترائی میں اور بھی لڑھکتی جائے...... کہ زمین بہر حال کشش رکھتی ہے۔

تاریخ اسلام میں جتنی بھی تحریکیں اصلاح اور تجدید کیلئے اٹھیں ___ جو کہ ہر دور میں ہی اٹھتی رہیں اور شمار سے باہر ہیں، اور آج کی اسلامی بیداری کی تحریک بھی ان میں سے ایک ہے ___ ایسی ہر اصلاحی اور تجدیدی تحریک دراصل اسلام کے اس دور اول کا ہی ایک انعکاس ہے ___ ہر تحریک اسی کے آثار میں سے ایک اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین اور دشمنان اسلام جتنے بھی ہیں ہمیشہ اس بات کیلئے کوشاں رہے ہیں کہ اسلام کے اس دور اول ہی کی صورت کو کسی طرح مسلمانوں کے ذہن میں مسخ کر دیں۔ یوں اسلام کی ہر نسل جہاں سے روشنی کی کرن پاتی ہے کسی طرح اس روشنی کو ہی بجھا دیں تا کہ ان میں بلندی کی جانب اٹھنے کا خیال ہی پیدا نہ ہو۔ گو ان کی یہ کوشش خدا سے فضل کامیاب ہونے والی نہیں۔ یہ خدا کی تقدیر ہے جس سے ٹکر لینا ان کے بس کی بات نہیں۔

| | |
|---|---|
| يُرِيدُونَ لِيُطْفِؤُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (الصف:٨) | یہ لوگ اپنے مونہوں (کی پھونکوں) سے اللہ کے نور کو بجھا دینا چاہتے ہیں۔ اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو |

☆☆☆☆☆☆☆

یہاں ہم ایک اور امر کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس کو کہ رسول اللہ ﷺ کے منہج تربیت میں، جو آپؐ نے اس منتخب ایمانی جمعیت کو دی، بے حد زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ ہے رسول اللہ ﷺ کا اپنے اصحاب سے بکثرت مشورہ فرمانا اور ان کو حتی الامکان شریکِ رائے رکھنا۔

سب سے پہلے تو یہی سوال بہت اہم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کسی سے صلاح مشورہ کی کیا سرے سے کوئی ضرورت تھی جبکہ آپ کو ہدایات دینے کیلئے آسمان سے وحی اترتی تھی اور جب خدا کو کچھ وضاحت فرمانا منظور ہوتا تو وحی کے ذریعے ہر معاملہ رسول اللہ ﷺ پر کھول کر رکھ دیا جاتا تھا اور جب بھی کہیں کسی انحراف کا خدشہ پیدا ہوتا مسلم جماعت کا رخ درست کر دینے کیلئے براہ راست خدا کی جانب سے احکامات نازل ہو جاتے تھے؟ بلکہ خود رسول اللہ ﷺ کی تو اپنی تصحیح کیلئے وحی اتر آتی تھی جیسا کہ عبداللہ بن ام مکتوم کے واقعہ میں ہوا۔ اور جیسا کہ بدر کے قیدیوں کے معاملہ میں ہوا! جس کو وحی ملتی ہو اور جس کے ہر اقدام کو درست رکھنے کیلئے خدا ہدایات بھیجتا ہو کیا وہ انسانوں سے مشورہ کرنے کا حاجت مند ہوتا ہے؟!

ظاہر ہے کہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ مشورہ کے ضرورت مند نہ تھے۔ مکہ کا دور ہو یا مدینہ کا، دعوت کی ذمہ داریاں نبھانا اور مومن جماعت کی قیادت کرنا سب خدا کی براہ راست نگرانی کے تحت ہو رہا تھا۔ یہ

دراصل تربیت کا حصہ تھا اور تربیت کے بنیادی لوازمات۔

صرف سمع وطاعت کی بنیاد پر کی گئی تربیت کچھ فرض شناس اور پابندِ حکم سپاہی تو پیدا کر سکتی ہے مگر اس سے عظیم الشان قیادتیں جنم نہیں لیتیں!

رسول اللہ ﷺ کے حکم کا پابند ہونا صحابہ کی نگاہ میں یقیناً ایک عبادت تھی اور اس کی فرضیت خدا کی طرف سے ان پر عائد کر دی گئی تھی:

| | |
|---|---|
| مَّنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (النساء:٨٠) | جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اُس نے دراصل خدا کی اطاعت کی |
| وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ (النساء:٦٤) | "ہم نے جو بھی رسول بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اذن خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے |
| وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا (الحشر:٧) | جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اُس سے رک جاؤ |
| يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ (النساء:٥٩) | اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی |
| فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (النور:٦٣) | پس ڈر جانا چاہیے ان لوگوں کو جو رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں کہیں وہ کسی فتنہ میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آ جائے |
| مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ الْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا عَن رَّسُولِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِ (التوبة:١٢٠) | مدینہ کے باشندوں اور گرد ونواح کے بدویوں کو یہ ہرگز زیبا نہ تھا کہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہتے اور اس کی طرف سے بے پروا ہو کر اپنے اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے |

مگر اس کے باوجود آپ ﷺ کے پیش نظر صرف یہ نہیں تھا کہ آپؐ کے اصحاب آپؐ کے پابندِ حکم سپاہی ہوں اور بس۔ اگرچہ آپؐ کا پابندِ حکم ہونا فلاح بھی تھی اور نجات بھی اور یہ بیک وقت خدا کی عبادت بھی تھی...... دراصل آپ کے پیش نظر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ ممکنہ حد تک آپؐ ان میں کے ایک ایک فرد کو قیادت میں تبدیل کر دیں اور یوں اپنے بعد انسانیت کو اور انسانی معاشروں کو ایک زبردست قیادت دے کر جائیں۔ تاکہ خدا کی یہ تقدیر اور ارادہ انہی کے ذریعے انسانی دُنیا کے اندر رو پذیر ہو۔

| | |
|---|---|
| وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً (البقرة: ١٤٣) | اسی طرح ہم نے تو تمہیں ایک اُمت وسط بنایا ہے تا کہ تم دُنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو |

اب قیادت اور سرکردگی کی اہلیت پیدا کرنے کیلئے جو تربیت درکار ہے اس میں یہ بے انتہا ضروری ہے کہ قائد اپنے زیر تربیت افراد سے مشاورت کرے......

آگہی اور سوجھ اور اعتماد، مشاورت اور تبادلہ آراء سے پیدا ہوتی ہے اور مشاورت اور تبادلۂ آراء سے ہی ترقی پاتی ہے۔ یہ آگہی اور سوجھ اور اعتماد اس 'بصیرت' کا باقاعدہ حصہ تھا جو اصحاب میں پیدا کی جانا مطلوب تھی۔

| | |
|---|---|
| قُلْ هَـذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَاْ وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللّهِ وَمَا أَنَاْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (یوسف:۱۰۸) | صاف کہہ دو: میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں ایک خاص بصیرت پر رہتے ہوئے، میں خود بھی اور میرے پیروکار بھی۔ اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں |

آیت کے سیاق سے یہ واضح ہے کہ ایمان کے ساتھ ساتھ 'بصیرت' داعی کی ایک باقاعدہ اہلیت اور اس کی تربیت کی ایک باقاعدہ سطح ہے اور یہ بھی باقاعدہ طور پر ہی مطلوب ہے۔ چنانچہ "سبحان اللّٰہ وما أنا من المشرکین" کے الفاظ اگر عقیدہ اور ایمان کی ضرورت پر دلالت کرتے ہیں تو "بصیرت" الگ سے اور مستقل بالذات انداز میں داعی کی ضرورت قرار پاتی ہے۔

پس یہ درست ہے کہ 'ایمان' مطلوب ہے۔ مگر 'بصیرت' بھی عین اسی طرح مطلوب ہے۔ تا کہ انسانوں کا کوئی مجموعہ اس دین کو لے کر انسانی زندگی میں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ سکے اور تا کہ ایک تحریک اپنی محنت اور جدوجہد کے پورے ثمرات دے اور تا کہ اس جدوجہد کا کوئی حصہ یا یہ پوری جدوجہد ہی کوئی غلط یا بے کار حرکت ہو جانے کے سبب سے اکارت نہ چلی جائے۔

قائد کی جانب سے اپنے پیروکاروں کے ساتھ مشاورت کی جانا انکے اندر یہ قابلیت پیدا کرتا ہے کہ وہ خود اپنے ذہن سے سوچیں اور مختلف مواقف اور مختلف آراء کا باقاعدہ وزن کریں اور ان میں سے درست ترین اور لائق ترین رائے کو اختیار کرتے ہوئے عین وہ موقف اپنائیں جس کا کہ اپنایا جانا ضروری ہو۔

پھر یہ مشاورت کی جانا ان کو نتائج کی ذمہ داری اٹھانے پر بھی تیار کرتا ہے۔ چنانچہ رائے دینا جہاں ایک امانت ادا کرنا ہے وہاں ایک ذمہ داری اٹھانا بھی ہے...... پس مشارت جتنی زیادہ ہوگی مشورہ دینے والے اتنا ہی گہرائی سے سوچنے کے عادی ہوں گے اور اتنا ہی بات کو گہرائی میں جا کر دیکھنے اور پرکھنے کے عادی بنیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ اتنا ہی ان کے اندر ذمہ داری اٹھانے کی اہلیت بڑھے گی۔ یوں انسان ایک ایسی صورتحال کیلئے تیار ہو جائے گا کہ جب اس کو خود عملی فیصلے کرنے پڑیں اور خود اس کو مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑے تو وہ ان کا سامنا کرنے سے جی نہ چرائے اور نہ ذمہ داری اٹھانے کو کوئی ہوّا سمجھے جبکہ یہی وہ صفات ہیں جو ایک کامیاب قیادت کے اندر مطلوب ہوتی ہیں۔

بلاشبہ ہر انسان کامیاب قیادت نہیں بن سکتا۔ مگر کوئی شخص قیادت کی صلاحیت رکھتا بھی ہو تو اس کی صلاحیتیں اس وقت تک نکھر کر سامنے نہ آئیں گی جب تک کہ وہ کسی مجموعہ کے اندر رہتے ہوئے ایک مربی سے مطلوبہ تربیت نہ پالے۔ یوں کسی ایک مجموعہ کے اندر رہنے سے ہر شخص کی صلاحیتیں خود بخود نکھر کر سامنے آئیں گی۔ قیادت ہر ایک کو اپنی صلاحیت دکھانے کا موقعہ فراہم کرے گی تو کوئی شخص جتنا نمایاں ہونے کے قابل ہوگا خود بخود ہو جائے گا...... رہا یہ کہ قیادت ان کو فرمانبرداری اور حکم بجالانے کی ہی تربیت دے اور سب کے سب امور میں ان سے بس سمع اور اطاعت ہی مطلوب ہو تو کوئی بھی اس فضا میں مہارت اور تجربہ کاری حاصل نہ کر پائے گا۔ ایسے لوگوں پر جب کوئی ذمہ داری آ پڑے گی تو وہ اضطراب اور انتشار کا شکار ہوں گے اور 'باصلاحیت قائد' کے چلے جانے کے بعد سب کچھ درہم برہم ہو جائے گا بے شک انہوں نے قائد کی زندگی کتنی ہی سمع و اطاعت اور کتنی ہی سپاہیانہ جانفروشی کیوں نہ دکھائی ہو!

یہ وجہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے پیروکاروں کے ساتھ مشاورت کی اتنی کیوں ضرورت محسوس کرتے تھے، جبکہ آپؐ شخصی طور پر اس مشاورت سے بے نیاز تھے۔ رسول اللہ ﷺ دراصل ان کو کسی بڑی مہم کیلئے تیار کر رہے تھے اور جانتے تھے کہ ان کو کس چیز کیلئے تیار کر رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو اپنے پیچھے بہت ہی زیرک، معاملہ فہم اور منجھے ہوئے قائدین کی ایک کھیپ کو چھوڑ کر جانا تھا۔ یہ سب ایک خاص معیار کے مشیر تھے۔ ان کو رائے اختیار کرنے میں کمال کی تربیت دی گئی تھی۔ اور یہ اس لئے کہ آپؐ کے بعد کام جوں کا توں چلتا رہے اور تا کہ جب وہ عظیم ترین قائد جس پر وحی اور الہام اترتا تھا

دُنیا سے چلا جائے تو اس کا کام لوٹ کر پیچھے ہرگز نہ آنے پائے بلکہ اس کو آگے بڑھانے کیلئے بہترین، باصلاحیت اور تجربہ کار قیادت موجود ہو اور آنے والے وقت میں اپنی ذمہ داری ادا کرنے کیلئے پوری طرح مستعد۔

☆☆☆☆☆☆☆

یہ ہے وہ 'بنیادی جمعیت' جسے رسول اللہ ﷺ نے سینت سینت کر پروان چڑھایا اور یہ ہے اس کا وہ کردار جو صفحۂ تاریخ پہ ہمیں جلی ترین صورت میں نظر آتا ہے۔

ایک 'بنیادی جتھے' کی تیاری، کوئی تعیش Luxury نہیں تھا۔ نہ ہی وہ عظیم الشان محنت جو رسول اللہ ﷺ نے بنفس نفیس اس کی تربیت اور تیاری پر فرمائی کوئی 'زائد از ضرورت' محنت تھی۔ یہ محنت خدا کی ہدایت سے ہوئی۔ یہ خدا کا الہام تھا۔ اُس کی اعانت اور اُس کی توفیق تھی۔ یہ اس دین کا لازمی ترین فرض اور ضرورت تھی۔ دین جس مقصد کیلئے اتارا گیا اس کے روبہ عمل آنے کا یہ لازمی ترین تقاضا تھا۔

اب اس کے بعد ہم اپنے دور کی طرف آتے ہیں۔ اپنے اس دور کا ایک طرف ہمیں یہ تعین کرنا ہے کہ اس کا اصل نقشہ ہے کیا اور دوسری طرف اس بات کا تعین کرنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دور میں جس ایک بنیادی ایمانی جتھے کی اول اول تیاری کی تھی اور جس نے کہ آخر کار اس دین کو لے کر معاشروں کی سرزمین پر چلنے کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھایا تھا اس عمل کی ہمارے اپنے دور کے اندر کیونکر تقلید ہوسکتی ہے۔

آج جاہلیت کی صورت حال کیا ہے؟

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"ہاں رہا رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد کا دور، تو یہ ممکن ہے کہ مطلق جاہلیت کسی ایک ملک میں پائی جائے اور کسی دوسرے میں نہ پائی جائے، جیسا کہ مطلق جاہلیت دارالکفار کے اندر اب بھی پائی جاتی ہے۔ یا یہ کہ مطلق جاہلیت کسی ایک شخص میں پائی جائے اور کسی دوسرے میں نہ پائی جائے، جیسا کہ مطلق جاہلیت ایک ایسے شخص کے اندر پائی جائے گی جو ابھی اسلام لے کر نہیں آیا اگرچہ وہ دارالاسلام میں کیوں نہ بستا ہو۔ رہا یہ کہ پورا زمانہ جاہلیت میں ہو، تو محمد ﷺ کی بعثت

کے بعد ایسا نہ ہوگا۔ آپ کی امت میں سے بہرحال ایک طائفہ ایسا رہے گا جو حق کی بنا پر برتری پا کر رہے گا اور قیامت تک باقی رہے گا۔ رہی مقید جاہلیت (یعنی جزوی جاہلیت) تو وہ دیارِ اسلام کے بعض خطوں میں پائی جا سکتی ہے اور بہت سے مسلمانوں کے اندر بھی موجود ہو سکتی ہے"۔[1]

یہ اگر آٹھویں صدی ہجری کا حال ہے جبکہ مسلمان ابھی اپنے دین کے بہت سے امور سے تمسک رکھتے تھے، گو وہ دین کے بہت سے امور میں اس وقت کوتاہ بھی ہو رہے تھے...... امام ابن تیمیہ کے زمانہ میں اگر یہ معاملہ ہے تو امام ابن تیمیہ ہمارے آج کے اس دور کی صورتحال کو دیکھ لیں تو کیا کہیں؟ ...... جبکہ ما انزل اللہ سے متصادم شرائع کو باقاعدہ قانون بنا دینے کی بدعتِ رائجہ ہر طرف عام ہو گئی ہے۔ ما انزل اللہ سے قطعی بے نیاز ہو کر جائز اور ناجائز کا تعین ہوتا ہے۔ 'صرف خدا کی اتاری ہوئی شریعت' پر فیصلے ہونا بسا اوقات خلاف آئین قرار پاتا ہے۔ اس بات کا مطالبہ کیا جانا تک بہت جگہوں پر جرم ہے بلکہ گردن زنی ہے۔ سینکڑوں ہزاروں لوگ محض اسی 'جرم' کے 'ارتکاب' پر پس زنداں چلے جاتے ہیں۔ اصل یہ ہو گیا ہے کہ عورتیں برہنہ اور بے پردہ ہو کر باہر آئیں۔ کسی کا باپردہ ہونا عام معمول کے خلاف واقعہ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے گویا یہ معاشرے کی ریت سے ایک انحراف اور بدعت کا درجہ رکھتا ہے اور ذرائع ابلاغ کو اور 'ادب' کو حق ہے کہ ایسے رجعت پسند اور خلاف معمول رویوں کو بڑے بڑے اچھوتے انداز میں مذموم اور قابل نفرین بنائیں...... کئی ملکوں میں زنا اور بدکاری کو قانون کا تحفظ حاصل ہے جب تک کہ یہ بدکاری طرفین کی رضامندی سے ہوتی رہے۔ گویا 'طرفین' ہی اس معاملہ کے متعلقہ فریق ہیں اور خدا کو تو اس معاملہ میں کوئی دخل ہی نہیں اور نہ ہی آج کی جاہلیت کا یہ عرف اور رواج خدا کو اجازت دیتا ہے کہ وہ لوگوں کے 'ذاتی معاملات' میں دخل دے۔ 'خدا' کا کیا کام کہ وہ لوگوں کے اجتماعی معاملات میں جائز اور ناجائز کا تعین کرے۔ خدا کی خاطر ولاء اور براء...... یعنی خدا کیلئے کسی کا دوست اور حلیف ہونا اور خدا کی خاطر ہی کسی کا حریف ہونا خواہ مخواہ کا تعصب اور 'امتیازی رویہ' discrimination قرار پاتا ہے۔ اس دور کا ذوق ایسے رویے کا ہرگز متحمل نہیں۔ کیونکہ جدید ذرائعِ مواصلات کی بدولت آج کی یہ دُنیا ایک ہی بستی بن چکی ہے، اب کسی کیلئے جائز نہیں کہ اس میں جو عرف اور رواج چلتے ہیں اور جو افکار اور جو

---

(۱) امام ابن تیمیہؒ کی کتاب "اقتضاء الصراط المستقيم مخالفة أصحاب الجحيم" ص ۷۸-۷۹

فیشن اس میں پذیرائی پاتے ہیں ان سے الگ راہ اختیار کرے، چاہے اس کی کوئی بھی وجہ ہو۔ پھر ایسا کرنے کی وجہ اگر دین ہو اور 'عقیدہ' کا فرق ہو وہ تو سب سے زیادہ ناروا کام ہے اور 'تعصب' و 'امتیازی رویہ' discrimination کی سب سے بُری صورت...... اسلام کی یہ بات، آج اس کا 'رواج' نہیں۔ وہ چیز اس کا 'رواج' نہیں...... وہ چیز...... وہ چیز...... تقریباً کسی بھی چیز کا 'رواج' نہیں!

ابن تیمیہؒ اگر آج کے مغرب کو دیکھ لیں اور بہت سے مسلم ملکوں میں جو 'چلتا' ہے اس کو دیکھ لیں تو اس کی بابت کیا رائے رکھیں!؟

بدأ الاسلام غريبا و سيعود كما بدأ غريباً فطوبى للغرباء (۱) — اسلام آغاز تھا تو یہ اجنبی تھا۔ یہ دوبارہ، اسی طرح جیسے آغاز میں تھا، پردیسی اور اجنبی ہو رہے گا۔ پس خوشخبری ہو اس دور کے 'پردیسیوں' کو!

آج کے ان 'پردیسیوں' (غرباء) کو اس وقت کیا کرنا ہے؟ اور وہ کیا کام ہے جس کی بنا پر خدا کے ہاں وہ اس اعزاز کے مستحق ہیں؟

بے شک ہر وہ محنت اور جہد جو آج کے یہ 'غرباء' اسلام کی اس غربت ثانیہ کے خاتمہ کیلئے کریں گے وہ اس پر خدا سے اجر پائیں گے اور اس پر قرآن کریم کی نص شاہد ہے:

ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ لاَ يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلاَ نَصَبٌ وَلاَ مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللّهِ وَلاَ يَطَؤُونَ مَوْطِئاً يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلاَ يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلاً إِلاَّ كُتِبَ لَهُم بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ إِنَّ اللّهَ لاَ يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ وَلاَ يُنفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلاَ كَبِيرَةً وَلاَ يَقْطَعُونَ وَادِياً إِلاَّ كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ (التوبة: ۱۲۰- ۱۲۱)

یہ اس لئے کہ اللہ کی راہ میں وہ جو بھی پیاس سہیں، جو بھی مشقت اٹھائیں، یا بھوک برداشت کریں، جس زمین پر بھی پاؤں دھریں جبکہ اس سے کافر خفا ہوتے ہوں اور دشمن کو جو بھی زک پہنچائیں، ہر ہر کے بدل ان کا نیک عمل (خدا کے ہاں) لکھا جاتا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نیکیوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ اور (اسی طرح) جو کچھ بھی یہ اللہ کی راہ میں خرچ کریں وہ تھوڑا ہو یا بہت اور (سعی جہاد میں) یہ جو وادی بھی پار کریں، یہ سب بھی ان کے نام لکھا جاتا ہے تا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ان اعمال کا اچھے سے اچھا بدلہ ان کو دے

مگر یہ بات اس میں مانع نہیں کہ آج کے ان 'غربا' کے پاس آگے بڑھنے کا ایک باقاعدہ پروگرام ہو اور یہ اس مقصد کے حصول کیلئے ایک زبردست منصوبہ پاس رکھتے ہوں۔ اس عمل کی ان کے

ہاں اولویات priorities پوری طرح واضح ہوں اور وہ یہ اندازہ رکھتے ہوں کہ ان کے اس دور میں ’اسلام‘ جس غربت اور اجنبیت کا شکار ہے اس غربت اور اجنبیت کی نوعیت کیا ہے اور اس کے ازالہ کیلئے کیا چارہ کار اختیار ہو۔

تو کیا اس بات کی گنجائش ہے کہ حقیقتِ اسلام پر تربیت پایا ہوا ایک مضبوط ایمانی جتھا تیار نہ کیا جائے، جو کہ ’عوام‘ کو اسلام کی اصل سمت میں اپنے ارد گرد چلا لینے پر قدرت پائے، اور اس کے بغیر ہی کام چل جائے؟

ہم یہ شروع میں ہی واضح کر دینا چاہیں گے کہ:

ہم ہرگز اس امید میں نہیں بیٹھے اور نہ کوئی اس امید میں بیٹھ رہ سکتا ہے کہ ایک ویسا ہی مضبوط ایمانی جتھا تیار ہو جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابتدائے اسلام کے اندر بنفس نفیس تیار کیا تھا۔ نہ یہ تقاضا ہم ’بنیادی جمعیت‘ کی بابت کریں گے اور نہ اس جمعیت کی ’عوامی توسیع‘ ہی کی بابت...... اس کے باوجود کچھ ضروری مواصفات ایسے ہیں جن کو پختگی سے پیدا کر لئے بغیر کوئی بھی چارہ کار نہیں اور ان کے بغیر ہرگز بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں، چاہے ان کو پختہ کرنے میں ہماری کتنی ہی محنت یا کتنا ہی وقت لگے اور چاہے اس پر ہمیں کتنی ہی تنگی اُٹھانا پڑے۔

’تربیت‘ اور ’تیاری‘ سے ہرگز ہماری یہ مراد نہیں کہ آج کی تحریکیں بھی فضا میں عین اسی بلندی پر جا کر پرواز کریں اور اسی ہمت اور قوت سے اڑان بھریں جس پر کہ صحابۂ رسول ؐ کو پہنچایا گیا تھا۔ اس کا تو اسلام آپ کو سرے سے پابند کرتا ہی نہیں...... اگرچہ افراد کی حد تک اسلام کا کوئی بھی دور ایسے نمونوں سے خالی نہیں رہا جو ایمانی افق کی اس بلندی کو ہاتھ لگا آتے رہے جس پر صحابہ فائز تھے۔

کم از کم دین کے اساسیات اور فرائض کی سرزمین پر تو چلیئے۔ کم از کم کے قریب پہنچنے کی کوشش تو ہو۔ تاکہ ایک طرف اس عمل کی خدا کے ہاں مقبولیت ہو اور دوسری طرف یہ دُنیا میں ثمر آور ہو۔

تو پھر وہ بنیادی مواصفات کیا ہیں جو کہ اسلام کی ایک بنیادی جمعیت کے اندر، جس کو کہ بالآخر عوام کے اندر اپنی جڑیں پھیلانی اور ان کو ایک سمت دینی اور ان کو تربیت دینی ہے، سب سے پہلے روپذیر ہو جانی چاہئیں؟

---

(۱) حدیث کے مصدر کی جانب پیچھے اشارہ گزر چکا۔

کیا اس کیلئے کوئی سا بھی انسان کام دے دے گا اور اس میں بس یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لے آیا ہے۔ نمازی ہے۔ زکوٰۃ دیتا ہے اور دیندارانہ مظاہر رکھتا ہے؟ بلاشبہ یہ عظیم مواصفات ہیں۔ یہ سب کی سب مطلوب بھی ہیں۔ مگر یہ کس درجے اور معیار میں مطلوب ہیں؟ اور کیا ایک بنیادی جمعیت کے اندر، جس کو کہ معاشرے پر اثر انداز ہونا ہے، بس یہی اور ایسی ہی مواصفات درکار ہیں؟

اس سے پہلے محض بطور ایک مثال میں بات کر آیا ہوں، اسی کی جانب پھر ایک بار اشارہ کرتا ہوں...... کسی انسان کو آپ راستے میں روک کر سوال کریں: روزی دینے والا کون ہے؟ کیا کوئی شک ہے کہ وہ کہہ دے: خدا کی ذات! مگر جب روزی کے معاملہ میں اس پر تنگی آتی ہے اور کوئی اس کا نقصان کرتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے فلاں شخص میری روزی کے در پے ہے۔ تو کیا اس کا وہ جملہ جو اس نے جھٹ سے کہہ دیا تھا کہ 'روزی دینے والی خدا کی ذات ہے' اس کے شعور و احساس کے اندر ایک ایمان اور یقین کی صورت اختیار کر چکا تھا جب اس نے یہ زبان سے ادا کر دیا تھا؟ دل کا یقین تو وہ چیز ہے جو رویہ و سلوک میں ڈھل جائے۔ کیا اس سے اس جملہ کا اقرار کروانے پر اکتفا کیا جائے گا یا ضرورت ہے کہ ابھی یہ اس کے دل کی گہرائی میں اُترے تا کہ 'لفظ' ایک 'یقین' کی صورت دھارے؟ یہی معاملہ خدا کے نفع و نقصان کے مالک ہونے کی صفت پر ایمان کا ہے۔ یہی معاملہ خدا کے زندگی اور موت دینے پر قدرت کے یقین کا ہے۔ فتنہ کے آگے 'لفظ' نہیں 'ایمان' اور 'یقین' ہی کھڑا رہ سکتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ (العنکبوت:۱۰) | لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر۔ مگر جب وہ اللہ کے معاملہ میں ستایا گیا تو اس نے لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا |

تو کیا ایک ایسا سنے سنائے انداز کا ایمان ان افراد کے معاملے میں گزارا کرے گا جن سے یہ بنیادی ایمانی جمعیت تشکیل پائے اور پھر ایک پورے معاشرتی عمل کی بنیاد اپنے کاندھوں پر اٹھائے؟

کیا ایسا ایمان آزمائش میں کھڑا رہے گا، جبکہ آزمائش خدا کی ایک سنت ہے:

| | |
|---|---|
| الم أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ (العنکبوت:۱۔۳) | الف۔ لام۔ میم۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس وہ اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون |

پھر جبکہ 'فتنہ' کسی ایک ہی صورت میں محصور نہیں۔ فتنہ محض اذیت اور تکلیف نہیں:

وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً اور ہم اچھے اور برے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں (الأنبیاء:۳۵)

'آسائش' کا فتنہ کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ بہت سے لوگ جو 'اذیت' اور 'دُکھ' کے فتنہ میں ثابت قدم رہتے ہیں وہ 'سکھ' کے فتنہ کے آگے پرکاہ بنے دیکھے گئے ہیں۔ مال کا فتنہ، اقتدار کا فتنہ، جاہ ومنصب، لیڈری، پیچھے چلنے والوں اور مددگاروں کی کثرت...... بہت سے اس فتنہ کی تاب نہیں لاتے۔ تو کیا ہر وہ شخص جو کسی 'مشکل گھڑی' میں ڈٹ جانے کی طاقت رکھتا ہو وہ 'معاشرے پر اثر انداز ہونے والی' اس بنیادی جمعیت کی عمارت میں ایک اینٹ کا کام دے سکتا ہے؟ کجا یہ کہ آدمی کے قیادت کی صف میں شامل ہو جانے کیلئے بھی بس اسی وصف کو بہت کافی قرار دیا جائے!؟

یہاں میں ایک اور مثال کی جانب اشارہ کرتا ہوں جو کہ میں اپنی کتاب **واقعنا المعاصر** میں ذکر کر چکا ہوں:

اخوت، اسلام کا ایک بہت خوبصورت اور زبردست تصور ہے۔ اس پر آپ اچھے سے اچھے اور خوبصورت سے خوبصورت پیرائے لکھ سکتے ہیں اور اس پر آپ بہت موثر گفتگو بھی کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ اسلام کی ایک اہم معاشرتی بنیاد ہے اور یہ اسلام کی وہ بنیاد ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے زیر تربیت اس جمعیت کی تیاری میں بطور خاص پیش نظر رکھا تھا جو آپؐ کے زیر سایہ پروان چڑھی تھی۔ چنانچہ آپؐ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخات قائم کی۔ تب یہ ایک ایسی اخوت تھی جو خون کے رشتوں پر فوقیت لے گئی۔ عرب جاہلیت کے ہاں کوئی مضبوط ترین رشتہ تھا تو وہ نسب کی اخوت اور خون کا رشتہ تھا۔ مگر اس پر یہ دین کی اخوت اور ایمان کا رشتہ برتری لے گیا تھا۔

مگر جیسا کہ میں اپنی کتاب **واقعنا المعاصر** میں کہہ آیا ہوں:

> لوگوں پر خوب آسائش کا وقت ہو تو 'اخوت' کا مظاہرہ کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ سکھ کا دور ہو اور گنجائش خوب ہو تو 'اخوت' کچھ زیادہ مہنگی نہیں پڑتی۔ مگر جب راستہ تنگ ہو یہاں تک کہ اتنا تنگ ہو کہ ایک وقت میں یا تو میں ہی وہاں سے گزر سکتا ہوں یا میرا بھائی ہی۔ دونوں کیلئے اکٹھے گزر لینا ممکن نہیں۔ ایک کو پہلے گزرنا ہوگا

دوسرے کو صبر کرنا ہوگا......کیا یہاں میں اپنے بھائی کو اپنے سے پہلے گزرنے پہ اصرار کروں گا یا میں خود ہی پہلے گزرنا پسند کروں گا؟ چلئے ہم اس بلند سطح تک تو نہیں جاتے جہاں پہلے اور بعد کی بات نہیں بلکہ گزر ہی ایک شخص سکتا ہو اور دوسرا گزرنے سے ہی رہ جاتا ہو۔ یعنی یا میں گزر پاؤں گا یا میرا بھائی۔ یہ بہرحال معاملے کی بہت بلند سطح ہے۔اس کی پابندی فرض بہرحال نہیں ہے گو یہ وہ سطح ہے جس پر صحابہ پائے گئے تھے اور خدا نے اس پر ان کی ستائش فرمائی تھی[**ویؤثرون علی اَنفسھم ولو کان بھم خصاصة** (الحشر:۹)''اور یہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ اپنی جگہ خود محتاج کیوں نہ ہوں] سو یہ تو وہ سطح ہے جو صحابہ کے ہاں ایک معمول بن گئی تھی اور جس پر ہونا آج نایاب ہوگیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

معاملے کے بہت سے پہلو ہیں۔مگر دو باتیں بطور خاص ایسی ہیں جن میں بہت زور دینے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں اور جو کہ آج اس دور کی اس ایمانی جمعیت کے افراد میں پائی جانا ناگزیر ہیں جس کو آج کی جاہلیت سے مڈھ بھیڑ کرتی ہے......جس کو آج کی اس جاہلیت سے نبرد آزما ہونا ہے جو سرکشی کی آخری حد تک پہنچ چکی ہے اور جو کہ حاملین اسلام کو ہر طرف سے گھیرے میں لے چکی ہے: یہ دو چیزیں ہیں: خدا کیلئے اخلاص اور تجرد ہونا اور دوسری سوجھ اور آگہی۔تحریکی معنی میں آگہی بھی اور سیاسی معنی میں ہوشمندی بھی۔

جن لوگوں کو کچھ صلاحیتیں ودیعت ہوئی ہوتی ہیں ان کیلئے اپنی 'ذات' فتنہ بن جاتی ہے۔انا، خود پسندی، خود مرکزیت شیطان کا ایک ایسا حربہ ہے جو ایک کارکن اور سپاہی کی نسبت ایک ایسے شخص پر زیادہ کارگر ہوتا ہے جو اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت نمایاں ہونے لگتا ہے اور دوسروں کی نسبت کچھ خصوصی مقام پاتا ہے۔ایک باصلاحیت آدمی کو خراب کرنے کے مواقع شیطان ایک عام مسلمان کی بہ نسبت کہیں زیادہ پاتا ہے۔پھر جوں جوں اس کی صلاحیت کی دھاک بیٹھتی ہے اور جوں جوں شخصیت نمایاں ہوتی ہے توں توں شیطان کی تگ وتاز کا میدان بھی وسیع ہوجاتا ہے۔

پھر اگر انسان کسی قیادت کے منصب پر فائز ہو تب تو فتنہ اپنے عروج کو پہنچتا ہے۔ پھر اگر وہ کوئی تن تنہا لیڈر ہو جائے تو پھر تو اس فتنہ کی کوئی حد ہی نہیں رہتی ...... یہاں اگر نفوس نے خدا کیلئے تجرد پانے پر بہت محنت نہ کر رکھی ہو اور اس پر اس کی باقاعدہ تربیت نہ ہوئی ہو تو معاملہ کسی بڑے خلط کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں آدمی کی دعوت اور آدمی کی ذات کے باہم خلط ہو جانے کا ایک بڑا اندیشہ ہوتا ہے۔

'فی الوقت دعوت کی نمائندگی میرے دم سے ہے! قیادت کیلئے مطلوبہ صفات لے دے کر ایک مجھ میں ہی تو ہیں! لہٰذا میری ذات کو اگر کوئی چیز نقصان پہنچاتی ہے تو دراصل یہ دعوت کا نقصان ہے۔ مجھے جو شخص یا جو بات اطمینان دیتی ہے وہی دعوت کا مفاد ہے! یہاں 'میں' اور 'دعوت' ایک ہو جاتے ہیں۔ یہاں سے شیطان کو ایک نفس میں کھل کھیلنے کا موقعہ ملتا ہے۔ تب ہماری سب سوچوں کا محور ہماری 'ذات' ہو جاتی ہے۔ یہ معاملہ ہمیں 'خود مرکزیت' کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔

یہ جو فلاں شخص ہے یہ میرے یعنی 'دعوت' کے راستے میں کھڑا ہے۔ یہ فلاں شخص 'میرے' ساتھ اختلاف کرتا ہے۔ یہ جو فلاں شخص ہے یہ 'میرے' سامنے اڑتا ہے۔ یہ جو فلاں شخص ہے اس سے 'میں' کچھ مطمئن سا نہیں ہوں ...... پس اِس شخص کا وجود ہرگز 'دعوت' کے مفاد میں نہیں، بلکہ تو وہ 'دعوت' کیلئے خطرہ ہے ...... پس فلاں شخص کو بولنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ فلاں شخص کو 'پیچھے' کر دیا جانا چاہیے ...... فلاں شخص کو زبان بند رکھنے پر مجبور اور اس کا کردار حاشیائی ہو جانا چاہیے ...... وہ بھی اس صورت میں اگر 'دعوت کا مفاد' اس بات کا متقاضی نہ ہو کہ اس شخص کو 'جماعت' ہی سے باہر ہو جانا چاہیے تاکہ 'دعوت' مخالفوں کے بوجھ سے ہلکی پھلکی ہو کر آگے بڑھتی رہے اور 'سیدھے راستے' پر رواں دواں رہے یعنی اس راستے پر جہاں 'میں' اور 'میری شخصیت' اور 'میری لیڈر شپ' اور 'ہماری دعوت' یکجا رہتے ہوں!'

اسلام کے تحریکی عمل کو پیش آنے والی بھیانک ترین آفات میں سے یہ ایک آفت ہے۔ یہ وہ آفت ہے جس نے افغان جہاد میں ڈیڑھ لاکھ شہیدوں کا خون ضائع کروایا۔ اس نے ہر جگہ امت کے وسائل کو اجاڑا، اس نے ہر خطے کے اندر مسلمانوں کی ہر اس امید کا خون کیا جو ان کو آگے بڑھنے کیلئے ایک کرن کی صورت کبھی کہیں دکھائی دی۔ یہ اب بھی بہت سی مسلم جماعتوں کے اندر اور ان جماعتوں کے مابین دراڑیں ڈالنے، تفرقہ اور حزبیت پیدا کرنے اور ٹوٹ پھوٹ اور نفرت و کینہ بڑھانے کا سبب بن رہی

ہے۔ یہی وہ اصل آفت ہے جو 'اختلاف' کو بہت جلد 'اصولوں پر اختلاف' کا رنگ دے دیتی ہے اور جماعتوں کے مابین کھینچا تانی کو 'فہم' اور 'طریق کار' کا فرق بنا دیتی ہے!

البتہ جب ہم اللہ وحدہ لاشریک کیلئے تجرد حاصل کرنے پر محنت کرتے ہیں تو پھر ہم تنقید کو کھلے دل سے قبول کرتے ہیں خواہ وہ تنقید ہماری ذات پر ہو یا ہمارے افکار پر یا ہمارے رویہ وطرز عمل پر۔

اسلام کی مثالی جماعت سے ہم اس امر کی ایک مثال بیان کر دیتے ہیں اس لئے نہیں کہ ہم یہ آس رکھے ہوئے ہیں کہ ایسے مناظر ہمیں اپنے ہاں بھی جابجا دیکھنے کو ملیں گے بلکہ اس لئے کہ واضح ہو کہ اللہ کیلئے پایا گیا تجرد اور بے لوثی نفوس میں کیا تبدیلی لے کر آتی ہے اور ان کو اخلاق کی کن بلندیوں تک پہنچاتی ہے جبکہ یہ نفوس بشر ہی ہوتے ہیں نہ کہ فرشتے بن گئے ہوتے ہیں۔ نہ ہی فرشتہ بن جانے کی بشری نفوس سے کبھی توقع ہونی چاہیے!

یہ عمر بن خطابؓ ہیں۔ منبر پر کھڑے خطبہ دیتے ہیں:

''لوگو سمع اور طاعت اختیار کرو''

سلمان فارسیؓ کھڑے ہو کر ٹوکتے ہیں: ''اس سمع اور اطاعت پر آج تمہارا کوئی حق نہیں رہا''

''کیوں؟'' حضرت عمرؓ سوال کرتے ہیں

سلمانؓ جواب دیتے ہیں: ''جب تک تم یہ وضاحت نہ کر دو کہ تمہارے پاس غنیمت کے مال سے یہ ایک زائد چادر کیسے آئی۔ تم دراز قامت ہو۔ ہر آدمی کے حصے میں جو ایک ایک چادر آئی وہ تمہیں پوری نہ آ سکتی تھی''

تب حضرت عمرؓ اپنے بیٹے عبداللہ کو مخاطب کرتے ہیں: عبداللہ خدا لگتی بات کرنا۔ یہ چادر جس کا میں نے تہہ بند بنایا ہے کیا تمہاری نہیں؟ عبداللہ جواب دیتے ہیں: ''یہ چادر میری تھی۔ میں نے اپنے حصے کی چادر اپنے باپ کو دے دی تھی کیونکہ یہ دراز قامت ہیں اور ہر مسلمان کی طرح ان کے اپنے حصے میں جو چادر آئی وہ ان کو کفایت نہیں کرتی تھی''۔ تب سلمانؓ آواز بلند کرتے ہیں: ''اب آپ حکم دیں۔ ہم سنیں گے اور مانیں گے''!

یہ عمر بن خطابؓ ہیں۔ وقت کے خلیفہ۔ آدھی دُنیا کے حکمران۔ کسی دینی جماعت کے امیر نہیں!

کیا خیال ہے یہاں کتنے دینی جماعتوں کے امیر ایسے ہیں جو اپنے اوپر تنقید ہوتی برداشت کر لیتے ہیں؟ کتنے امیر ہیں جن کو جب کسی مسلمان بھائی کی جانب سے حق بتایا جائے تو وہ اپنی بات سے رجوع کر لیتے ہیں؟

جب ہم خدا کی خاطر متجرد اور بے لوث ہو جاتے ہیں تو پھر ہماری اپنی ذات ہماری سوچ کا محور نہیں رہتی۔ تب معاملہ ہماری اپنی ذات کے گرد نہیں گھومتا۔ جب ہم خدا کی خاطر بے لوث اور بے غرض ہو جاتے ہیں تب ہم اپنے علاوہ کسی دوسرے کا نامور اور مقبول ہونا اپنے لئے چیلنج نہیں جانیں گے جبکہ وہ دوسرا واقعی ناموری کا حق رکھتا ہو۔ لوگوں کے اِس کے ساتھ لگنے پر یا لوگوں کے منہ پر اس دوسرے کی تعریف اور ستائش سن کر تب ہم تکلیف محسوس نہیں کریں گے۔ نہ اس کو ہم اپنی تنقیص جانیں گے۔ ہر وہ کام جو ہمارے زیر قیادت نہیں ہوتا اس کو ہم اپنی مخالفت پر محمول نہیں کریں گے۔ اس پر ہم اپنے پیروکاروں کی نظر میں اس کی اہمیت کم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کریں گے۔ اس پر ہم یہ پریشانی محسوس نہیں کریں گے کہ لوگ ہمیں چھوڑ کر کہیں اس 'دوسرے' کے گرد اکٹھے نہ ہونے لگیں۔

جب ہم اللہ کیلئے تجرد حاصل کرلیں گے تو ہمارے نزدیک لوگوں کے 'اچھا' ہونے کا معیار یہ نہیں رہے گا کہ کون کتنا ہمارا یا ہماری جماعت کا وفادار ہے اور کون کتنے جذبے سے ہمارے دھڑے میں شامل ہے۔ بلکہ کسی کے 'اچھا' ہونے کی ہمارے نزدیک ایک ہی کسوٹی ہوگی اور یہ وہی کسوٹی ہوگی جو خدا کے ہاں سے نازل ہوئی ہے یعنی ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم۔ تب لوگوں کی بابت رائے قائم کرنے کا وہی طریقہ اور وہی بنیاد ہوگی جو خدا نے مقرر ٹھہرادی ہے۔

| | |
|---|---|
| الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَى أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (النساء:۱۳۵) | اے ایمان والو! انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو"۔ |
| يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى (المائدۃ:۸) | اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ انصاف کرو۔ یہی خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے |

جب ہم خدا کیلئے اپنے نفوس میں تجرد اور بے لوثی اور بے غرضی پیدا کر لیں گے تو وہ بہت کچھ جو ہمارے مابین اس وقت ہو رہا ہے، پھر نہیں ہوگا اور تب ہماری محنت ایک دوسرے کو پچھاڑنے کیلئے نہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ چلنے کیلئے ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆☆

دوسری چیز جس پر ہم بہت زور دینے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں وہ ہے سوجھ اور آگہی اور ہوشمندی (Awareness)۔ یہ دراصل وہ 'بصیرت' ہے جس کا ذکر قرآنی آیت میں بھی ہوا ہے:

| | |
|---|---|
| قُلْ هَـــذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَاْ وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللّهِ وَمَا أَنَاْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (یوسف:۱۰۸) | کہہ دو: یہ ہے میرا راستہ، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں ایک خاص بصیرت پر رہتے ہوئے، میں بھی اور میرے پیروکار بھی۔ اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں |

جہاں تک اس بنیادی جمعیت کا تعلق ہے جس کو معاشرے پر اثر انداز ہونا ہے تو اس میں کے ہر فرد کے اندر بصیرت ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر 'گزارا' ہو جانے کا سوال ہی نہیں۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو اسلام کیلئے کئے جانے والے کام کا ایک رخ بنائے گی۔ بصیرت ہی وہ چیز ہے جس پر اس عمل کا درست رہنا موقوف ہوگا۔ کب ہمیں چلنا ہے؟ کب رکے رہنا ہے؟ کیسے چلنا ہے؟ کدھر کو اور کیونکر آگے بڑھنا ہے؟ کسی برسر اقتدار طبقے کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا ہے، تصادم یا ترکِ تصادم ...... یا پھر دوستی اور تحالف!؟ آیا اس بنیادی جتھے کی تیاری پہ محنت کرنا ہے جو معاشرے پر اثر انداز ہو یا پھر ابھی عوام اور عوامی کام کی طرف متوجہ ہونا ہے؟ اور اگر عوام کو اپنی جانب متوجہ کرنا ہے تو بھی عوام سے کیا کہنا ہے: کیا قومی مسائل کو اپنی دعوت کے زیر استعمال لانا ہے اور روٹی اور بیروزگاری اور مہنگائی پہ عوام کی توجہ لینی ہے یا لوگوں کے ساتھ عقیدہ، ایمان اور تربیت کے موضوعات پہ پورا زور دینا ہے؟ پھر یہ کہ دشمنوں کو ابھی ہم نے اپنی قوت دکھا کر مرعوب کرنا ہے یا ان سے ابھی رخ پھیر کر رکھنا ہے؟ اور پھر یہ بھی کہ ہمارے دشمن ہیں کون کون اور کہاں کہاں؟ کیا یہ مقامی مخالفین ہی ہمارے دشمن ہیں یا پھر وہ عالمی جاہلیت ہے جو ایک وسیع دائرہ اثر رکھتی ہے اور جو کہ دُنیا بھر سے یہود، نصاریٰ، مشرکین اور منافقین کے ملنے سے وجود میں آتی ہے؟ ایسے بیسیوں سوال ہیں جو کہ جواب طلب ہیں اور جن کا جواب دینے کیلئے ایک خاص درجے کی سوجھ اور آگہی اور ہوشمندی درکار ہے۔ یہ سیاسی سوجھ بھی ہے اور تحریکی زیرک پن بھی۔ یہ پیدا کر لینے کے بعد ہی اپنے لئے ہم ایک ایسا مناسب اور درست اور محفوظ طریق عمل تجویز کر سکتے ہیں جو اندریں حالات ہمارے

لئے ممکنہ طور پر بہترین نتائج برآمد کرنے کی ضمانت دے سکے۔

یہ بات ابتداً واضح ہو جانی چاہیے کہ ایک مناسب اور درست اور محفوظ طریق عمل تجویز کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہوگا کہ ہم اپنی ذات کو ہر قسم کی اذیت اور نقصان سے بچا لینے کی ضمانت حاصل کریں۔ ہم جو بھی کرلیں جاہلیت کسی صورت میں ہمیں اپنے حال پہ چھوڑنے پر تیار نہ ہوگی نہ وہ ہم سے اپنی دشمنی اور اذیت رسانی کو کبھی موقوف کرے گی۔ یہ بات پہلے سے ہم پر واضح ہونی چاہیے کہ جاہلیت **لا الٰہ الا اللّٰہ** کی دعوت دی جانا کبھی بھی برداشت نہ کرے گی۔ ہم صرف یہ کوشش کریں گے اور از حد خیال رکھیں گے کہ ہماری کسی غیر ذمہ دارانہ حرکت سے دعوت کا نقصان نہ ہو جائے۔

ایک مناسب اور درست اور محفوظ طریق عمل اپنانے سے ہمارا ہدف یہ نہیں ہوگا کہ ہم اقتدار تک پہنچیں یا اقتدار کا کچھ حصہ پائیں چاہے اس کیلئے ہمیں اپنے ان اصولوں اور ان قدروں Values کی قربانی ہی کرنی پڑے جو کہ ہمارے دین اور ہمارے عقیدہ کا حصہ ہیں، چاہے اصولوں اور قدروں کی یہ قربانی حالات اور زمانے کے ساتھ چلنے کی دلیل کے تحت ہو یا 'دعوت کا مفاد' کے نام سے!

یہ بات اول بھی اور آخر بھی ہم پر واضح رہنی چاہیے کہ ہر معاملے کی بابت خدا کی کچھ سنتیں ہیں جو نہ بدلتی ہیں نہ ٹلتی ہیں نہ کسی کا لحاظ کرتی ہیں اور نہ کسی کی رعایت۔ اور یہ کہ اگر ہم ان کو نظر انداز کریں گے یا یہ زعم رکھیں گے کہ ہم ان کو پھلانگ کر گزر سکتے ہیں تو ہم اپنے اس تحریکی عمل میں کسی بھی ہدف تک نہ پہنچیں گے۔

'بصیرت' کا ایک حصہ اکتسابِ علم پر موقوف ہے۔ علم اور تعلیم کا محتاج ہے۔ اس میں خدا کی سنتوں کا علم پانا شامل ہے جو کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں واضح کی گئی ہیں۔ اس میں تاریخ کا فہم اور تدبر شامل ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ سے اسباق اور نتائج کشید کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے...... اس میں امت کے حاضر اور ماضی کا مطالعہ شامل ہے۔ اس میں ان اسباب سے آگہی رکھنا ضروری ہے جس نے امت کو اس حال تک پہنچایا جو آج اس کو درپیش ہے...... اس میں اپنے زمانے سے واقفیت پانا شامل ہے۔ دشمنوں کی حالت سے آگاہ ہونا اور دشمن کے منصوبوں سے واقف ہونا اور ان طریقوں اور ہتھکنڈوں کو نگاہ میں کرنا جنہیں دشمن اسلام کے تحریکی عمل کے خاتمہ کیلئے اختیار کرتا ہے...... سب کچھ 'بصیرت' میں آتا ہے۔

'بصیرت' کا ایک حصہ تجربہ ومہارت سے عبارت ہے۔ اسلام کے تحریکی عمل میں ہونے والے تجربات سے آگاہی اور ان سے اسباق کشید کرنے کی صلاحیت پانا اور مختلف تحریکی اقدامات سے برآمد ہونے والے نتائج کا درک حاصل کرنا...... اسی میں آتا ہے۔

'بصیرت' کا ایک حصہ تربیت کے ذریعے وجود پاتا ہے۔

'بصیرت' کا ایک حصہ مشاورت اور تبادلۂ آراء سے تشکیل پاتا ہے۔ خصوصاً وہ مشاورت اور تبادلۂ آراء جو ایک قیادت اور اس کے رفقائے عمل کے مابین ہوتا ہے اور جس میں کہ معاملات کی جانچ پرکھ اور نقطہ ہائے نظر سننے اور بتانے اور رائے کے اندر پختگی لے کر آنے کی صلاحیت پیدا کی جاتی ہے۔ اس سے مراد ایسی مشاورت نہیں جو محض ایک خانہ پری کیلئے کر لی جاتی ہے اور 'مقربین' کی ایک محدود سی تعداد کے ساتھ کی جاتی ہے اور وہ بھی سمع اور طاعت کے دباؤ میں رکھ کر۔ جس میں کہ رائے دینے والوں کو پیشگی علم ہوتا ہے کہ 'زیادہ اعتراضات' کرنے کا کیا انجام ہوسکتا ہے اور یہ کہ قائد کا دل خوش کرتے نہ رہنے کی صورت میں اس کو اس شرف سے ہی ہاتھ دھونے پڑ سکتے ہیں کہ اس سے مشورہ طلب کیا جائے۔ 'اختلاف' اور 'اعتراض' کرنے والوں کیلئے تو جماعت کے اندر جگہ تک نہیں رہتی!

پس جب یہ چیز، جسے ہم نے بصیرت کا نام دیا ہے نہیں پائی جاتی یا جب یہ اپنی ناقص حالت میں پائی جاتی ہے تو ایک افراتفری اور ایک بے ہنگم انداز اضطراب کا پایا جانا یقینی ہوتا ہے جیسا کہ آج ہمارے اس دور کے تحریکی عمل میں ہو رہا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

یہ ہیں وہ بعض مواصفات جو معاشرے پر اثر انداز ہونے والی ایک ابتدائی جمعیت کے اندر لازماً پائے جانے چاہئیں۔ تو کیا اپنے تحریکی عمل میں ہم نے ان کا حصول یقینی بنالیا ہے؟

یہ بات ہمارے ذہنوں میں بے حد واضح ہوجانی چاہیے اور شروع ہی سے واضح رہنی چاہیے کہ ہمارے پیش نظر محض ایک ایسی جماعت کا قیام نہیں جس کو بس اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنا ہے۔ شعائرِ عبادت جیسے کیسے ہو ادا کرنے ہیں اور پھر دعوت کے کام میں جت جانا ہے...... بلاشبہ یہ ایک نیک عمل ہے اور اپنی جگہ قابل ستائش ہے۔ قیامت کے روز ان شاءاللہ اس پر آپ ماجور بھی ہوں

گے مگر یہ وہ کل کام نہیں جو اس امت کو، جس حال تک وہ پہنچ گئی ہے، وہاں سے نکال لائے۔ نہ ہی اس کا یہ وہ نقشہ ہے جو آج کی اس جاہلیت کو اپنا رخ موڑ لینے پر مجبور کر دے۔

جبکہ اسلام کے اس تحریکی عمل سے آج جو اس وقت مطلوب ہے وہ یہی ہے کہ یہ اس امت کو ایک بالکل نیا رخ دے دے اور فکری، ذہنی، شعوری اور سماجی اور تہذیبی طور پر یہ اپنی جس حالت کو پہنچ گئی ہے وہاں سے اس کو نکال لائے دوسری طرف یہ جاہلیت جو آج کے معاشروں کے اندر فکری، ذہنی، شعوری، روحانی اور سماجی و تہذیبی طور پر سر چڑھ کر بول رہی ہے اس جاہلیت کا رخ موڑ کر رکھ دے۔

یہ ہدف بہرحال پورا نہیں ہوگا جب تک کہ ایک بہت ہی خاص معیار کی جماعت تیار نہیں کر لی جاتی۔ جس کی ہیئتِ ترکیبی میں ان سب عناصر سے کام لیا گیا ہو جو اس جماعت کی تشکیل میں پیش نظر رکھے گئے تھے جو کہ مربی اعظم ﷺ کے ہاتھوں تیار ہوئی تھی۔ بے شک یہ اس معیار کی نہ ہو جس معیار کی وہ جماعت تھی اور نہ یہ ممکن ہی ہے کہ اس کے بعد کسی اور دور میں یا اسلام کی کسی اور نسل میں وہ معیار پیدا کر لیا جائے...... چنانچہ معیار بے شک وہ نہ ہو مگر ہیئت ترکیبی عین وہی ہونی چاہیے۔ مواد ممکنہ حد تک بہرحال وہی ہونا چاہیے جو وہاں استعمال ہوا تھا۔

اب اس بات کا تقاضا ہے کہ اسلام کو ایک ایسی بنیادی جمعیت کی فراہمی میں لگ جایا جائے جو معاشرے کی قیادت پر قدرت رکھے۔ اسی جمعیت کی تیاری اور تربیت پر تمام تر محنت صرف کر دی جائے۔ اس میں ممکنہ طور پر بہترین معیار لایا جائے۔ اس کو ناخالص اجزاء سے پاک کرنے اور اس کو زیادہ سے زیادہ خالص کرنے کے سب ممکنہ طریقے اختیار کئے جائیں۔ پھر اس کے ذریعے سے عوام پر اثر انداز ہوا جائے۔

رہا یہ کہ اس تربیت کیلئے کیا ذرائع اختیار کئے جائیں گے تو ہمیں بھی وہی ذرائع اختیار کرنا ہوں گے جو مربی اعظم ﷺ نے اپنے اصحاب کی تربیت اور تیاری میں اختیار فرمائے تھے: یعنی اللہ اور آخرت پر ایمان کو گہرا کرنا۔ اللہ سے تعلق پختہ کرنا، یہاں تک کہ ذہن کا محور 'خدا' ہو جائے۔ نفوس کو زیادہ سے زیادہ خدا کے ساتھ رہنے کا عادی کر دینا۔ 'عمل' کو 'ایمان' سے برآمد کرنا۔ رویہ اور طرز عمل کو ایمان کا بے ساختہ نتیجہ بنانا اور ایمانی طرز عمل کو زندگی کے اندر اپنا رکھنے کی مشق ہونا...... پھر اس کے بعد سوجھ اور آگہی اور ہوشمندی کی ذہنیت کو ترقی دینا۔ اس ذہنیت کو پروان چڑھانے کیلئے اپنے دور کے اندر پائے جانے

والے سب ممکنہ وسائل کو بروئے کار لانا...... جبکہ اس سارے عمل کے دوران اس بات کو ہر وقت پیش نظر رکھنا کہ تربیت کے اس عمل میں سب سے اہم اور سب سے موثر ذریعہ یہ ہوگا کہ آدمی خود نمونہ بن کر دکھائے۔ پھر اس کے بعد تعلیم، تذکیر، پند و نصیحت، وعظ سب کچھ آتا ہے۔ جس کے ساتھ ساتھ ایک ایک آدمی پر محنت، ایک ایک آدمی کی نگہداشت، تصحیح اور پھر ایک طویل صبر...... مسلسل محنت، یہاں تک کہ نفوس اس چیز کو قبول کر لیں...... یہاں تک کہ نفوس پھر اس کے عادی ہو جائیں...... یہاں تک کہ یہ ایک راستہ بن جائے اور پختہ ہو جائے۔

یہ کام وقت لے گا۔ ایک بے انتہا مشقت طلب کام ہے۔ بہت محنت چاہتا ہے۔ صبر آزما ہے۔ اس کو ایک خاص سطح اور ایک خاص حجم تک پہنچنا ہے۔ یہ ایک ہی دن میں آپ کو اپنے ثمرات نہ دے دے گا۔ اس میں جلد بازی کی گنجائش نہیں۔ اس کے مرحلوں کو پھلانگ کر گزرنا ممکن نہیں۔ یہ اس صورت میں اگر ہم ایک ایسے عظیم الشان مشن کو سرے لگانے میں واقعی سنجیدہ ہیں جو ایک طرف اس امت کی حالت کو بدل رکھ دے اور اس کو، جس حالت میں یہ گرفتار ہے، اس سے نجات دلائے اور دوسری طرف یہ جاہلیت کو، جہاں تک کہ اس کی پہنچ ہو چکی ہے، پلٹ جانے پر مجبور کر دے اور اس کا رخ موڑ کر رکھ دے۔

☆☆☆☆☆☆☆

# توسیعِ جمعیت

دعوتی عمل کے ان مراحل میں سے ایک مرحلہ پھر 'توسیعِ جمعیت' بھی ہے، جس میں کہ دعوت کا رخ 'عوام' کی طرف پھیر دیا جاتا ہے۔

جہاں تک اسلام کی اولین جماعت کی زندگی میں اس مرحلہ کا تعلق ہے (ہماری مراد رسول اللہ ﷺ کی جماعت سے ہے) تو یہ ہمیں اہل مدینہ اور اس کے گردونواح کے اعراب کے ایک بڑی تعداد میں داخل اسلام ہونے کے واقعے میں نظر آتا ہے۔ جبکہ اس سے پہلے اس اصل جمعیت کی تشکیل کر لی گئی تھی جو کہ خواص مہاجرین اور انصار سے مل کر بنی تھی۔ یہ 'مابعد توسیع' کا عنصر ہے جس کی بابت قرآن مجید کی اس آیت کا اشارہ ہے:

| | |
|---|---|
| مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ الْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا عَن رَّسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِ (التوبة: ١٢٠) | مدینہ کے باشندوں اور گردونواح کے دیہاتیوں کو یہ ہرگز زیبا نہ تھا کہ رسول اللہ کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہیں اور نہ یہ کہ اپنی جان کو ان کی جان سے عزیز سمجھیں |

چنانچہ یہ لوگ سپاہی اور رضا کار تھے۔ دعوت سے متاثر ہو کر اس میں شامل ہوئے تھے۔ دلوں میں خلوص تھا۔ دشمن سے اس دعوت کے تحفظ کیلئے آگے بڑھے تھے اور اس کی کامیابی کیلئے سنجیدگی سے کوشاں تھے۔ یہ کوئی 'عوام کا بے قابو مجمع' ہرگز نہ تھا۔ یہ کوئی معاشرہ کا وہ طبقہ نہ تھا جسے آج کی جاہلیت 'سڑکوں پہ نکل آنے والی خلقت' کے حوالے سے جانتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کی جاہلیت معاشرے کی ایک بڑی تعداد کو اس حوالے سے جاننے میں واقعتاً حق بجانب ہے۔ 'سڑکوں پہ نکل آنے والی خلقت' وہ خلقت ہے جس کی نہ اپنی کوئی شخصیت ہوتی ہے نہ اپنی سوچ اور نہ خود اپنا کوئی موقف۔ نہ ہی اس کی کوئی اپنی فکری روش ہوتی ہے جس میں استقلال اور استقرار پایا جائے۔ یہ وہ 'ردعمل' کی پیداوار 'عوامی رؤ' میں

بہنے والی خلقت ہوتی ہے جس کو کہ حدیث میں إمّعة کہا گیا ہے۔آپ ؐ نے فرمایا: لا تکونوا إمعة، تقولوا: إن أحسن الناس أحسنا، وإن أساؤوا أسأنا. ولكن وطنوا أنفسكم ان أحسن الناس أو أساؤا ألا تظالموا (رواہ الترمذی) ''امّعہ (بے شخصیت) نہ بنو کہ کہنے لگو لوگ بھلائی کریں تو ہم بھی بھلے آدمی ہوں گے۔لوگ بُرائی کرنے پر آئیں تو ہم بھی بُرا بن کر دکھائیں گے۔ بلکہ (ہونا یہ چاہیے) کہ لوگ بھلے ہوں یا بُرے تم اپنا نفس مار کر باہم ظلم وزیادتی سے دستکش ہی رہو'' چنانچہ یہ وہ 'خلقت' ہوتی ہے جو ذرائع ابلاغ کی پیداوار ہوتی ہے۔ ذرائع ابلاغ پہلے اس کو بناتے ہیں۔ پھر اس 'رائے عامہ' سے رجوع کرتے ہیں اور اس کا 'موقف' جاننے کیلئے سروے کرتے ہیں جو کہ عین وہی ہوتا ہے جو کہ خود اسی نے اپنے ہاتھوں بنایا ہوتا ہے!

چنانچہ یہ وہ لوگ نہ تھے جن کے بل پر اسلام کی اس اولین جمعیت کی توسیع ہوئی تھی۔ اس دعوت کے کسی بھی مرحلہ میں ایسے لوگ نہیں تھے۔ یہ مخلص رضا کار تھے جن کے ذریعے یہ توسیع ہوئی تھی۔ یہ اپنا آپ اس دعوت کیلئے وقف کر رہے تھے اور اس کو ایک باقاعدہ پروگرام اور زندگی کی ایک باقاعدہ روش کے طور پر اپنا کر اس دعوت کے خدمت گار اور مددگار بنتے تھے۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ: اس 'توسیع شدہ جمعیت' اور اس 'اولین جمعیت' میں پھر کیا فرق ہوا جسے ہم نے پیچھے 'مضبوط ایمانی جتھا' کے نام سے ذکر کیا؟ مختصراً ہم یہ کہیں گے کہ وہ 'اولین جمعیت' اس لئے تھی کہ اس عمارت میں بنیادوں اور ستونوں کا کام دے۔ ایک طرح سے یہ 'قیادت' تھی۔ یہ قیادت کی ایک پوری کھیپ تھی۔ ایک ایسی مضبوط قیادت جو پیچھے لگنے والوں کا خود بخود ایک رخ بنا دیتی تھی۔ اور انہی پہلے والی بنیادوں پر بعد میں آ ملنے والوں کی تربیت کر سکتی تھی۔ رہی یہ 'توسیع شدہ جمعیت' تو یہ وہ لوگ تھے جو اس اولین جمعیت کی صدا پر لبیک کہہ چکے تھے، ان کی دعوت کا پابند ہونا قبول کر چکے تھے اور اسی کے عَلَم کے نیچے آ جانا اور اسی کے وجود میں اپنا وجود گم کر دینا قبول کر چکے تھے اور اسی کے ساتھ اور اسی کے دیے ہوئے رخ پر چلنے پہ آمادہ تھے۔ نہ کہ محض تماشائی جو معاشرے کی رو میں بہنے والے ہوں اور بس اس بات میں دلچسپی رکھتے ہوں کہ دیکھیں یہاں جیت کس کی ہونے والی ہے۔

ایک بار پھر، یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ 'تربیت کے منہج' کے لحاظ سے یہاں کیا فرق ہے؟ وہ محنت جو 'اولین جمعیت' کی تیاری پہ کی جاتا ہے اور وہ محنت جو 'توسیعِ جمعیت' کی صورت اس دوسرے مرحلہ میں کی جاتا ہے، ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ مختصراً اُس کے جواب میں ہم کہیں گے: یہ فرق درجہ کا ہے نہ کہ نوع کا۔ ایک معلم جب تعلیم دیتا ہے تو 'بطورِ تعلیم' وہ اپنے طالبعلموں کو ایک ہی چیز دیتا ہے۔ علم وہی علم ہے۔ البتہ کچھ خاص ہونہار شاگردوں کو وہ اس علم کے ایک خاص درجہ پر لے جاتا ہے اور ان کو ایک خاص درجہ کی توجہ دیتا ہے کیونکہ انکی استعداد دوسروں کی نسبت کہیں زیادہ اور ان سے اس کا تقاضا دوسرے طالب علموں کی بہ نسبت کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ استاد ان سے اس درجہ کی کارکردگی قبول نہیں کرتا جسے وہ کچھ ایسے شاگردوں سے قبول کر لیتا ہے جن کی استعداد اس سے بڑھ کر اجازت نہیں دیتی۔ اگرچہ اپنی اہلیت کے بقدر پاس ہونا ہر کسی سے مطلوب رہتا ہے۔

کوئی اگر یہ پوچھنا چاہے کہ کیا ان دونوں میں کوئی فیصلہ کن انداز کی حدِ فاصل ہے؟ اور یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ 'توسیع شدہ جمعیت' میں کچھ ایسے لوگ پائے جائیں جو قیادت اور رخ دینے کی استعداد رکھتے ہوں جبکہ 'اولین جمعیت' میں کچھ ایسے لوگ بھی پائے جائیں جن کی ہمت یا استعداد اس درجہ تک پہنچنے میں ناکافی ثابت ہو جائے؟ تو ہم کہیں گے کہ واقعتاً ایسا ممکن ہے اور اس صورت میں حق بنتا ہے کہ ایک بااستعداد آدمی اس صف میں شامل ہو جو دعوت اور تربیت کے عمل کو ایک رخ اور ایک جہت دیتی ہے اور یہ کہ جس آدمی کی اہلیت یا استعداد کسی وقت جواب دے جائے وہ اسی کے بقدر پیچھے آجائے، جس کا کہ صحیح تعین کرنا انہی لوگوں کا کام اور اجتہاد ہوگا جو اس امر کے مسؤول ہوں، اگرچہ انکا اجتہاد کسی وقت درست بھی ہوسکتا ہے اور کسی وقت غلط بھی...... البتہ ہماری یہ گفتگو عمومی طور پر اس حوالہ سے ہے کہ دعوت کیلئے کھڑی کی جانے والی 'بنیادی جمعیت' اصولاً ایک خاص درجہ کی محنت چاہتی ہے اور اس کی تیاری پر ایک بہت ہی خاص انداز کی توجہ مرکوز کر دی جانا لازم ہوتی ہے۔ دیوار کے اندر بنیادی ستون اٹھانا بہر حال ایک مختلف اور خاص نوعیت کا کام ہے بہ نسبت دیوار کے باقی ماندہ حصہ کے، اگرچہ 'اینٹ' کا استعمال دیوار کے دونوں حصوں میں کیوں نہ ہوتا ہو۔ یہ بات ہر قسم کی 'دیوار' اٹھانے کے معاملہ میں ہی سچ آتی ہے اور یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔

معاملہ صرف اتنا ہے کہ یہاں ہم ایک امر پر توجہ مرکوز کرا دینا چاہتے ہیں اور وہ واقعتاً اس قدر اہم ہے کہ اس پر تمام تر توجہ مرکوز ہو جائے اور وہ یہ کہ نئے مددگاروں کو صلائے عام دینا اور ان کے بل پر توسیعِ جمعیت کا عمل سرانجام دینا ایک بنیادی جمعیت کو وجود میں لے آنے کے بعد ہی ہونا چاہیے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ تعلیم پانے والوں سے پہلے تعلیم دینے والوں کا پایا جانا یقینی بنایا جائے۔ 'رخ دینے' والے پہلے ہونے چاہئیں اور پھر لوگوں کو کہا جائے کہ وہ 'رخ لینے' کیلئے آگے بڑھیں۔ البتہ اگر اس سے پہلے ہی ہم صلائے عام دے دیں اور لوگ ہماری آواز پہ لبیک کہتے ہوئے آ جائیں، جبکہ وہ کھیپ موجود ہی نہ ہو جو ان کو عین وہ رخ دے دے جس کا کہ اسلام اس وقت اور زمانے میں تقاضا کرتا ہے تو لوگوں کا لبیک کہہ لینا اس کھیپ کے بغیر کس کام کا؟

دوسری بات جس پر ہم توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں یہ کہ: قدرتی طور پر وہ ذریعہ جو 'توسیعِ جمعیت' کے عمل میں ___ جب بھی اس کا وقت آئے ___ اختیار کیا جائے گا وہ ذریعہ ہے دعوتِ عام جو کہ سب لوگوں کو دی جائے گی۔ یعنی معاشرہ کا وہ طبقہ جسے آج کی اصطلاح میں 'عوام' کہا جاتا ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ دعوت پہ لبیک کہنے کے معاملہ میں عوام سب کے سب ایک ہی درجہ پر نہ ہوں گے۔ 'عوام' میں ایسے بھی ہوں گے کہ جن کو جب دعوت صاف شفاف اور اجلے نکھرے انداز میں دے دی جائے تو وہ ایمانِ صادق کے ساتھ اس کی جانب بڑھیں گے اور دعوت کی کامیابی کی راہ میں جانباز سپاہی بن کر آئیں گے اور اپنے اس عمل سے محض اور محض خدا کی خوشنودی کے ہی خواستگار ہوں گے...... 'عوام' میں ایسے بھی ہوں گے جو دعوت کی جانب آئیں گے مگر 'نفع نقصان' کا خیال رکھتے ہوئے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ دعوت میں شامل ہونے کے کیا فوائد ہیں اور اس کے کیا کیا 'نقصانات' ہو سکتے ہیں...... 'عوام' میں ایسے بھی ہوں گے جن کو سوائے اس بات کے کسی امر سے غرض نہ ہو کہ 'غلبہ' کون پاتا ہے۔ یہ فریق ہر قسم کی کشمکش سے دستکش رہے گا نہ اِس جانب اپنا وزن ڈالے گا اور نہ اُس جانب۔ یہ 'تیل دیکھو اور تیل کی دھار' پہ یقین رکھنے والا گروہ جو بسا اوقات 'خبروں' سے 'محظوظ' ہونا اور بے پروائی سے تبصرے کرنا تک روا جانتا ہے یہاں تک کہ معاملہ آخر کار پھر کسی کروٹ بیٹھ جائے تو تب جا کر ان کی 'طرف داری' کے ظہور میں آنے کا وقت آتا ہے جس کے پیچھے کوئی ایسا عامل کارفرما نہیں ہوتا کہ یہ کسی بات کی تائید و نصرت اس کے اصولوں

کی حقانیت کو دیکھ کر اور اس کی جانب ایک قوی اندرونی میلان کے باعث کرتے ہوں۔ یہ وہ فریق ہے جو حالات کی زبان پڑھنا اور سننا جانتا ہے اور نفسیاتی طور پر صرف یہ بات قبول کرنے پر ہی تیار ہوتا ہے کہ 'حالات' کیا کہتے ہیں۔ جو چیز ابھی وجود میں نہیں آئی اور جس کے وجود میں آنے کیلئے ڈھیروں وقت اور محنت درکار ہو وہ ان کیلئے قابل توجہ نہیں ہو سکتی قطع نظر اس کے کہ وہ کتنا صحیح ہے اور کتنا غلط۔ البتہ وہ چیز جو بالفعل پائی جاتی ہے اور جو کہ حالات کا رخ ہے وہ خود بخود ان لوگوں کو اپنے ساتھ چلاتی ہے جبکہ یہ فریق کسی تبدیلی کیلئے محنت کرنے کا روادار ہی نہیں خاص طور پر اس وقت جب ایسی کوئی محنت آدمی کیلئے خطرات کا پیش خیمہ بھی ہو...... چنانچہ معاشرے کا یہ فریق دعوت کا ساتھ دینے پر اس وقت تک تیار نہ ہوگا جب تک کہ دعوت کو لبیک کہنا 'حالات کا تقاضا' نہ بنا دیا جائے اور جس کا ساتھ دینا کوئی خاص 'محنت طلب' کام نہ رہے اور نہ ہی اس راستے میں آدمی کو خطرات نظر آ رہے ہوں۔

یہ تینوں قسم کے فریق ہر معاشرے میں ہی پائے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں کے تینوں خود رسول اللہ ﷺ کے معاشرہ میں بھی پائے جاتے تھے:

پہلا فریق __ رسول اللہ ﷺ کے دورِ مدنی میں __ وہ طبقہ بنتا ہے جو دعوت پر ایمانِ صادق لے کر آیا تھا اور جانفروشی کے ساتھ اس دعوت کی کامیابی کیلئے اپنے آپ کو پیش کر رہا تھا۔ معاشرہ کا یہ طبقہ ہدایت لینے اور اتباع و اقتدا کرنے میں پوری سنجیدگی کے ساتھ مہاجرین وانصار کی قیادت قبول کر چکا تھا۔ یہ معاشرہ کا وہ طبقہ ہے جن کا ذکر 'پیچھے آنے والوں' کے حوالہ سے آیت (التوبہ: ۱۰۰) میں ملتا ہے:

> *"وہ مہاجر وانصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں راستبازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ نے ان کیلئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی عظیم الشان کامیابی ہے"*

اسی طبقہ میں 'اعراب' کا وہ فریق بھی آتا ہے جو صدق دل سے ایمان لایا تھا اور ایمانی رجحانات کو سنجیدگی سے قبول کر چکا تھا۔ اسی کی جانب اس سے اگلی آیت میں اشارہ ملتا ہے:

*"انہی اعراب میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں تقرب کا اور رسولؐ کی طرف سے رحمت کی دُعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں وہ ضرور ان کیلئے تقرب کا ذریعہ ہے اور اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"*

دوسرا فریق وہ نظر آتا ہے جن کی رسول اللہ ﷺ تالیفِ قلب فرمایا کرتے تھے اور ان کو کچھ دے دلا کر اور تعلقات اور سماجی بندھنوں کو کام میں لا کر ان کو ایمانی دھارے کے ساتھ چلا لیتے تھے۔ مصارفِ زکات کے حوالے سے اسی طبقہ کی طرف اس آیت کا اشارہ ملتا ہے: **انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیها والمؤلفة قلوبهم** (التوبۃ:٦٠) *"یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کیلئے ہیں اور ان لوگوں کیلئے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں، اور ان کیلئے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو"*۔

جبکہ تیسرا فریق (ایک بڑی سطح پر) ہمیں وہ نظر آتا ہے جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوتا ہے۔ فتح کی صورت میں جب یہ معاملہ اپنی آخری کروٹ بیٹھ جاتا ہے اور 'حالات' کا فیصلہ اسلام کے حق میں ہو جاتا ہے تو یہ فریق اسلام میں آ جاتا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ کا صاف صاف حق پر ہونا یہ تمام تر عرصہ ان پر واضح ہی تھا۔ مگر اس وقت جیسا کہ قرآن نے ان کی اپنی زبانی بات کی ان کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ **وقالوا ان نتبع الهدى معك نتخطف من أرضنا** (القصص:٥٧) *"کہنے لگے اگر ہم آپؐ کے ساتھ ہو کر ہدایت کے متبع ہو جائیں تو اپنے ملک سے اچک لئے جائیں گے"* ) مگر اب جب خود یہ 'ہدایت' ہی ملک میں تمکین پا چکی تھی تو یہ اس کی اتباع پر تیار ہو گئے اور خدا کے دین میں فوج درفوج داخل ہونے لگے۔ جیسا کہ سورۃ النصر میں آتا ہے **اذا جاء نصر الله والفتح ورأيت الناس يدخلون في دين الله أفواجا فسبح بحمد ربك واستغفره انه كان توابا** *"جب اللہ کی مدد آ جائے اور فتح نصیب ہو جائے اور (اے نبیؐ) تم دیکھ لو کہ لوگ فوج درفوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت کی دُعا مانگو، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے"*۔

ابھی منافقین کا طبقہ الگ ہے جو کہ مسلم معاشرے کے ان تینوں فریق میں شمار نہیں ہوتا اور جو کہ معاشرہ کے اندر اسلام کا اقتدار قائم ہو جانے کے بعد نمودار ہوا کرتا ہے اور جو کہ اسلام کا اقتدار مستحکم ہو جانے سے ماقبل مرحلہ کو تماشائی بن کر گزارتے ہیں اور اسلام کی مضبوطی کے خلاف دل میں جلتے ہیں اور جو کہ اسلام کو قبول کرنے کے دعویٰ میں ہی جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں یا وہ لوگ جو اتنی ہمت اور جرات نہیں پاتے کہ منہ پر انکار کر دیں اور یوں وہ اپنے کفر کو دلوں میں چھپا کر رکھنا ہی اپنے لئے مناسب تدبیر جانتے ہیں۔

اب اگر یہ درست ہے کہ ہر معاشرہ کے اندر ہی یہ سب طبقے پائے جاتے ہیں تو پھر 'توسیعِ جمعیت' کے مرحلہ میں (دعوت کو عوام میں لے آنے کے مرحلہ میں) یہ سوال اہم ہو جاتا ہے کہ دعوت کا رخ سب سے پہلے معاشرہ کے کس طبقہ کی طرف کیا جائے؟ نظری طور پر theoratically ہم دعوت کا رخ سبھی لوگوں کی ہی جانب رکھیں گے مگر درحقیقت دعوت پہ لبیک کہے جانے کی توقع ہم لوگوں کے ایک خاص طبقہ سے ہی کریں گے۔ سو عملاً دعوت کا رخ اسی طبقہ کی جانب مرکوز ہو جائے گا۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس دعوت کو قوت اور تمکنت 'عوام' کے ایک خاص طبقہ کے ہاتھوں ہی ملے گی لہٰذا عملاً دعوت زیادہ اسی طبقہ پر ہی مرکوز ہو جائیگی۔

چنانچہ اگر ہم اسلام کی اولین جماعت (رسول اللہ ﷺ کی تیار کردہ جماعت) کے عملی مراحل کا جائزہ لیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ جب سے ("فاصدع بما تؤمر" کی صورت) رسول اللہ ﷺ کو کھل کھلا کر اعلانِ توحید کا حکم دیا گیا تب سے دعوت کا رخ گو عرب کے تمام تر لوگوں کی طرف رہا مگر ہجرت کے بعد کا مرحلہ دیکھیں تو دعوتی عمل زیادہ تر اہل مدینہ پر ہی مرکوز کر دیا جاتا ہے جو کہ وہ فریق تھا جو دعوت کے قبول کرنے میں ___ معاشرتی سطح پر ___ سب سے آگے تھا اور جو کہ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے خاص تربیت یافتہ مہاجرین وانصار سے تربیت لینے اور ان کے پیچھے کھڑا ہونے پر تیار ہو چکا تھا۔ یہ اہل مدینہ جو رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ مہاجرین وانصار کی سرکردگی میں چلنے پر آمادہ تھے اور جہاد اور صبر وثبات کے قدم قدم پر ثبوت دے رہے تھے...... یہی معاشرہ کا وہ اہم ترین طبقہ تھا جو پھر دعوت میں مابعد کے مراحل کیلئے ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گیا۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دیگر دونوں طبقوں پر توجہ مرکوز

کی جانے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ دعوتی عمل کی یہی ایک منطقی ترتیب بنتی ہے اور یہی بات حق وباطل کے اس معرکہ اور اس کشمکش کے مزاج کے عین مطابق نظر آتی ہے۔

حق اور باطل کے مابین کشمکش تو ہر دور میں ہو کر رہنی ہے۔ یہ خدا کی سنت ہے۔ یہ کشمکش عین اسی لمحے کھڑی ہو جائے گی جب حق کو کسی جگہ پر کچھ مرد صفت لوگ مل جائیں گے جو اس پر دل وجان سے ایمان لے آنے اور اس کو لے کر معاشرے میں آگے بڑھنے اور زمین میں اس کو تمکین دلانے کا مشن اپنا لیں۔ ہو نہیں سکتا کہ جاہلیت ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی رہے۔ ہو نہیں سکتا کہ جاہلیت اس دعوت کو اپنے حال پر چھوڑ دے۔ بے شک دعوت اس کے ساتھ ہرگز بھی کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔

*"اور اگر تم میں سے کچھ لوگ اس (دعوت) پر، جس کو دے کر مجھ کو بھیجا گیا، ایمان لے آتے ہیں اور کچھ ایمان نہیں لاتے ہیں تو ذرا ٹھہر جاؤ! یہاں تک کہ ہمارے درمیان اللہ فیصلہ کر دے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔ اس کی قوم کے متکبر سرداروں نے کہا کہ اے شعیب، ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال کر رہیں گے۔ ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا"* (الاعراف: ۸۷-۸۸)

صاف صاف! متارکۂ جنگ کا کوئی سوال ہی نہیں۔ دو فریق اپنے اپنے حال پر رہیں تا آنکہ خدا ان کے مابین کوئی فیصلہ کر دے اور تب تک جاہلیت 'صبر' سے کام لئے رہے...... جیسا کہ شعیبؑ کے مطالبہ سے ظاہر ہوتا ہے، اس بات کا کوئی امکان نہیں۔ جبر اور زبردستی جاہلیت کو کرنی ہی ہے۔ اہل ایمان کو نکال کر رہنا ہے۔ ان کے پیچھے تک آنا ہے۔ جہاں تک ہو سکے ایذا دینی ہے۔ یہ اس کشمکش کا مزاج ہے۔

اب ایسے میں کون ہے جو دعوت کے ان ابتدائی مراحل میں دعوت کے ساتھ ہو لے؟ کیا وہ لوگ جو زمینی معیاروں کے مطابق 'نفع اور نقصان' کا حساب کرنے کے بعد کسی کام کو ہاتھ ڈالنے کے روادار ہوا کرتے ہیں؟ کیا وہ لوگ جو حالات کی زبان پڑھنا جانتے ہیں اور جس سمت کی فضا ہو اسی سمت کو چل پڑنا مناسب خیال کرتے ہیں قطع نظر اس امر کے تعین کے کہ اس سمت کو چلنا کس قدر غلط اور ناروا ہے؟ کیا وہ لوگ جو ایک بات کے صحیح اور حق ہونے کے باوجود محض اس لئے اس سے کنارہ کش رہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کو وجود میں لانے کیلئے ڈھیروں محنت اور قربانی کی ضرورت ہے اور خطرات کو مول لینا اس پر مستزاد؟

طبعی امر ہے کہ دعوت کی جانب ان ابتدائی مراحل میں وہی لوگ آگے بڑھیں گے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہوں...... جو 'نفع اور نقصان' کو خدا کی میزان میں اور آخرت کے ترازو سے تول سکتے ہوں نہ کہ ان تکڑیوں سے جو جاہلیت کے ہاں چلتی ہیں اور جن کے سوا جاہلیت کسی پیمانہ سے واقف نہیں۔

| | |
|---|---|
| لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید:۲۵) | ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں |

یہاں اشیاء کو ان پیمانوں سے ماپنے والے لوگ چاہئیں جو دُنیا کی متاع کو اس کے اپنے حجم میں دکھائیں اور آخرت کی سرخروئی کو اس کے اصل رنگ میں:

| | |
|---|---|
| قُلْ مَتَاعُ الدَّنْيَا قَلِيلٌ وَالآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَى وَلاَ تُظْلَمُونَ فَتِيلا (النساء: ۷۷) | "ان سے کہو، دُنیا کا سرمایۂ زندگی تھوڑا ہے اور آخرت ایک خدا ترس انسان کیلئے زیادہ بہتر ہے اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہ کیا جائے گا"۔ |

وہ پیمانے جن میں زمین کے تمام تر فائدے، تمام تر مفادات اور تمام تر رشتے خدا اور رسول ﷺ اور جہاد کی محبت کے آگے بے وقعت ہو جایا کریں:

| | |
|---|---|
| قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُواْ حَتَّى يَأْتِيَ اللّهُ بِأَمْرِهِ وَاللّهُ لاَ يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ (التوبہ:٢٤) | اے نبی، کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے، اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اُس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے، اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا |

وہ میزان جن میں باقیات صالحات، حیات فانی کی تمام تر زینت پر فوقیت پا جائیں:

الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَاباً وَخَيْرٌ أَمَلاً (الكهف: ٤٦)

مال اور اولاد تو دنیا ہی کی زینت ہے اور (ہاں) البتہ باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے نزدیک از روئے ثواب اور از روئے امید مندی بہت بہتر ہیں

وہ میزان جو یہ بتائے کہ نفع بخش تجارت جو کہ آدمی کو خدا کے عذاب سے بچانے والی ہے وہ اللہ اور رسول پر ایمان ہے اور جہاد فی سبیل اللہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ وَأُخْرَى تُحِبُّونَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ (الصّف:۱۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمہیں عذاب الیم سے بچا دے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر، اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جان لو۔ اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا، اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمہیں عطا فرمائے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔ اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو وہ بھی تمہیں دے گا، اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہونے والی فتح۔ اے نبیؐ، اہل ایمان کو اس کی بشارت دو

چنانچہ دعوت کے ابتدائی مراحل دراصل محنت اور قربانی سے ہی عبارت ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ لوگ جو زمینی فوائد کی زبان جانتے ہیں چاہے وہ دولت و آسائش ہو، یا شخصیت کی نمائش یا پیروکاروں کے جمگھٹے دیکھنے کی آرزو...... ایسے لوگ خالص اسلام کی دعوت کے ان ابتدائی مرحلوں میں کسی کام کے نہیں۔ خواہ یہ 'اولین جمعیت' کی تیاری کا مرحلہ ہو یا حتی کہ 'توسیع جمعیت' کا مرحلہ۔

☆☆☆☆☆☆☆

اپنے حالات اور زمانے پر نگاہ ڈالیں تو کچھ امور ہمارے ذہن میں حد درجہ واضح رہنا چاہئیں چاہے وہ 'بنیادی جمعیت' کی تیاری کے حوالے سے ہو، یا 'توسیع جمعیت' کے حوالے سے یا حتی کہ

معاشرے کے اس بہت بڑے طبقے کے حوالے سے بھی کیوں نہ ہو جو کہ اس کشمکش کے آخری مراحل میں ___ فوج در فوج ___ دعوت کے ساتھ آ ملتا ہے۔ چنانچہ معاشرہ کا یہ وسیع طبقہ یا عمومی طبقہ تک بھی اس بات کے بغیر نہیں چھوڑا جائے گا کہ ان کا اسلام باقاعدہ طور پر درست کرایا جائے۔ معاشرہ کے اس طبقہ تک کو باقاعدہ طور پر تبدیل ہوئے بغیر نہ رہنے دیا جائے گا اور ان کو بھی تربیت کے ایک خاص درجہ پر پہنچائے بغیر اطمینان نہ کیا جائے گا۔ معاشرہ کے اس طبقہ کے ساتھ بھی وہ معاملہ نہ کیا جائے گا جو جاہلیت 'عوام الناس' کے ساتھ کرتی ہے۔ نہ ان کی کوئی اپنی شخصیت رہنے دیتی ہے اور نہ ان کی کوئی اپنی سوچ اور اپنی رائے۔ یہ میڈیا کی پھونک سے چلنے والی خلقت جانی جاتی ہے جبکہ دوسری طرف جاہلیت اس 'خلقت' کو یہ بھی باور کرائے رکھتی ہے کہ سلطنت کا سارا نظام بس اسی کے اوپر مستوی ہے اور اسی کے آراء اور اسی کے ووٹوں پر قائم!

اسلام میں اس انداز کی 'خلقت' ہرگز نہ پائی جائے گی۔ نہ کوئی مرد نہ کوئی عورت۔ معاشرہ کا ہر شخص ___ کم از کم حد تک ___ اسلام کی حقیقت کو جانتا اور سمجھتا ہوگا اور کم از کم حد تک اسلام کا پابند بھی ہوگا۔ اس بات کو یقینی بنانا ایک اسلامی مملکت میں اولی الامر کی ایک باقاعدہ ذمہ داری ہوگی۔ معاشرہ میں جو شخص آپ اپنی چاہت سے خدا کے تقاضوں کا پابند ہوگا وہ خدا کے ساتھ اپنا معاملہ آپ ہی درست رکھے گا۔ البتہ اگر کوئی شخص اسلام کے تقاضوں کا ___ کم از کم حد تک ___ پابند نہیں ہوتا تو اس پر عثمانؓ کا یہ قول لاگو ہوگا:

**یزع اللہ بالسلطان مالا یزع بالقرآن**

*"اللہ تعالیٰ جس چیز کو قرآن کے ذریعہ زیرنگین نہیں لاتا (مسلم) اقتدار کے ذریعہ اس کو بھی زیرنگین لے آتا ہے"۔*

بنابریں سب کے سب لوگ اور پورے کا پورا معاشرہ ہی دعوت کی زد میں لایا جائے گا۔ ہاں البتہ یہ کام مرحلہ بہ مرحلہ ہوگا، جیسا کہ اولین مسلم جماعت کی تاریخ میں ہوا۔ اس عمل میں وہ سب خدائی سنتیں پیش نظر رکھی جائیں گی جو ___ جب بھی ان کے حالات اور اسباب پیدا کئے جائیں ___ ہر بار اپنا اعادہ کراتی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

آج اگر ہم اپنے گرد وپیش پہ نگاہ ڈالیں تو الا ماشاء اللہ اُمت کو ہم 'خس وخاشاک' کی اسی حالت میں پاتے ہیں جو کہ چودہ صدیاں پیشتر رسول اللہ ﷺ بیان فرما گئے ہیں:

"یوشك أن تداعی علیكم الأمم كما تداعی الأكلة علی قصعتها" قالوا: أمن قلة نحن یومئذٍ یا رسول اللہ؟ قال: "بل اَنتم یومئذٍ كثیر، ولكنكم غثاء كغثاء السیل، ولینزعن اللہ المهابة من صدور أعدائكم، ولیقذفن فی قلوبكم الوهن" قالوا: وما الوهن یا رسول اللہ؟ قال: "حب الدنیا و كراهیة الموت" (أخرجه أحمد و أبوداود)

قریب ہے کہ دُنیا کی قومیں تم پر یوں ٹوٹ پڑیں جیسے بھوکے کھانے کے تھال پر ٹوٹ پڑتے ہیں" صحابہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول کیا اس لئے کہ تب ہم بہت تھوڑے ہوں گے؟ فرمایا "نہیں نہیں! اس روز تعداد میں تو تم بہت زیادہ ہو گے۔ مگر تم خس وخاشاک ہوگے جیسے خس وخاشاک سیلاب (کی سطح) پر ہوا کرتے ہیں۔ خدا تمہارے دشمنوں کے سینوں سے تمہاری ہیبت ختم کردے گا اور تمہارے دلوں میں وَھَن (کمزوری) ڈال دے گا صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول یہ وَھَن کیا ہوگا؟ فرمایا: "دُنیا پہ ریجھ جانا اور موت سے جی چرانا

اب یہ اُمت جس کو اس دعوت کا مخاطب بنایا جانا ہے، چاہے وہ بنیادی جمعیت کی تیاری کے معاملہ میں ہو، چاہے توسیع جمعیت کے معاملہ میں، یا پھر عوام الناس کو ساتھ چلانے کے معاملہ میں...... یہ اُمت جس کو اس دعوت کا مخاطب بنایا جانا ہے اگر اس حال کو پہنچ چکی ہے جو اس حدیث میں بیان ہوئی تو پھر ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم ان محرکات کا جائزہ لیں جو اُمت کے اس نوبت کو جا پہنچنے کا سبب بنے ہیں، تاکہ ہم کوئی مناسب علاج تجویز کرنے کی پوزیشن میں ہوں، بالکل ویسے ہی جیسے آپ کسی معالج کو طلب کرتے ہیں تو سب سے پہلے وہ مریض کی تشخیص کرتا ہے، پھر وہ مرض کا تعین کرتا ہے اور تب جا کر دوا تجویز کرتا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ فرض کرلینا ہی درست نہیں کہ وہ بنیادی جمعیت جس پر دعوت اصل انحصار کرے گی اس کا آسمان سے کہیں نزول ہو چکا ہے اور وہ ہر عیب سے پاک صاف مثالی حالت میں موجود دستیاب ہے! یہ جمعیت اپنی مطلوبہ حالت وکیفیت میں اگر کہیں موجود ہوتی تو پھر دُکھ ہی کس بات کا تھا۔ یہ 'بنیادی جمعیت' خود بھی تو اسی اُمت کا ہی حصہ ہے۔ جن حالات نے اس اُمت پر افتاد کر رکھی ہے، ان سے یہ بھی

کیسے محفوظ رہ سکتی تھی۔ جن امراض سے اس اُمت کو واسطہ پڑا ہے وہی اس کو بھی کسی نہ کسی انداز میں لاحق ہیں۔ البتہ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: **خیارکم فی الجاھلیة خیارکم فی الاسلام اذا فقھوا** (أخرجه البخاری) ''تم میں جو لوگ جاہلیت میں چنیدہ ہوں گے وہی اسلام میں چنیدہ ہوں گے بشرطیکہ وہ (اسلام کا) فہم پالیں'' تو اس بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کی اس جزوی جاہلیت میں جس کی بابت امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ یہ اسلام کے کئی ایک خطوں میں آج بھی پائی جاسکتی ہے...... آج کی اس جاہلیت میں کچھ 'چنیدہ' لوگ پائے جاسکتے ہیں جو کچھ مطلوبہ محنت کر لینے اور اپنے آپ کو ایک بھرپور تبدیلی سے گزار لینے کے نتیجے میں اس تحریکی عمل کا بنیادی بیج بن سکتے ہیں جس کو آج کے اس دور میں برپا کیا جانا ہے پھر یہاں کچھ اور 'چنیدہ' عناصر پائے جاسکتے ہیں جو کچھ مطلوبہ محنت کر لینے کے نتیجے میں 'توسیع شدہ جمعیت' کی صورت دھار سکتے ہیں جس کو اس ابتدائی جمعیت کے گرد اگرد اکٹھا ہونا اور اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے، پھر اس کے بعد عوام الناس کی تحریکی وسماجی شمولیت ہوگی اور ان میں سے 'چنیدہ' لوگ اس دعوت کے پیچھے کھڑے ہوں گے اور دل وجان سے اس کا ساتھ دیں گے۔ رہے وہ لوگ جو عوام الناس میں سے ایسا نہ کریں گے تو ان کی بابت یہی ہوگا جو عثمانؓ کے قول میں بیان ہوا: **یزعھم السلطان اذا لم یزعھم القرآن**...... جو قرآن کے زیرنگین نہ ہوں گے وہ سلطان (اسلام کا اقتدار وسماجی دباؤ) کے زیرنگین آئیں گے۔

تو پھر اب دیکھتے ہیں کہ آج کی یہ موجودہ نسل جس کو اس دعوت کا مخاطب بنایا جانا ہے وہ کس حال میں ہے اور اس کو اس 'خس وخاشاک' والی کیفیت تک کس چیز نے پہنچایا ہے، تاکہ ہم یہ فیصلہ کرسکیں کہ علاج کہاں سے شروع ہو اور علاج کے معاملہ میں ہم کو کیا کیا اقدامات کرنا ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں بیشمار امراض ایسے ہیں جو صدیوں کے اس تاریخی سفر کے درمیان اس اُمت کو لاحق ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ مرض ایسے ہیں جو اس کے اپنے ہی اندر سے پھوٹتے رہے ہیں اور کچھ مرض ایسے ہیں جو دشمنوں کے ہاں سے اس کو منتقل ہوئے۔ ان امراض کا تفصیلاً شمار کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ البتہ ہم سمجھتے ہیں کہ کچھ امراض تو اس حد تک نمایاں ہیں کہ 'چیک اپ' کرنے والے کسی بھی شخص کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہ سکتے۔

ان امراض میں ایک نمایاں ترین مرض ارجائی فکر ہے، جس کی رو سے ایمان دل سے تصدیق کر دینے اور زبان سے اقرار کر لینے کا نام ہے اور یہ کہ 'عمل' ایمان کے مفہوم میں سرے سے شامل نہیں!

یہ بات کہ دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کیا جانا ایمان کا اعتبار کیا جانے کیلئے لازم و مطلوب ہے تو اس پر ہرگز کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ یہ بات کہ 'عمل' ایمان کی تعریف میں داخل نہیں تو یہ ایک خطرناک بدعت ہے اور اس دین کی حقیقت سے ایک شدید ترین انحراف...... اُس دین کی حقیقت سے انحراف جو کہ عمل اور محنت اور جہاد کے بغیر دُنیا میں نہ کبھی قائم ہوا اور نہ کبھی ہو سکتا ہے...... جو ایک ایسی عظیم جدوجہد کے بغیر جو زمین کے اندر زندگی کا دھارا بدل کر رکھ دے کوئی قابل ذکر واقعہ کبھی بن سکا ہے اور نہ کبھی بن سکے گا۔ وہ غربت و کس مپرسی جو اسلام کو پہلی بار لاحق تھی (۱) وہ محض 'دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار' کے بل پر زائل نہیں ہو گئی تھی! دُنیا کا کوئی بھی نظام، کجا یہ کہ وہ دُنیا کا بہترین نظام ہو، محض دل کی تصدیق اور زبان کے اقرار کے سہارے قائم نہیں ہوتا جب تک کہ اس 'دل کی تصدیق اور زبان کے اقرار' کو دُنیا کا جیتا جاگتا عملی واقعہ بنا دینے پر ڈھیروں 'محنت' اور 'عمل' نہیں کر لیا جاتا۔

اس ارجائی فکر کے پھیل جانے کے خواہ کوئی بھی اسباب ہوں یہ فکر بہر حال اُمت کی ساخت کو بدل کر رکھ دینے میں بے پناہ مہلک ثابت ہوا ہے۔ تب سے اس اُمت کے اندر فرائض سے جان چھڑانے کا ایک شدید رجحان در آیا ہے۔ یہ فکر ارجائی ہی ہے جو اس اُمت کو جب وہ فرائض سے جی چرانے لگی ایک با قاعدہ فکری اور علمی انداز میں تھپکیاں دیتا رہا کہ جب تک اس کے دِل میں ایمان 'باقی' ہے تب تک اسے کس بات کی فکر! تا آنکہ فرائض سے جان چھڑاتے چھڑاتے شرکِ صریح میں جا پڑنے کی نوبت آئی خواہ وہ شرکِ اعتقاد ہو یا شرکِ عبادت یا شرکِ حاکمیت۔ فکرِ ارجاء تب بھی لوگوں کو تسلی دلاتا رہا کہ اب بھی وہ خیر خیریت سے ہیں اور یہ کہ اب بھی وہ پورے پورے مومن ہیں!

آپ ایک لمحہ کیلئے کسی ایسے مکتب کا تصور کریں جہاں طالب علموں کو داخلہ دیا جا رہا ہو اور وہ داخل ہوتے ہی وہاں اسباق یاد کرنے کی پابندی سے آزاد ہونے لگیں! پھر یہاں تک کہ مکتب کے دروس میں

---

(۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: بدأ الاسلام غریباً و سیعود غریباً کما بدأ "اسلام کا آغاز تھا تو یہ اجنبی تھا۔ عنقریب یہ ویسا ہی اجنبی ہو رہے گا جیسا کہ ابتداء میں تھا"۔

حاضر ہونے سے ہی اپنے آپ کو آزاد کرلیں! تب بھی ان کو پورے 'مدلل' انداز میں بتا دیا جائے کہ "خیر ہے۔ جب تک تمہاری 'نیت' غیر حاضری کی نہ تھی اور جب تک مکتب حاضری پر تمہارا 'اعتقاد' ہے تب تک فکر کی کوئی بات نہیں! تم غیر حاضر ہوئے یا سبق یاد کرکے سنانے پر آمادہ نہیں ہوئے تو اس کا سبب یہ تھوڑی ہے کہ تم 'جُحود' کے مرتکب ہوا اور مکتب آنے یا سبق سنانے کے 'منکر' ہو۔ تم تو محض 'سستی' کے باعث ایسا کرتے ہو! اور یہ کہ جب تک تمہارا نام مکتب کے رجسٹروں میں درج ہے اور جب تک تم اپنے نام مکتب کے رجسٹروں سے خارج کرنے کا ازخود مطالبہ نہیں کرتے تب تک تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی!"۔

کیا ایک ایسی کم ہمت، بے عمل اور ہرزیاں کو 'خدا کے کھاتے میں' ڈال آنے والی خواب آور ذہنیت کے بل پر ___ جس کو ہزاروں 'شرعی دلائل' کا سہارا حاصل ہو ___ دُنیائے واقع کے اندر کچھ بھی کیا جاسکتا ہے؟

ایسی ذہنیت اور کیفیت کے بل پر اگر دُنیا میں کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا تو کیا پھر اسلام ہی ہے جو اس پست ذہنیت کے سہارے دُنیا میں قائم ہو جائے گا جبکہ وہ نازل ہی اس لئے ہوا ہے کہ انسانی زندگی کو اس کے تمام تر جوانب اور تمام تر میدانوں سمیت ایک منفرد جہت دے اور اپنے رخ پر اس انسانی زندگی کو ایک بھرپور حرکت دے اور جو کہ بڑھتے بڑھتے پوری زمین کو اپنی زد میں لے آئے اور پوری انسانیت تک اپنا دائرہ پھیلا دے۔ اس 'اپنی زد میں لانے' اور 'اپنے دائرہ کو پھیلانے' کا انحصار آخر اسی بات پر تو ہے کہ 'انسانوں' کی کتنی محنت اس پر صرف ہوئی۔ 'خدا کی تقدیر' بھی تو آخر 'انسانی جدوجہد' کے ذریعے ہی انسانی دُنیا میں روپذیر ہوتی ہے۔

کیا یہ فتنہ جو فاسد عقائد و نظریات اور فاسد نظاموں کے ایک انبار کی صورت میں آج ہمیں درپیش ہے اور پھر ان فاسد نظریات اور فاسد نظاموں کو تحفظ دینے کیلئے منظّم لشکروں کی ایک فوج ظفر موج یہاں موجود ہے...... کیا اس فتنۂ عظیم کا خاتمہ محض 'دل کی تصدیق اور زبان کے اقرار' سے کیا جاسکتا ہے؟ کیا یہ فتنہ و فساد جو جاہلیت انسانیت پر مسلط کئے بیٹھی ہے، اور جو کہ ازل سے جاہلیت کی سرشت ہے، ایک باقاعدہ جہاد کے بغیر روئے زمین سے ختم کیا جاسکتا ہے؟

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّه (الانفال:۳۹)

ان سے قتال کرتے رہو جب تک فتنہ ختم نہیں ہو جاتا اور جب تک دین سارے کا سارا اللہ کیلئے نہیں ہو جاتا

کوئی اور مرض ہوتو ہو، اور کسی اور اُمت میں ہوتو ہو، مگر یہ مرض یعنی ارجائی ذہنیت ایسا عارضہ ہے جو اُمت اسلام کو تو ہرگز لاحق نہ ہونا چاہئے تھا جبکہ یہ اُمت برپا ہی اس لئے کی گئی ہے کہ انسانیت کی رہبری کرے اور دُنیا پر شہادت قائم کرے:

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيداً عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (الحج:۷۸)

اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے تمہیں اپنے کام کیلئے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی، تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ

☆☆☆☆☆☆☆

**اس کے بعد صوفی فکر آیا اور اس اُمت کی فکری زمین پر فکرِ ارجاء کے شانہ بشانہ چلنے لگا......**

**گو کہ یہ افتاد کچھ اپنی ہی نوعیت کی تھی......**

فکر ارجائی نے جنسِ عمل کو ایمان کی تعریف سے خارج کر دیا تھا۔ صوفی فکر آیا تو اس نے 'عمل' کی صرف ایک خاص قسم پر ترکیز کرائی البتہ عمل کے باقی سب انواع اور سب جوانب کو مستلزماتِ ایمان سے بدستور خارج رکھا۔ صوفی فکر کی ترکیز عبادت کی کچھ صورتوں پر رہی جن میں ذکر و ورد نمایاں ترین تھا۔ البتہ خدائی منہج پر زمین کی تعمیر، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ ایسے سب فرائض جو کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ میں بالنص وارد ہوئے ہیں نظرانداز کر دیئے گئے۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (الحج: آیت نمبر۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بُرائی سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے

فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالآخِرَةِ (النساء:۷۴) ''اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے ان لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دُنیا کی زندگی کو فروخت کردیں''۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّهُ الَّذِينَ آمَنُواْ وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُواْ الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّهُ الَّذِينَ جَاهَدُواْ مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ (آل عمران:۱۴۱۔۱۴۲) اور تا کہ وہ مومنوں کو چھانٹ کر الگ کر لے اور کافروں کی سرکوبی کردے۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولاً فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُور (الملک:۱۵) ''وہ ذات جس نے تمہارے لئے زمین کو پست و مطیع کردیا۔ چلو پھرو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق۔ اسی کی طرف تم کو زندہ ہو اٹھنا ہے''۔

هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا (ھود:۶۱) ''اسی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا ہے اور اسی نے اس زمین میں تمہیں بسایا ہے''۔

ذکر یقیناً مطلوب ہے۔ ذکر کے بغیر عبادت ہی کیسی؟ مگر وہ ذکر جس کا وصف اللہ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے اور جس کے حوالے سے صحابہ کی تعریف کی ہے: **الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعودا وعلی جنوبھم** (آل عمران:۱۹۱) ''وہ جو اٹھتے بیٹھتے اور کروٹوں پر لیٹے خدا کو یاد کرتے ہیں''۔ تو یہ ذکر ایک اور چیز ہے اور اس ذکر سے بہت مختلف ہے جس کی بدعت صوفیہ نے ایجاد کی اور عبادت کو اسی میں محصور کردیا اور اپنے تئیں یہ سمجھا کہ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو خدا تک پہنچاتی ہے۔ رہا عقیدۂ اتحاد و حلول اور وحدۃ الوجود ایسا صریح شرک تو وہ اس کے سوا ہے۔

صوفی فکر کے امت میں پھیل جانے کے خواہ کوئی سے بھی اسباب ہوں ___ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ عوام الناس کیلئے دین کی جانب رجوع کرنے کیلئے بڑی سطح پر ایک ہی دہلیز پائی گئی اور جو کہ صوفی دہلیز تھی ___ اس بات کے خواہ کچھ بھی محرکات ہوں یہ فکر بہرحال اُمت کی بنیادی

ساخت کو بدل کر رکھ دینے میں بے پناہ مہلک ثابت ہوا۔ ہر معاملے ہر سانحے کو خدا کے کھاتے میں ڈال دینا، اسباب اختیار کرنے کو یقین کا ضعف جاننا، زمین کو خدائی منہج پر تعمیر کرنے کا فرض سرے سے نظر انداز کر دیا جانا، عقیدۂ قضا وقدر میں انحراف کا شکار ہو جانا، اپنی خطاؤں کی ذمہ داری اٹھانے میں تاویل سے کام لینا، جہاد اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے منہ موڑ لینا، دُنیا اور آخرت کے راستے جدا ہو جانا، مسلمان کے شعور میں یہ احساس بیٹھ جانا کہ دُنیا کا کام آخرت کے کام سے اور آخرت کا کام دُنیا کے کام سے متصادم ہے، نفس انسانی کے اندر اسلام کے پیدا کردہ خوبصورت اور دقیق توازن کا خلل زدہ ہو جانا جس کی رو سے انسان دنیا کی دوڑ میں 'مسلمان' کی حیثیت سے شریک ہوتا ہے تو انسانی زندگی کا رخ خدا کی جانب کر دیتا ہے اور دُنیا کے ہنگاموں میں اس شرکت کے دوران اس کا دل برابر خدا کی جانب متوجہ رہتا ہے..... بالفاظ دیگر اس توازن میں بگاڑ آ جانا جو اسلام ایک دقیق انداز میں عالم غیب اور عالم شہادت کے مابین لے کر آتا ہے..... یہ اس فکر کے پھیل جانے کے چند ایک آثار ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

اس کے بعد جو مرض آیا وہ ہے اسلام کا 'فرد کی دُنیا' میں سمٹ آنا اور دین کے 'انفرادی امور' میں محصور ہو کر رہ جانا اور ان اجتماعی اُمور کا ترک کر دیا جانا جن کا خدا نے 'جماعت مسلمہ' کو باقاعدہ طور پر مکلّف ٹھہرایا ہے۔

یہ دین محض افراد کی فرداً فرداً اصلاح کیلئے نازل نہیں ہوا۔ گو کہ فرد ہی دین کی اصل اساس ہے اور اس کے بغیر دین کی بنیاد نہیں اٹھائی جا سکتی مگر یہ خیال بھی بہت غلط ہے کہ لوگوں کی فرداً فرداً اصلاح کا عمل بذات خود ایک صالح معاشرہ وجود میں لے آئے گا، گو کہ انسان کو بادیِ امر یہی خیال درست لگتا ہو۔ اگر آپ ایک ایسی عمارت کا خیال تصور میں لائیں جس کی ایک ایک اینٹ اپنی جگہ صحیح سالم ہو مگر ان اینٹوں کو ایک خاص انداز میں نہ جوڑا گیا ہو اور نہ ہی ان کو جوڑ رکھنے کیلئے کوئی 'مسالہ' استعمال کیا گیا ہو تو وہ ظاہر ہے ایک خیالی عمارت تو ہو سکتی ہے عالم واقع میں اس کا قیام ممکن نہیں۔ پھر ایسی عمارت کسی زمینی بھونچال یا کسی فضائی طوفان کے آگے بھی کیونکر کھڑی رہ سکتی ہے جبکہ قوموں کی زندگی میں بھونچال اور طوفان آتے

ہی رہتے ہیں۔

بلاشبہ اس دین نے 'جماعت مسلمہ' بلکہ 'اُمت مسلمہ' کے وجود اور بہبود پر بے حد زور دیا ہے۔ ایک ایسی اُمت جو اپنی ساخت میں ٹھوس اور مضبوط ہو۔ اس کا یہ ٹھوس پن اور مضبوطی محض جوش اور جذبات کی حد تک نہ رہے بلکہ عمل کے ہر پہلو میں ہو یہاں تک کہ یہ اُمت مجموعی طور پر خدا کے عائد کردہ سب کے سب فرائض کی انجام دہی یقینی بنائے۔ شریعت میں کتنے ہی مقامات ایسے ہیں جہاں مومنوں کو خطاب کرتے ہوئے **یاایھا الذین آمنوا** کہہ کر احکامات وہدایات دی جاتی ہیں تو وہاں مقصد افراد کو محض ان کی انفرادی حیثیت میں خطاب کرنا نہیں بلکہ مقصد ایک جماعت سے بطورِ جماعت خطاب کرنا ہے...... ایک پوری جماعت جس کو مل کر خدا کی عائد کردہ ایک ذمہ داری اٹھانا ہے اور باہمی اشتراک سے شریعت کے مقاصد کو بروئے کار لانا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاء (المائدہ:۵۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّهِ وَلاَ يَخَافُونَ لَوْمَةَ لآئِمٍ ذَلِكَ فَضْلُ اللّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (المائدہ:۵۴-۵۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے تو (پھر جائے) اللہ ایسے لوگوں کو بلائے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کا محبوب ہوگا، جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے، جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ تمہارا رفیق تو درحقیقت صرف اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ اہل ایمان جو نماز قائم کرتے، زکوٰۃ دیتے اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاء لِلّهِ وَلَوْ عَلَى أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِينَ إِن يَكُنْ غَنِيّاً أَوْ فَقَيراً فَاللّهُ أَوْلَى بِهِمَا فَلاَ تَتَّبِعُواْ الْهَوَى أَن تَعْدِلُواْ وَإِن تَلْوُواْ أَوْ تُعْرِضُواْ فَإِنَّ اللّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (النساء:۱۳۵)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے

لَّا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ (آل عمران:۲۸)

مومنین اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور یار و مددگار ہرگز نہ بنائیں

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (آل عمران:۱۰۴)

تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور بُرائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوریٰ:۳۸)

اوران کے باہمی معاملات آپس کے مشوروں سے ہوتے ہیں

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ (التوبۃ:۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ومددگار ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں، بُرائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ (الصّف:٦)

”اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں“۔

مثل القائم فی حدود اللہ والواقع فیھا کمثل قوم استھوا ھموا علی سفینة، فصار بعضھم أعلاھا وبعضھم أسفلھا، فکان الذین فی أسفلھا اذا استقوا یروا علی من فوقھم فقالوا: لو أنا خرقنا فی مکاننا خرقا ولم نؤذ من فوقنا، فلو ترکوھم وما أرادوا اھلکوا جمیعا، وإن أخذوا علی أیدیھم نجوا ونجوا جمیعاً

وہ لوگ جو خدا کی حدوں کی رکھوالی کرتے ہیں اور وہ لوگ جو خدا کی حدوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان دونوں کی مثال ایسی ہے: جیسے ایک ہی کشتی کے سوار کشتی کے حصے آپس میں بانٹ لیں۔ کچھ لوگ اوپر کی منزل میں جا بیٹھیں اور کچھ نیچے۔ نیچے کی منزل کے لوگ جب بھی پانی لینا چاہیں تو ان کو اوپر والوں کے ہاں سے گزرنا پڑے۔ تب یہ (نیچے والے) کہتے ہیں کیوں نہ ہم اپنے والے حصے میں ایک سوراخ کرلیں اور اوپر والوں کو زحمت نہ دیں۔ اب اگر اوپر والے ان کو جو وہ کرنا چاہتے ہیں کرنے دیں تو سب کے سب ہی مارے جائیں اور اگر وہ ان کا ہاتھ پکڑ لیں تو وہ بھی بچیں اور ان کے ساتھ باقی سب لوگ بھی

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته (أخرجه الشیخان)

تم میں سے ہر کوئی راعی ہے اور تم سب سے اپنی اپنی رعیت کی بابت باز پرس ہونے والی ہے

یہ اور اس طرح کی بے شمار نصوص ہیں جو اس اُمت کی اجتماعی مسئولیت کی اہمیت کا اندازہ کرواتی ہیں۔ یہ ایک ایسی مسئولیت ہے جس میں ہر فرد کا خدا کے معاملہ میں اپنا 'انفرادی فرض' پورا کر دینا ہی کافی نہیں مثلاً یہ کہ وہ خدا کا ذکر کرے، تقویٰ وپارسائی اپنائے، خشوع وخضوع پیدا کرنے پر محنت

کرے۔ ادائِ نماز، زکوٰۃ، صیام وحج وغیرہ کا التزام کرے۔ اگر چہ یہ سب کچھ لازم ہے اور اس سے ہرگز مستغنی نہیں ہوا جا سکتا لیکن ـــــ جیسا کہ ہم نے کہا ـــــ یہ سب کچھ آپ سے آپ ایک ٹھوس مربوط مضبوط اُمت کو کھڑی کر دینے والا نہیں۔ چنانچہ یہ دین اپنی اس مکمل صورت میں جو کہ خدا کے ہاں سے نازل ہوئی اور اپنے ان سب کے سب اہداف کے معاملہ میں جو کہ خدا کو مطلوب ہیں، مومنوں کی ایک تعداد کے دُنیا میں 'فرداً فرداً' پائے جانے سے قائم ہو جانے والا نہیں چاہے ان میں کا ہر فرد ذاتی پاکیزگی میں قدوسیوں کے مرتبہ کو کیوں نہ پہنچا ہوا ہو...... جبکہ ہر فرد کا اس مرتبہ کو پہنچا ہونا ویسے ہی ایک ایسا مفروضہ ہے جس کا عملاً وقوع ممکن نہیں جب تک کہ انسان انسان ہیں اور خواہشات اور ضروریات ساتھ رکھتے ہیں اور جب تک کہ ان کے درون میں رغبات و تاثرات اور خیالات کے طوفان اٹھتے ہیں اور جب تک کہ خدا کی اس دُنیا کے ہر قریہ اور بستی کے اندر (اکابر مجرمین) کچھ چھٹے ہوئے مجرم پائے جاتے ہیں جو حق کے خلاف مکر و تدبیر میں ہر دم مصروف رہتے ہیں...... الا یہ کہ ان کو لگام دینے کو یہاں حق کی کوئی قوت مہیا ہو

| | |
|---|---|
| وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ أَكَابِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا وَمَا يَمْكُرُوْنَ إِلَّا بِأَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْن (الأنعام:۱۲۳) | اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکر و فریب کا جال پھیلائیں۔ دراصل وہ اپنے فریب کے جال میں آپ پھنستے ہیں، مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے |

حتیٰ کہ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ اکابر مجرمین کا وجود صرف جاہلیت میں ممکن ہے اور مسلم معاشرے میں یہ نہیں پائے جائیں گے تو بھی وہ 'گلوبل ویلج' ہے اور جس کا آج بڑا چرچا ہے کہ ذرائع مواصلات نے دُنیا کو آج اس زبردست مقام تک پہنچا دیا ہے...... یہ 'عالمی بستی' تو پھر بھی ان اکابر مجرمین سے بھری ہوئی ہے جو صبح شام حق کے خلاف مکر و تدبیر کرتے ہیں اور بے صبری سے اہل حق کی زندگی کے دن گنتے ہیں۔ کیا یہاں نیک افراد کا محض 'پایا جانا' اور ان کا نماز، زکوٰۃ، صیام اور حج وغیرہ کا علی وجہ الکمال ادا کر لینا اور فرداً فرداً ان میں خشوع اور تقویٰ کی ایک اعلیٰ کیفیت کا پایا جانا بذات خود ایک ایسی چیز ہے جو اکابر مجرمین کو لگام دے ڈالے گی اور ان کے کید و مکر کا منہ توڑ کر رکھ دے گی اور جاہلیت سے جو فتنہ مسلمانوں کیلئے برآمد کیا جاتا ہے اس کا خاتمہ کر دے گی؟ یا پھر اس کیلئے ایک ایسی اُمت کی ضرورت ہوگی جو اس شر کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن سکے، اپنے سب اجزاء کو مربوط کر کے اس کے مد مقابل ایک بہترین جہت دے سکے اور اپنی اجتماعی مسئولیت کا بہترین قیام عمل میں لا سکے، جس میں ہر فرد اپنے

اپنے حصے کا بوجھ بھی اٹھائے مگر مجموعی طور پر جماعت اس بوجھ کے اٹھائے جانے کو یقینی بنائے۔ یہ اجتماعی بوجھ یقیناً کچھ ایسی نوعیت کا ہے کہ اس میں اگر ہر فرد 'اپنی اپنی' نبیڑنے لگے اور اجتماعی مسئولیت کے اٹھانے میں پس وپیش کرے تو جماعت کی صفوں میں یہ مطلوبہ یکجہتی کبھی نہ آ سکے گی۔

اور کیا رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کو اس 'انفرادی' معنی میں ہی تیار کرتے تھے کہ ہر آدمی اپنی اپنی انفرادی دُنیا میں ہی عبادت کے اندر مگن ہو جائے یا پھر رسول اللہ ﷺ جس صحابی کو بھی تیار کرتے تھے اس کو ایک ایسی اینٹ بناتے تھے جو بہترین انداز میں ایک عمارت کے اندر چنی جا سکے اور وہ اپنے ساتھ کی ہر اینٹ کے ساتھ بہترین انداز میں جڑ کر حق کی اس عمارت یا اس دیوار کو ایک زبردست قوت فراہم کر سکے؟ یہ 'فرد' کی ایک ایسی تیاری تھی جو بیک وقت حق کی حامل ایک مضبوط جماعت اور معاشرے کے اندر ایک بھاری قوت کی تشکیل کر رہی تھی۔

اجتماعی احساسات اور اجتماعی ذمہ داری بھی اس ''فرد'' کی ایک اہم خصوصیت تھی۔

اجتماعی ذمہ داری میں اپنے اپنے حصے کا بھار اٹھانا ایک فرض ہے جو کہ ہر فرد پر عائد ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک 'انفرادی' عمل ہے۔ البتہ اس سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ پوری اُمت کو متاثر کرتا ہے، خواہ مثبت معنی میں اور خواہ منفی معنی میں۔ افراد کی ایک معتد بہ تعداد اس فرض کو پورا کر پاتی ہو تو ایک ایسی اُمت پائی جائے گی جو مستحکم اور مربوط ہوگی اور جس کی صفوں میں محبت، اخوت اور یگانگت پائی جائے گی۔ بصورت دیگر 'امت' کچھ متحارب دھڑوں کی صورت میں پائی جائے گی جو ایک دوسرے کے خلاف کینہ وبغض پالیں گے۔

جہاد اپنے حصے کا ہر صاحب استطاعت فرد پر فرض ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک 'انفرادی' عمل ہے۔ البتہ اس سے جو نتیجہ برآمد ہوگا وہ پوری اُمت کو متاثر کرے گا۔ خواہ مثبت معنی میں خواہ منفی معنی میں۔ افراد کی ایک معتد بہ تعداد اس فرض کو پورا کر پائی ہو تو اس اُمت کا وجود محفوظ رہے گا اور قوت وتمکین پائے گا بصورت دیگر اس کا یہ وجود بطورِ مجموعی دشمنوں کی خوراک بنے گا۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر اپنے اپنے حصے کا ہر صاحب استطاعت فرد پر فرض ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک 'انفرادی' فریضہ ہے۔ مگر اس کا نتیجہ ایجاباً یا سلباً پوری اُمت کو متاثر کرے گا۔ اس کے نتیجہ میں یا تو ایک 'امتِ خیر' پائی جائے گی اور وہ اس صورت میں جب اس کے اندر امر بالمعروف اور

نہی عن المنکر ہو رہا ہوگا۔ بصورت دیگر ایک ایسی اُمت ہوگی جو بطورِ مجموعی لعنت کی مستحق ہو یہ دونوں وصف قرآن ہی کے بیان کردہ ہیں:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّهِ (آل عمران:۱۱۰)

اب دُنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے۔تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہواور اللہ پرایمان رکھتے ہو

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُواْ مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُواْ يَعْتَدُونَ كَانُواْ لاَ يَتَنَاهَوْنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُواْ يَفْعَلُونَ (المائدہ:۷۸۔۷۹)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داوٗدؑ اور عیسیٰ بن مریمؑ کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔انہوں نے ایک دوسرے کے منکر افعال سے روکنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ بُرا طرزِ عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا

بہرحال اُمت میں ایک بڑے طبقہ کے ہاں ایک 'ذاتی معنیٰ' میں نیک اور صالح بننے کا یہ جو تصور پروان چڑھا اور اپنے کام سے کام رکھنے کی یہ جو روش عام ہوئی اور جس میں کہ ''اجتماعی طور پر'' مکلّف اور ذمہ دار ہونے کا شعور نہ ہونے کے برابر رہا...... اس روش کے مقبول عام ہونے کے خواہ جو کوئی بھی اسباب رہے ہوں مگر یہ ذہنیت اُمت کے وجود کے اندر بہت بڑے مفاسد لانے پر منتج ہوئی۔ حکمرانوں کو نصیحت کرنے کے فرض سے اُمت کی ایک بڑی تعداد کا دستبردار ہو جانا، امورِ سیاست سے صرف نظر کر لینا، 'حکومت کا معاملہ حکومت پر چھوڑ دینا'...... 'حکمران عادل ہے تو وہ خدا کی رحمت و برکت ہے، ظالم و مستبد ہے تو آپ اپنے کئے کا جواب دہ ہے، اُمت کے صالح طبقے اس کے ظلم و استبداد کو روکنے کیلئے کسی انداز کا کوئی اقدام کرنے کے مکلّف نہیں'! حکمران کے گرد منافقوں کا جھمگٹا لگا رہے اور وہ اس کی سب بداعمالیوں کو اعلیٰ ترین کارنامے بنا کر پیش کرتے رہیں حتی کہ اس کے کان تک حق کی تنبیہ ہی نہ پہنچ پائے اور اگر کسی اِکا دُکا دیندار کی آواز اس تک پہنچ بھی تو اس کے گرد حلقہ زن منافقین اس دیندار کی جیسی چاہیں صورت بنا کر پیش کریں اور الٹا حق کی اس کمزور آواز کے خلاف ہی اس کے کان بھریں کہ جہاں سب دیندار اپنے کام سے کام رکھے ہوئے ہیں وہاں یہ کوئی نرالا ہی دیندار آیا ہے جو 'حکمرانوں کے معاملات' میں دخل دینے کو دینِ اسلام کی خدمت جانتا ہے! اُمت کے اندر یہ ایک بڑی سطح پر ہر ایسا پروگرام ہر ایسا منصوبہ ناکامی کا شکار ہونے لگنا جس میں کہ اُمت کے افراد کا ہاتھوں میں ہاتھ دے کر چلنا ضروری ہوا کرتا

ہے اور جس میں کہ ہر فرد کو اپنے حصے کا کام کرنا ہوتا ہے...... پبلک پراپرٹی کا نہایت بے رحمی کے ساتھ تیاپانچہ ہونے لگنا اور جس کا اس پر جو جی چاہے کر گزرنا، جس کے ہاتھ جو لگے اسی کا، اُسے لے اڑنا اور اس منکر کا اجتماعی انکار ایک انہونی بات سمجھی جانا، اجتماعی فرائض اور دفتری و سرکاری معاملات میں بے ایمانی اور بددیانتی کا راج ہو جانا اور بیت المال کو ذاتی جاگیر جان لیا جانا...... یہ اس ذہنیت کے عام ہو جانے کے چند ایک نقصانات ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اس بات پر اس قدر تاکید کی تھی کہ گویا دین ہی یہ ہے:

"الدین النصیحة" قیل: لمن یا رسول اللّٰہ؟ قال: "للّٰہ ولرسوله ولکتابه ولعامة المسلمین و خاصتهم" (متفق علیہ)

"دین ہے ہمدردی اور خدا لگتی بات کرنا۔ عرض کی گئی: کس کی خاطر اے اللہ کے رسولؐ؟ فرمایا: خدا کی خاطر، اس کے رسول کی خاطر، اس کی کتاب کی خاطر، عامۃ المسلمین کی خاطر اور خواص المسلمین کی خاطر"

☆☆☆☆☆☆☆

اُمت کو جو عارضے لاحق ہوئے ان میں ایک روگ اس کا بے ہنگم ہو جانا بھی تھا۔ بدنظمی، پریشان حالی، کسی ترتیب اور پیش بندی سے کام نہ لینا، سب کچھ ہنگامی بنیادوں پر کرنا اور سر پر ہی آ پڑے تو کسی چیز کی بابت سوچنا۔ بے صبری، کم ہمتی اور لمبا نہ چل پانے کی نفسیات۔ یہ سب امراض میں سمجھتا ہوں ان اقوام میں اسلام آنے سے پہلے بھی پائے جاتے تھے مگر اسلام آیا تو اس نے ان اقوام کی حالت بدل کر رکھ دی اور ان کو ایک جیتی جاگتی چوکنا ہوشیار قوم بنا ڈالا۔ اسلام نے آ کر ان بے ہنگم قبیلوں اور راجواڑوں کو ایک ترتیبِ نو دے ڈالی تھی۔ اسلام ہی وہ نئی قوت تھی جو ان صدیوں سے پریشان حال اقوام کو ایک 'نئے ڈھنگ' پر لے آئی تھی۔ ہر کام ان کو ایک ترتیب اور سلیقے سے کرنا سکھایا تھا۔ تفکر اور تدبر کا شعور دیا تھا۔ بولنے سے پہلے تولنا ان کو اسلام ہی کی ہدایت تھی۔ قبل از عمل، دوران عمل اور پس از عمل عواقب پر نگاہ رکھنا ان کو اسلام ہی کی تعلیم تھی۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے ان کو ایک جوشیلے پن سے نکال کر ایک گہرا شعور اور پیہم عمل رکھنے والی قوم بنا دیا تھا جس کی بدولت ان کو ایک ٹھوس پن اور ایک عالی ہمتی نصیب ہوئی تھی اور جس کی بدولت یہ وہ قوم نہ رہی تھی جو ہر کام جذبات میں آ کر کرے اور کچھ ہی دیر بعد اس کو ادھورا چھوڑ کر یا تو بیٹھ جایا کرے اور یا پھر کسی اور سمت کا رخ کر لیا کرے۔

رسول اللہ ﷺ اپنے زیر تربیت افراد کو ان پہلوؤں سے تربیت دینے کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ ان معاملات کو آپؐ نہ تو سرسری نظر سے دیکھتے تھے اور نہ ہرگز کم اہم جانتے کہ ہو جائیں تب ٹھیک

ہے نہ ہوں تب کوئی بڑی بات نہیں! نبی ﷺ بخوبی جانتے تھے، کیونکہ آپؐ پر الہام ہوتا تھا، کہ جس قوم کو اس طرح کے روگ لگے ہوئے ہوں اس کی زندگی میں کوئی مضبوط اور بلند و بالا عمارت اٹھائی ہی نہیں جا سکتی۔

صحابہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنا حال یوں بیان کرتے ہیں "**کان رسول اللہ یَصِفُّنا للصلاۃ کما یَصِفُّنا للقتال** ......" "رسول اللہ ﷺ نماز میں ہماری یوں صفیں بنواتے جیسے میدان جنگ میں بناتے ہوں" یہ ترتیب و تنظیم کا معاملہ نماز میں خشوع و خضوع اور روحانی تسکین حاصل کرنے کے علاوہ تھا۔ نماز انسان کا خدا کے ساتھ ایک خصوصی تعلق ہے۔ اس میں اصل چیز انسان کا خشوع ہے جو کہ اس کی روح کو خدا کے ساتھ وصال کرواتی ہے۔ خشوع اور حضورِ قلب کی جانب توجہ کرانا پس ایک طبعی بات ہے۔ مگر نبی ﷺ جو کہ خدا سے الہام لیتے تھے، خوب جانتے تھے کہ اس خشوع اور روحانیت اور خدا کے ساتھ تعلق کی پختگی کے علاوہ اُمت کی تعمیر کیلئے ایک اور عنصر درکار ہے اور وہ ہے نظم۔ نظم دراصل ایک نفسیاتی کیفیت کا نام ہے اور ایک محسوس ہو سکنے والے رویہ کا۔ یہ چیز مسلسل سدھائے اور سکھائے رہنے سے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ ایک ایک شخص کو اپنے دستِ مبارک سے سیدھا کرتے اور نماز شروع کرانے سے پہلے ان کو ایک نفسیاتی کیفیت میں لے کر آتے۔ نماز تک شروع نہ کرتے جب تک ان کی صف درست نہ ہو جاتی...... یہ بتانے کیلئے کہ عبادت گزاروں کا نظم خدا کو کس قدر پسند ہے۔

واضح امر ہے کہ نظم اور ترتیب اس دین کا جزو لاینفک ہے۔ نماز ہے تو وہ خدا سے تعلق کے ساتھ ساتھ ایک نظم اور ترتیب کا نام بھی ہے خواہ وہ بروقت ادائیگی کا معاملہ ہو یا صف درست کرنے کا معاملہ یا نمازیوں کا ایک ساتھ مل کر رکوع و سجود اور قیام وقعدہ میں امام کی متابعت کرنا۔ اسی طرح روزہ ہے، بندگی اور بیک وقت اوقات کی پابندی اور نظم وضبط۔ زکوٰۃ ہے تو تب، حج ہے تو تب۔ سب کچھ ایک وقت پر اور ایک خاص ترتیب اور متعین انداز میں ہو تو قبول ہوتا ہے...... رہا خدا کی راہ میں قتال تو وہ تو ہے ہی نظم اور ضبط۔

رہا ایک من موجی انداز، جدھر کی سوچ آئی ادھر کو ہو لینے کی نفسیات، آناً فاناً کی ذہنیت اور سر پہ آ پڑے تو فوری موقف اپنانے اور فیصلے کرنے کا انداز...... تو یہ آفت ماحول کی ایک دین ہو سکتی ہے۔ مگر اسلام نے ماحول میں پائے جانے والے اس انداز کی شدید مزاحمت کی تھی اور نفوس سے اس کا اثر دور

کرنے کے بے شمار اقدامات کیئے تھے۔اسلام نے اس بے ہنگم ماحول میں پائے جانے والے انسان کو خدا کی سنتوں اور خدا کے طبعی قوانین کی جانب متوجہ کروایا تھا کہ وہ دیکھے کہ خدا کے یہ قوانین اس کی کائنات میں کس ضبط اور تسلسل کے ساتھ کام کرتے ہیں جو نہ کبھی بدلیں اور نہ کبھی ٹلیں۔اسلام نے عرب کے ایک بے نظم انسان کو تفکر اور تدبر کی راہ پر ڈالا تھا اور اس بات پر اس کی تربیت کی تھی کہ وہ صرف یہی دیکھنے پر اکتفا نہ کرلیا کرے کہ وہ جو کام کرنے جارہا ہے آیا وہ جائز ہے یا ناجائز بلکہ وہ اشیاء کو ان کے نتائج اور انجام کے لحاظ سے بھی جانچے۔کیونکہ ہوسکتا ہے ایک کام اپنی عمومی حیثیت میں جائز ہو یا حتی کہ مستحب ہو مگر اس سے کسی وقت جو نتائج برآمد ہوتے ہوں ان نتائج کے پیشِ نظر وہ ممنوع ٹھہرے۔مشرکین اگر کسی وقت ردعمل میں آکر خدا کے ساتھ گستاخی پہ اتر آتے ہوں تو قرآن مجید کی رو سے ایسی حالت میں بتوں کو بُرا بھلا کہنا تک ممنوع ہوجاتا ہے:

| | |
|---|---|
| وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّهِ فَيَسُبُّواْ اللّهَ عَدْواً بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام:۱۰۸) | یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو۔کہیں ایسے نہ ہو یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں |

اسی ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا عبداللہ بن ابی کے قتل سے احتراز برتنا آتا ہے جبکہ وہ ایک کھلم کھلا منافق تھا۔اس کا باعث بھی یہی تھا کہ لوگوں میں یہ بات نہ ہونے لگے کہ محمد ﷺ اپنے اصحاب کو قتل کروادیتے ہیں جبکہ اس وقت صورتحال یہ تھی کہ لوگ یا تو اسلام میں داخل ہوگئے تھے مگر اسلام ان کے نفوس میں ابھی گہرا نہ اتر پایا تھا اور یا پھر وہ ابھی اسلام کی دہلیز پر کھڑے ابھی جائزہ لے رہے تھے کہ وہ اسلام میں داخل ہوں یا نہ۔ایسے وقت میں ایسی چہ میگوئیاں ہونے لگنا دعوت کو سست کرسکتا تھا اور اسلام کی بابت ابھی جو لوگ شش و پنج کا شکار تھے ان کو اسلام کی جانب سے بددل کرسکتا تھا۔

رہی لمبا نہ چل پانے کی ذہنیت اور جوشیلے پن کے باعث مستقل مزاجی کا فقدان تو یہ بھی ماحول کی دین ہوسکتی ہے۔مگر اسلام نے اس ذہنیت کا ہر ہر پہلو سے علاج کیا تھا۔

ایک طرف اسلام نے اس کوتاہ نظر ماحول میں پائے جانے والے لوگوں کو ایک ایسے مقصد اور ایسی غایت کی جانب دیکھنا سکھایا تھا جو کہ اس جہان سے گزر کر آتا ہے۔جس کے انتظار میں انسان کو

پوری زندگی گزار دینا ہوتی ہے...... یہ یوم آخرت کی امید ہے اور اس روز کی تیاری جو اگلے جہان میں پیش آنے والا ہے اور جس دن بعث ونشور اور حساب وکتاب اور جنت ودوزخ کا سامنا ہونا ہے۔ یوں مسلمان کی نفسیات کے اندر اسلام نے عاجلہ کو آجلہ کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ یہ ایک ایسی نفسیات تھی کہ جس کی رو سے عمل آج کرنا ہے تو اس کے نتائج کی اُمید اگلے جہان میں رکھنی ہے۔ عمل کا اس سے وسیع ترافق کوئی ہو ہی نہیں سکتا کہ نفس میں اتنا دور تک دیکھنے کی سکت پیدا ہو جائے۔ حدنگاہ کا اس حد تک دراز ہو جانا کہیں اور ممکن ہی نہیں کہ انسان اس قدر دور اندیش مقاصد رکھنے لگے۔ راستے کے دوران بے ہمتی آجانے کا امکان رہے تو راستہ طے ہوتے رہنے کی کوئی ضمانت باقی نہیں رہتی!

دوسری طرف رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے عمل اور اسوہ سے صبر واستقلال اور پیہم عمل اور مسلسل جہاد کی ایک بہترین مثال قائم کر کے دکھائی تھی۔ بدترین حالات میں بھی آپ کا پایہ استقلال ہرگز نہ ڈگمگایا۔ بری سے بری صورت حال میں بھی آپؐ نے ناامیدی اور بددلی کو پاس نہ آنے دیا جبکہ حالات پلٹ پلٹ کر آپؐ کو مجبور کر رہے تھے کہ آپؐ ہمت چھوڑ بیٹھیں اور 'راستہ' بدل لیں۔

تیسری جانب آپؐ نے صحابۂ کرامؓ اور پھر ان کے ذریعے اس اُمت میں مستقل مزاجی اور دور اندیشی کی بطور خاص جوت جگائی تھی۔ عمل کا ثمر آدمی کو خواہ کتنا دور لگے مگر اچھا اور اعلیٰ اور مفید کام ہر حال میں جاری رکھنے کی ایک باقاعدہ نفسیات تھی جو آپؐ نے اس اُمت کے اندر پیدا فرمائی تھی: ان قامت الساعة وبيد أحدكم فسيلة فليغرسها (مسند احمد) اگر قیامت آئے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کھجور کی قلم ہو تو وہ اس کو ضرور ہی (کھیت میں) بو لے"۔ 'تھوڑا مگر مسلسل' کی آپؐ بار بار تاکید فرماتے۔ عجز وکسل یعنی کم ہمتی اور سستی سے ہمیشہ خدا کی پناہ مانگتے۔

کتاب اور سنت میں پائی جانے والی ان ہدایات ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ اس اُمت کی زندگی میں صدیوں تک دعوت کا تسلسل جاری رہا۔ صدیوں تک جہاد کا عمل باقی رہا۔ ایک مسلسل محنت اور عمل کے راستے پر چل پڑنے والی اس اُمت نے ایک شاندار تہذیب برپا کی اور ایک ایسے علمی وسائنسی انقلاب کی بنیاد رکھی جو نہ صرف صدیوں تک چلا بلکہ اس نے کرۂ ارض کا نقشہ بھی بدل ڈالا۔

گزشتہ چند صدیوں میں اس صورتحال کے نیچے آجانے کے خواہ کوئی بھی اسباب ہوں اور آج یہ صورتحال کہ ہر چیز بے ہنگم، ہر کام ادھورا، نظم وضبط ندارد، بے سوچے چل پڑنے اور بغیر کسی منصوبہ بندی

کے کام انجام دینے کی ذہنیت زوروں پر ہے، لمبا چلنے کی بجائے جوشیلے پن کا انداز زیادہ مقبول ہے اور قدم قدم پر رستہ بدلنے کی ضرورت پیش آتی ہے...... اس صورتحال کے خواہ کوئی سے بھی عوامل ہوں مگر ان امراض نے اُمت کے جسم کو کھوکھلا کر کے بہرحال رکھ دیا ہے۔ اُمت کا تہذیبی وسائنسی میدان میں پسماندہ رہنا، بڑے اچھے اچھے اور نفع بخش منصوبوں کا پھل آنے سے پہلے ہی اپنی طبعی موت مرجانا، بہت سے عقائدی، فکری، سیاسی، سماجی اور اخلاقی مصائب کو اپنے گرد پا کر ایک معمول کی صورتحال جاننا بلکہ اس پرٹس سے مس نہ ہونا اور اس میں تبدیلی لانے کیلئے کوئی ٹھوس سنجیدہ لائحہ عمل اختیار کرنے پر تیار نہ ہونا...... یہ اس نفسیات کے چندایک نتائج ہیں جبکہ یہ سب وہ منکرات ہیں جن کے خاتمہ کی اللہ اور رسولؐ نے ہدایت فرمائی ہے اور جس کے خاتمہ کیلئے اٹھ کھڑا نہ ہونے کی صورت میں اس اُمت کو ایک ایسی سزا سے خبردار کیا ہے جس کی زد ہر شخص پہ پڑنے والی ہے......

☆☆☆☆☆☆☆

یہ سب روگ جب مل کر اُمت کے وجود کو لاحق ہوئے تو دو بہت بڑے بڑے واقعات اُمت کی زندگی میں رونما ہوئے جبکہ ان دونوں کی ہی رسول اللہ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی: ایک اسلام کا یہاں غریب الدیار ہوجانا اور دوسرا قوموں کا اس اُمت پہ چڑھ دوڑنا۔

اسلام یہاں ویسے ہی اجنبی اور غریب الدیار نظر آنے لگا جب یہ اپنی ابتدا کے وقت کبھی ہوا کرتا تھا۔ اس کے سب مفہوم یہاں اجنبی ہوگئے۔ اسلام کے وہ اصل مفاہیم جو خدا کے ہاں سے نازل ہوئے تھے گویا روپوش ہی ہوگئے......

'لَآ اِلٰـہَ اِلاَّ اللّٰـہ' اب الفاظ کا ایک مجموعہ بن کر رہ گیا جس کو صرف زبان سے ادا کردیا جاتا تھا چاہے دل اس کی دلالت سے کتنا ہی غافل اور کردار اس کے تقاضوں سے کتنا ہی ناآشنا کیوں نہ ہو۔

'عبادت' کچھ شعائر میں محدود ہو کر رہ گئی۔ اور وہ شعائر بھی پھر ایک روایتی انداز اختیار کر گئے جس کے اندر شعور کی کوئی روح تک نہ تھی۔ پھر شعائر کی یہ روایتی ادائیگی بھی ایک تھوڑی تعداد کا معمول ہو کر رہ گیا۔ زیادہ لوگ اتنی تکلیف کے بھی روادار نہ رہے۔ 'نماز روزہ اور چندہ خیرات' کا دل میں احترام ہونا بھی کافی مان لیا گیا!

'عقیدۂ قضا وقدر' لمبی تان کر سورہنے کی دلیل بنا۔ ایک حد درجہ قنوطیت، یبوست اور عدم فاعلیت روگ کی صورت میں ان مسلم اقوام کو لاحق ہوئی۔ جبکہ یہ عقیدہ ان کو خدا پر بھروسہ کرنا سکھانے اور ان کے عزم وہمت کو جواں کرنے اور اسباب کو مسخر کرنے کا سبق دینے آیا تھا۔ یہ عقیدہ آخرکار اس بات کی بنیاد بنا کہ یہ اپنی سب نااہلی اور نامردی اور اپنی سب غلطیوں کو خدا کے کھاتے میں ڈال آیا کریں اور اس کو 'خدا کا کرنا' سمجھ کر قبول کیے رہنا 'ایمان' کا تقاضا جانیں۔ نتیجتاً اس کو تبدیل کرنے کی ضرورت تک محسوس نہ کریں۔

'دُنیا اور آخرت' لوگوں کے خیال میں دو الگ الگ راستوں کے نام بن کر رہ گئے جو کہیں آپس میں نہیں ملتے۔ دُنیا کیلئے کام کرنا آخرت کو نظر انداز کرنا قرار پایا اور آخرت کی محنت دُنیا اور بہبودِ ارض کے منافی سمجھی گئی۔

'جہاد' کا مفہوم سکڑ سکڑ کر 'دفاع' تک آ گیا۔ پھر یہ 'دفاع' بھی ان سے نہ ہو پایا اور یہ بھی ان کے ہاتھ سے جاتا رہا اور اس کے تقاضے ادا کرنے سے بھی ان کی جان جانے لگی۔

'تربیت' کا مفہوم مسخ ہو کر ایک خاص 'حلیہ' اپنا رکھنے اور ایک خاص مذہبی جکڑ بندی کی صورت اختیار کر گیا جس کے پیچھے نہ کوئی تخلیقی روح کارفرما رہ گئی تھی اور نہ فکری رفعت کا کوئی تصور۔

'صبر' کا مطلب 'حِس' کا ختم ہو جانا اور 'ذلت' کو قبول کیے رہنا ہو گیا۔ 'تقویٰ' و 'پرہیز گاری' سے یہ مراد ٹھہری کہ انسان میں کوئی جذبات رہ جائیں اور نہ کوئی ولولہ وامنگ۔

اسلام کے بنیادی مفہومات میں جب اتنا بڑا خلل آیا...... دوسرے لفظوں میں اسلام جب یہاں غربت کا شکار ہوا تو پھر ''پسماندگی'' کا دور دورہ ہوا۔ یہ 'پسماندگی' پھر ہر میدان میں آئی: عسکری پسماندگی، سیاسی پسماندگی، سماجی پسماندگی، معاشرتی پسماندگی...... پسماندگی کی ہر وہ صورت جو آپ کے ذہن میں آسکتی ہے یہاں ڈیرے ڈال کر بیٹھ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام تر عرصۂ عروج اس اُمت میں جو ترقی وکمال پایا گیا اس کا دراصل ایک ہی منبع تھا اور وہ تھا اللہ اور یوم آخرت کی بابت اس اُمت کا صحیح عقیدہ وتصور۔

مگر جب قلب وذہن میں اس ترقی وکمال کے سوتے خشک ہو گئے ـــــ **الا ماشاء اللہ** ـــــ تو پھر کوئی چیز ایسی نہ رہی جو اس عظیم الشان عمل کو قوت اور غذا فراہم کرتی۔

| | |
|---|---|
| ألَا وانَّ في الجسد مضغةٌ اذا صلحت صلح الجسد كله واذا فسدت فسد الجَسَدُ كله، الا وهي القلب (صحيحين) | خبردار جسم کے اندر ایک لوتھڑا پایا جاتا ہے جو اگر صحیح کام کرے تو سارا جسم صحیح کام کرتا ہے۔ اگر وہ خرابی کرے تو سارا جسم خرابی کرتا ہے۔ خبردار یہ لوتھڑا دل ہے |

معاملہ جب اس نوبت تک پہنچ چکا تو دُنیا کی قومیں اس اُمت پر ٹوٹ پڑیں جبکہ اس کی اپنی حالت وہ تھی جو خس وخاشاک کی ہوا کرتی ہے۔

دشمن جو صدیوں سے اسی موقعہ کی تلاش میں تھے اور جن کی بابت خدا نے ہمیں خبردار کر رکھا تھا، اب چڑھ آئے:

| | |
|---|---|
| وَلَن تَرْضَى عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُم (البقرۃ:١٢٠) | یہود ونصاریٰ تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو |
| وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُواْ (البقرۃ:٢١٧) | وہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ ـــــ اگر ان کا بس چلے ـــــ تو تمہارے دین سے تم کو پھیر لے جائیں |

اب وہ آئے اور یہ تان کر آئے کہ اس بار وہ اس دین کا کام تمام کر دیں گے۔ محض اس دین کا 'اقتدار' ختم کر دینا اور اُمت پر 'غلبہ' پالینا ان کے پیش نظر نہ تھا۔

بے شک ان کا یہ مقصد اپنی ذات میں نیا نہ تھا...... کہ یہی وہ مقصد تھا جس نے ہرقل کو ابتدائے تاریخ میں اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ اس دین کو تاریخ کا کوئی بڑا واقعہ بننے سے پہلے ہی کچل کر رکھ دے...... اور یہی وہ مقصد تھا جس نے یورپ کے قرون وسطیٰ میں صلیبی جنگوں کو مہمیز دی تھی...... اور یہی وہ مقصد ہے جو آج ان کو متحرک کئے ہوئے ہے...... البتہ اس بار کی صلیبی یلغار میں جو کہ اس دور جدید میں جا کر ہوئی اور جو کہ دراصل مسلمانوں کو اسپین سے دیس نکالا دینے کے ساتھ ہی شروع کر دی گئی...... اس بار کی صلیبی یلغار میں نئی بات یہ تھی کہ ان کو بہت اعتماد تھا کہ جس مقصد کو لے کر یہ اس امت پر چڑھائی کرنے آئے ہیں ان کا یہ مقصد اس بار پورا ہو کر رہے گا۔ کیونکہ اس بار یہ دیکھ رہے تھے کہ اب کچھ جان لیوا روگ اس اُمت کے وجود کو کھا چکے ہیں اور یہ کہ اب ان کے پاس کچھ ایسے ہتھیار آ چکے ہیں جن کے مقابلے کیلئے یہ اُمت اب ہتھیار تیار نہیں کر پاتی۔ خواہ وہ جنگی ہتھیار ہوں یا سیاسی یا معاشی اور جن میں سب سے مہلک ہتھیار وہ ہے جسے ہم فکری یلغار کا نام دیتے ہیں اور جس کا ہدف یہ ہے کہ دلوں میں پائے جانے والے عقیدہ کے درخت کو جڑ سے ہی اکھاڑ ڈالا جائے...... جبکہ یہ وہ یادگار نصیحت ہے جو ان کو ان کا

بادشاہ لوئیس نہم (Luis IX) منصورہ (مصر) کی قید (دوراِیوبی) سے چھوٹنے کے بعد ان کو دے کر گیا، جس نے اس وقت یہ یادگار مقولہ کہا تھا کہ: "اگر تم مسلمانوں پر غلبہ پانا چاہتے ہو تو محض ہتھیاروں پہ سہارا نہ کرو۔ ہتھیاروں پہ سہارے کا نتیجہ تم دیکھ ہی چکے ہو۔ جنگ کرنا چاہتے ہو تو کسی طرح ان کے عقیدے کے خلاف کرو ان کی ساری قوت یہیں پر پوشیدہ ہے اور ہمیں سارا خطرہ یہیں سے ہے"......اگرچہ اس بار یہودی کید و مکر بھی ان کے ہمرکاب تھا اور جس کا مقصد دولت اسرائیل کا قیام تھا۔

واقعتاً یہ فکری یلغار وہ کچھ حاصل کرنے میں کامیاب رہی جس کے حصول میں آج تک ان کے سب ہتھیار ناکام رہے تھے......

جہاں تک شکست کا معاملہ ہے تو شکست مسلمانوں کو بہر صورت کوئی ایک ہی بار پیش نہیں آئی۔ تاریخ میں کئی بار مسلمانوں کو شکست ہو چکی ہے۔ مگر عسکری ہزیمت مسلمانوں کو کبھی اس حد تک متاثر نہ کر سکی اور نہ ہی ان کو ان کے عقیدہ سے دستبردار ہو جانے اور اس کو چھوڑ کر دوسرے نظریات تلاش کرنے پر آمادہ کر سکی۔

مسلمانوں کو صلیبیوں کے مد مقابل شکست ہوئی۔ تاتاریوں کے مقابلے میں شکست ہوئی۔ مگر ان کو اس خدائی آوازہ پر کبھی بے یقینی لاحق نہ ہوئی:

| | |
|---|---|
| وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (آل عمرن: ١٣٩) | دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو |
| وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (آل عمران: ١٤٦ـ ١٦٨) | کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے۔ انہوں نے کوئی کمزوری نہ دکھائی۔ وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہ ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دُعا تو بس یہ تھی کہ "اے ہمارے رب، ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے۔ ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔ آخر کار اللہ نے ان کو دُنیا کا ثواب بھی دیا اور آخرت کا حسن ثواب بھی۔ اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں"۔ |

تب تک یہ اس دین کی حقانیت پر ایمان سے دستبردار نہ ہوئے تھے۔ جانتے تھے کہ یہ معرکہ جہاد کا معرکہ ہے اور یہ راستہ خدا کا راستہ ہے...... چنانچہ کچھ ہی دیر میں یہ صف آرائی کر لینے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ خلفشار ہو جانے کے بعد ان کو پھر مجتمع ہو جانے میں دیر نہ لگتی۔ پستی چھوڑ کر پرعزم ہونے میں بہت وقت درکار نہ ہوتا۔ سستی و بے عملی چھوڑ کر تیاری کرنے میں ان کو ایسی دشواری پیش نہ آتی جو ناممکنات میں ہو۔ تب خدا اُن کو دُنیا کا اجر بھی دیتا اور آخرت کا حسن ثواب بھی۔

حتی کہ دورِ ہزیمت کے بدترین لمحات میں بھی کبھی ان پر یہ خیال نہ گزرا کہ ان کے دشمن ان سے بہتر ہیں! ان کے دشمن ان کی نگاہ میں خدا کے کافر تھے اور خود یہ مومن۔ اپنے برتر ہونے کی دلیل یہ اپنے ایمان کے اندر پاتے تھے چاہے میدان میں پانسہ ان کے حق میں پلٹے یا دشمن کی حق میں اور دشمن کی کمتری کی دلیل اس کے کفر میں پاتے تھے قطع نظر اس کے کہ مادی فتح ان کو نصیب ہوتی ہے یا دشمن کو۔

البتہ اس بار معاملے میں بہت فرق آ گیا تھا۔ اپنے ایمان کے بل بوتے پر اپنے آپ کو برتر جاننے کا احساس (ایک بڑی سطح پر) اس بار کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ دشمن کے بالمقابل یہاں ایک ذہنی شکست خوردگی تھی۔ چنانچہ دشمن کی فکری یلغار ایسی کامیاب رہی کہ کوئی اس کا تصور تک نہ کر سکتا تھا۔

صرف ایک ہی صدی کے اندر، بلکہ بعض خطوں میں تو صرف آدھی صدی کے اندر ہی، یہ اُمت مکمل طور پر تبدیل کر کے رکھ دی گئی۔ دیکھنے والے کو گویا اپنی نظروں پہ یقین بھی نہ آئے کہ کیا یہ وہی اُمت ہے جو کبھی اُمت اسلام کہلاتی تھی!

مصدرِ تلقی تبدیل ہوا۔ ذہن و شعور کو غذا کہاں سے ملے، اس کا مصدر اسلام نہ رہا۔ اس کا منبع اب خدا رہا اور نہ رسولؐ۔ شعور کو غذا اب یورپی تہذیب سے ملنے لگی تھی۔ آئیڈیل اب وہ ہو گیا تھا جس کو جس حد تک ہو سکے ذہنوں میں اتارا جانا تھا اور جہاں تک ممکن ہو اسی کا روپ دھارنا تھا۔ اب نفوس کے اندر خدا کا یہ فرمان کوئی بازگشت تک پیدا نہ کرتا تھا:

| | |
|---|---|
| أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ (المائدۃ: ۵۰) | تو کیا یہ جاہلیت کا دستور وفیصلہ چاہتے ہیں۔ جن لوگوں کا یقین اللہ پر ہے ان کیلئے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے |

اور تو اور یورپ کی 'تہذیب' کیلئے 'جاہلیت' کا لفظ استعمال کیا جانا حیران و ششدر کر دینے والی بات جانا گیا۔ جن لوگوں نے اپنی شناخت تک مغرب کے حوالے کر دی تھی ان کو یہ ایک گردن زدنی بات دکھائی دینے لگی۔ الٹا اسلام ان کی نگاہ میں رجعت، پسماندگی اور بربریت نظر آنے لگا۔ مسلمان عورت کا حجاب ان کو قید اور ظلمت دکھائی دینے لگا اور اس کا برہنہ ہو کر بازاروں میں پھرنا ترقی اور آزادی! کفر اور الحاد بکنا اور خدا کی کتاب اور رسولؐ کی سنت کا استہزاء کرنا 'آزادی فکر' کا معیار ٹھہرا۔ اسلام کو شعوری اور عملی طور پر خیر باد کہہ دینا اور اپنے فکر و عمل کے وجود کو مغرب سے وابستہ کر لینا غلاموں کے اس معاشرے میں ایک ایسی اعلیٰ بات اور ایک ایسی زبردست شناخت قرار پائی کہ اس پر صرف رشک ہی کیا جا سکے۔

اس کے بعد پھر نئے سے نئے سکول آف تھاٹ آنے لگے: وطنیت، قومیت، سیکولرزم، سوشلزم، ڈیموکریسی...... اور نا معلوم کیا کیا۔ سب اس لئے کہ یہ نظریات ایک ایک کر کے اسلام کا متبادل بنیں اور جس کو اسلام کا جو متبادل پسند آئے وہ اس کو اختیار کر لے...... اور پھر اس لئے بھی کہ اس اُمت کے جتنے چیتھڑے کئے جا سکیں کر دیئے جائیں اور دشمن اس اُمت کو، جو کبھی اسلام کے فکری و نظریاتی پرچم تلے متحد تھی اور دشمن کے راستے میں ناقابل تسخیر دیوار تھی، اب ایک ایک نوالہ کر کے کھائی جائے اور اس کے چھوٹے چھوٹے لقمے بآسانی ہضم ہوں۔ اندازہ کر لیجئے حالت گمراہی میں بھی اس کا ایک ہونا ان کو گوارا نہ تھا!

پستی کی یہ وہ حد تھی جس تک پہنچ رہنے کی اس اُمت کی تاریخ میں کبھی نوبت نہ آئی تھی۔ مگر حدیث میں جس چیز کو 'خس و خاشاک' کہا گیا جب وہ رو پذیر ہو گئی تو پھر یہ تو ہونا ہی تھا۔ اس کے سوا آپ توقع کر ہی کیا سکتے تھے!؟

☆☆☆☆☆☆☆

یہ ہے وہ منظر نامہ جس کا آج کی اس اسلامی بیداری کو سامنا تھا اور ہے......

رہی خود یہ اسلامی بیداری اور یہ تحریکی اٹھان تو یہ خدا کی جانب سے ایک مقرر شدہ واقعہ ہے جو ہر دشمن کے نہ چاہتے ہوئے بلکہ دشمن کے پورا زور لگا لینے اور تمام تر مکر و تدبیر کر لینے کے باوجود ہو کر رہا۔ حالانکہ دشمن نے 'اسلام' کو موت کی نیند سلا دینے کی اپنی طرف سے کوئی بھی کسر نہ چھوڑی تھی۔ **واللہ غالب علی امرہ ولکن أکثر الناس لا یعلمون** (یوسف:21) '*اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے، مگر*

اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں“ ۔

اس تحریکی بیداری کی توقع کوئی بھی تو نہ کرسکتا تھا، دشمن تو دشمن خود مسلمان ہی نہ کرسکتے تھے!

جہاں تک دشمنوں کا تعلق ہے تو وہ تو صرف ’مرد بیمار‘ کے وفات پا جانے کی ہی پیش بینی کررہے تھے، جیسا کہ خلافت عثمانیہ کیلئے ان کے ہاں یہ بطور لقب مستعمل تھا۔ وہ بھی یہی سہانے خواب دیکھ رہے تھے کہ اس مرد بیمار کو دفنانے کی دیر ہے وہ اس کا ترکہ آپس میں تقسیم کریں گے۔ اس کے حصے بخرے ہضم کریں گے اور اس کے ساتھ ہی یہ کھیل ہمیشہ کیلئے ختم ہوجائے گا اور اسلام کا قصہ تمام ہوجائے گا!

اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو مایوسی اور شکست خوردگی کی ایک ایسی کیفیت ان پر حاوی ہوچکی تھی اور ایک ایسی بھیانک صورتحال میں وہ اپنے آپ کو گھرا ہوا دیکھ رہے تھے کم از کم ان میں سے اکثر کی یہی حالت تھی کہ ان کی سوچ کی انتہا بھی اس سے آگے نہ جاتی تھی کہ دشمن کی یہ آہنی گرفت جوان کی گردن پہ آن پڑی ہے ذرا اگر کچھ نرم ہی ہوجائے اور اگر کچھ تھوڑے بہت ’حقوق‘ ہی مل جائیں اور بس اب زندہ ہی رہ لینے دیا جائے تو بڑی بات ہوچکا ہے یہ زندہ رہنا کیسی ہی رسوا کن شرطوں پر ہو......

مگر خدا کا یہ مقدر کیا ہوا وقوعہ جسے غالب آ کر رہنا تھا، اور اس کا وہ دائمی وعدہ کہ وہ اس اُمت میں ایسے افراد کھڑے کرتا رہے گا جن کے دم سے اس دین کی روح پھر سے زندہ اور تازہ ہو جایا کرے......خدا کی یہ تقدیر اور خدا کا یہ وعدہ آج کی اِس اسلامی بیداری کو ایک نا قابل یقین انداز میں پھر بھی نکال لایا اور دشمن کے سب مکروہ تدبیر اور منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے!

☆☆☆☆☆☆☆

## بعض موجودہ مناہج کا جائزہ:

آج ہم خدا کی اس تقدیر کا نظارہ کرتے ہوئے مستقبل کے افق پر امیدوں کی زبردست گھٹائیں دیکھ رہے ہیں اور خدا کے اس وعدۂ حق کو عمل پذیر ہوتا دیکھ کر اطمینان پا رہے ہیں کہ وہ اس دین کو ہر دین پر غالب رکھے گا۔ ہمارا یقین ہے کہ مستقبل اسلام کا ہے۔ هو الذی أرسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون (الصّف:۹) ”وہی تو ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کردے

*خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو'۔*

مگر ہماری بحث یہاں جس چیز سے ہے وہ ہے منہج عمل جو کہ آج کے اس تحریکی بیداری کے عمل کی اصل ضرورت ہے۔ انسانی زندگی میں خدائی تقدیر کے رو پذیر ہونے کیلئے انسانوں کو ہی 'عمل' کرنا ہوتا ہے، اس وجہ سے نہیں کہ خدا اپنی تقدیر کو کسی اور انداز میں رو پذیر کرانے سے عاجز ہے بلکہ اس وجہ سے خدا کی سنت کا کچھ یہی تقاضا ہے کہ انسانی دُنیا کے اندر انسان ہی بر سر عمل ہوں اور 'انسانوں' ہی کے پردے میں 'خدا کی تقدیر' رو پذیر ہو۔ **ذلک ولو یشاء اللہ لانتصر منھم ولکن لیبلوا بعضکم ببعض** (محمد: ۴) ''اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا، مگر (یہ طریقہ اس نے اس لئے اختیار نہیں کیا ہے) تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ آزمائے''۔ **ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا مابأنفسھم** (الرعد: ۱۱) *''کسی قوم کی حالت اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا یہاں تک کہ وہ خود اپنے نفوس کی حالت نہ بدلیں''۔*

تو پھر یہ منہج عمل کیا ہے؟

دین کا کام کرنے والوں کے ہاں کئی سارے طریقے اور اسلوب پائے جاتے ہیں۔ ہم ان میں سے ایک ایک کو اختصار کے ساتھ یہاں زیر بحث لائیں گے اور اس کے مالہ وما علیہ پر نظر ڈالیں گے۔ آیئے مل کر دیکھیں ان میں سے کون سا طریقہ زیادہ مؤثر وفائدہ مند ہے اور اس وقت کی صورتحال کے پس منظر میں جس کی ہم نے یہاں کچھ تشخیص کی ہے، ان میں سے کونسا اسلوب اُمت کے زیادہ مناسب حال ہے، آیا وعظ یا روحانی تربیت یا پھر جذبہ ابھارنے کا اسلوب یا پھر فکری پختگی پیدا کرنا اور یا جہادی تیاری؟

ایک بات ہم ابتداء میں کہتے چلیں کہ یہ سب مذکورہ بالا وسائل ہی اپنی اپنی جگہ مطلوب ہیں اور ان میں سے کسی ایک سے بھی استغنا ممکن نہیں۔ ہم جو گفتگو یہاں کریں گے وہ یہ نہیں کہ ان میں سے کس چیز کو چھوڑا جائے اور کس چیز کو اختیار کیا جائے؟ بلکہ ہم یہ جائزہ لیں گے کہ ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ کتنی افادیت ہے اور یہ کہ کسی طبقے کے ہاں اگر یہ سب کے سب وسائل کماحقہ استعمال ہوتے ہیں پھر تو الگ بات ہے، لیکن اگر ان میں سے کسی ایک پر ہی زور ہے...... یوں وہ ایک ہی اسلوب اس کے ہاں منہج اور طریق کار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور اس کے ماسوا اسالیب اس کے ہاں بڑی حد تک فروتر

ہیں تو تبدیلی لے آنے کے معاملہ میں، یہ منہج تنہا کہاں تک موثر ہوسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

سب سے پہلے ہم 'وعظ' پہ بات کرتے ہیں یعنی تقریریں، خطاب، جلسے اور اجتماعات وغیرہ۔ کیونکہ بہت سے لوگوں کے ہاں دین کے کام کی یہ صورت بہت زیادہ پسندیدہ سمجھی جاتی ہے۔ 'واعظ' سمجھتا ہے کہ جس قدر جذبے سے وہ خطاب کرے گا جس قدر اس کو اپنی بات پر یقین ہوگا اور جس قدر زبردست الفاظ وہ اپنی تقریر میں استعمال کرے گا اور جس قدر علمی بیان ہوگا اسی قدر سننے والوں پر اس کی تاثیر ہوگی۔ 'مقرر' کے اس وہم کو واقعہ خود ہی غلط ثابت کرتا ہے......

ہر جمعہ کو عالم اسلام میں براعظم تا براعظم تک کتنے ٹن وعظ القا کیا جاتا ہے!؟ اتنے خطبوں نے عالم اسلام کے اندر براعظم تا براعظم مسلمانوں کی حالت کو کہاں تک بدل دیا ہے؟!

اگر میں کہوں: ذرہ بھر بھی نہیں، تو کیا یہ خلاف واقعہ ہوگا؟

دعوت میں ''وعظ'' کا استعمال خدائی حکم ہے: ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة (النحل: ۱۲۵) '*اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ*'۔

مگر خدا نے یہ نہیں کہا کہ تنہا وعظ ہی دعوت کا طریقہ واسلوب ہے۔ نہ ہی خدا نے یہ کہا ہے کہ اگر تنہا یہی اسلوب اختیار کیا جائے تو سب مطلوبہ ثمرات حاصل ہو جائیں گے! خدائی منہج تو یہ ہے کہ 'وعظ کے ساتھ' دراصل ایک عدد ''رسول'' بھی آیا کرتا ہے جس کو نمونہ کی صورت دیکھنے کیلئے لوگوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جایا کریں۔ تب جا کر وہ 'اس' سے اس 'وعظ' کو سمجھیں اور پھر اس کے بعد اپنی دُنیا میں اس کے مضمون پر عمل پیرا ہوں:

كان خلقه القرآن ''آپؐ کا خلق قرآن تھا''۔

یا یہ کہ ''آپؐ چلتا پھرتا قرآن تھے''۔ یہ ہے وہ وصف رسول اللہ ﷺ کا جو عائشہؓ نے آپؐ کے طرز عمل کی بابت ہمیں بیان کر کے دیا ہے......

پس رسول اللہ ﷺ خالی خطیب نہ تھے جو منبر یا سٹیج پر سے بس خطبہ دے دیا کریں! اس سے

پہلے آپؐ ایک مربی تھے اور حقیقتِ دین کا ایک چلتا پھرتا نمونہ۔ اس سے پہلے آپ ایک دعوت اور ایک پیغام رکھتے تھے اور 'وعظ' صرف اس 'پیغام' کو لوگوں تک پہنچانے کے 'ذرائع' میں سے محض ایک 'ذریعہ' تھا...... اور تو اور صحابۂ کرامؓ کو یہ تشنگی محسوس ہوتی ہے کہ **یتخولھم بالموعظة** آپؐ ان کو وقفوں کے بعد ہی جا کر وعظ کرتے ہیں ادھر آپؐ کو خدشہ لاحق ہے کہ انہیں اس سے اکتاہٹ نہ ہو جائے! اُکتاہٹ بھلا کس شے سے؟ رسول اللہ ﷺ کے وعظ سے! اور کن کو؟ صحابہ کرامؓ کو! ان نفوس کو جو اس دہن مبارک سے نکلنے والے ایک ایک لفظ کیلئے بے تاب ہیں اور اس کیلئے رغبت اور عقیدت اور توجہ کی آخری حد تک چلے جانے پہ تیار۔ کیونکہ لسان نبوت سے عطا ہونے والا ہر لفظ ان کی نگاہ میں جنت کا یقینی راستہ ہے...... پھر ہم جیسے انسانوں کیلئے کیونکر اس بات کی گنجائش ہے کہ دعوت میں ہماری کل پونجی ہی بس وعظ اور تلقین اور ارشاد ہو!

حتی کہ اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ وعظ اور ارشاد کا لوگوں پر بہت اچھا اثر ہو رہا ہے اور اس سے وہ 'اکتاہٹ' بھی نہیں ہو رہی، جو کہ ویسے ایک غلط مفروضہ ہے، تو بھی کیا وعظ اور ارشاد تنہا وہ سب گہرے اور دیرینہ روگ دور کر سکتا ہے جن کا اس سے پہلے ہم کچھ ذکر کر آئے ہیں اور جو کہ اُمت کے وجود کے اندر بُری طرح سے سرایت کر چکے ہیں اور مغربی یورش سے ماقبل زمانے سے لیکر آج تک چلے آرہے ہیں؟

خطبوں سے کیا اس ارجائی فکر کا خاتمہ ہو جائے گا جو عمل کو ایمان کے مفہوم سے ہی خارج کئے بیٹھا ہے اور جس نے کئی صدیوں سے لوگوں کو اس وہم میں مبتلا کر رکھا ہے کہ اگر وہ اسلام کے کسی ایک بھی حکم پر عمل پیرا نہ ہوں پھر بھی رہیں گے وہ 'ایمان والے' ہی! کیا اکیلا 'وعظ' ان کی حالت بدل دے گا اور ان کو ایمان کے تقاضوں پر عمل پیرا کرا دے گا...... عمل کے ان سب تقاضوں سمیت جن میں دین کیلئے محنت بھی آتی ہے جدوجہد بھی، مشقت سہنا بھی، ذمہ داریاں اٹھانا بھی، اجتماعی اُمور کی پابندی بھی اور ڈسپلن بھی!؟

'وعظ' سے اگر یہ سب کچھ ہو سکتا ہے تو پھر ہو کیوں نہیں رہا؟ ہم ہر جمعہ 'وعظ' میں کوئی کسر تھوڑی چھوڑتے ہیں۔ وعظ کے دیگر مواقع اس کے علاوہ اور ریڈیو اور ٹی وی کا وعظ اس پر مستزاد!

اکیلا وعظ کیا صوفیت میں ڈوبے ہوؤں کو نکال لائے گا اور وہ لوگ جو درگاہوں اور آستانوں سے تبرک پاتے ہیں اور اولیاء کے کشف غیب پر قدرت رکھنے کے معتقد ہیں اور کرامات کے نام پر عجیب وغریب کہانیوں کو دین سمجھتے ہیں...... اکیلا وعظ کیا ان سب انحرافات کا شکار ہو جانے والوں کو بدل ڈالے گا؟!

لوگ آج جس بدنظمی اور بے ہنگم طرز عمل پہ زندگی گزار رہے ہیں ڈسپلن سے کوسوں دور تیاری اور منصوبہ بندی کے ساتھ کام کرنے پر کبھی تیار نہ ہونا جو بھی کریں عین وقت آ پڑنے پر کریں۔ یہ آناً فاناً کی ذہنیت اور پھر لمبا نہ چلنے کی وہ نفسیات جو پل میں مشتعل ہو کر سب کچھ کر گزرنے پہ تیار ہو جائے تو پل میں بجھ کر رہ جائے...... یہ سب روگ کیا 'وعظ' سے دور ہو جائیں گے؟

ملازم دفتروں میں جس کاہلی اور کام چوری کے عادی ہیں، معاملات کو دیانت کے ساتھ اور وقت پہ انجام دینے پہ تیار نہیں، صرف تنخواہ حلال کرنا جانتے ہیں کہ بس وقت پہ حاضری لگوا لیں اور وقت پہ چھٹی کر جائیں بلکہ تو حاضری اور چھٹی بھی وقت پہ ضروری نہیں! ابھی اس غبن اور خرد برد اور رشوت ستانی کا تو ذکر ہی نہیں جو حد سے بڑھی ہوئی ہے...... کوئی سر پر نہ ہو تو خود ذرہ بھر ہاتھ ہلا کر راضی نہیں اور کام میں اخلاص اور دل لگی کا تو خیر تصور ہی کیا، البتہ تنخواہ پوری لینے پہ ملال تک نہیں بلکہ تنخواہیں بڑھانے کے مطالبات ہی ہر وقت زبان پر ہوں گے...... علاوہ ازیں لوگوں کے یہ معمولات کہ وعدے کا پاس نہیں حتی کہ اس پر دل میں کوئی خلش یا قصورواری کا احساس تک نہیں، کسی کو وقت دیا اور منٹوں کے حساب سے نہیں گھنٹوں کے حساب سے تاخیر کی بلکہ معاملہ دنوں اور ہفتوں تک پہ چلا گیا یا پوری زندگی ہی وعدہ وفا نہ ہوا، افسوس یا ندامت کا ذرہ بھر دِل میں نہ آئے...... کیا یہ سب بیماریاں 'وعظ' کرنے سے چلی جائیں گی؟

وغیرہ وغیرہ وغیرہ......

☆☆☆☆☆☆☆

واعظ حضرات فرمائیں گے: وعظ کے سوا اور آخر ہم کر کیا سکتے ہیں؟ ہمارے حصہ کا کام تھا وہ ہم نے کر دیا۔ اب کسی کو ہدایت نہیں آتی تو ہم کیا کریں ہدایت ہمارے ہاتھ میں تھوڑی ہے وہ تو خدا کے ہاتھ میں ہے؟

ہدایت بالکل خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مگر خدا نے دعوت کا اور معاشرے کو تبدیل کرنے کیلئے محنت اور جدوجہد کا ایک منہج بھی تو رکھا ہے جس کی اساس اسوہ اور تربیت ہے۔ اس کے وسائل میں سے ایک 'وعظ' بھی یقیناً ہے مگر وعظ جب اس کی پشت پر اسوہ اور تربیت ہو۔ تب خدا کے فضل سے وعظ ثمر آور بھی ہوگا۔

ان سب باتوں کے باوجود ہم یہ نہیں کہتے کہ معاملہ اگر صرف وعظ تک محدود ہو تو اس کا ذرہ بھر فائدہ نہیں۔ حاشا وکلاّ۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ وعظ اکیلا زیادہ سے زیادہ فائدہ مند ہوسکتا ہے تو وہ اس حد تک کہ بس کچھ 'افراد' کی اصلاح کر دے، رہا یہ کہ وعظ وخطاب کا یہ اسلوب معاشرہ بدل ڈالے اور اُمت کی کایا پلٹ دے جبکہ خرابی معاشرے میں اس سطح کو پہنچ چکی ہو جس پر ہم اُسے اس وقت دیکھ رہے ہیں، یہ ممکن نہیں۔ یہ اسلوب ایک ایسی دعوت کھڑی کر دینے سے بہرحال عاجز رہے گا جس کا مشن یہ ہو کہ یہ اُمت جس کی نوبت حدیث کے الفاظ میں 'خس وخاشاک' تک آ چکی ہے اس کی اب ایک باقاعدہ تعمیر نو کر دی جائے!

☆☆☆☆☆☆☆

'روحانی تربیت' ایک اہم ترین ضرورت ہے اور تعمیر کے اس عمل میں اس سے ہرگز کوئی استغنا نہیں...... بلکہ یہ تصور کیا ہی نہیں جا سکتا کہ کوئی دعوتی عمل اس کے بغیر پروان چڑھ لے۔ یہاں روحانی تربیت سے ہماری مراد ہے خدا کے ساتھ تعلق مضبوط کرانا۔ دِل میں خدا کیلئے رقت اور اخلاص پیدا کرنا۔ یوم آخرت کو ذہن اور شعور کے اندر بٹھار کھنے کی محنت کرانا اور اس لمحے کو آدمی کے خیالات و احساسات کا محور بنا دینا جب وہ خدا کے سامنے کھڑا ہوگا...... یہ بات رسول اللہ ﷺ کی اس تربیت میں جو آپؐ نے اپنے اصحاب کو دی، بے انتہا نمایاں نظر آتی ہے، خصوصاً مکہ میں جب ان پر قیام اللیل فرض تھا کہ وہ خدا کے ساتھ اس تعلق کو پختہ سے پختہ تر کر لیں۔ مگر یہ سب کچھ دراصل کسی اور بات کی تیاری تھا۔ یہ فی ذاتہ 'آخری منزل' نہ تھی!

آپ سورۂ مزمل پہ غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جہاں قیام اللیل کی ہدایت کی جا رہی ہے عین وہیں پر واضح انداز میں ایک اور اشارہ بھی کر دیا جاتا ہے...... ان 'بھاری ذمہ داریوں' کی طرف جو عنقریب

آ پڑنے والی ہیں۔ قیام اللیل کو دراصل اس کی ایک مضبوط بنیاد بنایا جا رہا تھا اور اس مرحلہ میں پورا اترنے کیلئے اہلیت پیدا کرنے کی ایک صورت:

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا نِصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (المزمل: ١-٥)

اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے، رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم، آدھی رات، یا اس سے کچھ کم کرلو، یا اس سے کچھ بڑھا دو اور قرآن کو خوب ہی ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ یقیناً ہم تم پر بہت بھاری بات عنقریب نازل کرنے والے ہیں

تب غور کرنے پر خدا کی وہ حکمت بھی آپ پر کھلتی ہے جو قیام اللیل کو نفس مومن کے اندر اس خاص اہلیت کے پیدا کر دینے کا ایک ذریعہ بناتی ہے جو کہ زمین میں مومن کا کردار ادا کرنے کیلئے مطلوب ہے:

اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئاً وَأَقْوَمُ قِيلًا (المزمل: ٦)

درحقیقت رات کا اٹھنا (نفس کو) دبا لینے میں شدید تر ہے اور بات کو بہت درست کر دینے والا ہے

أشد وطئاً یعنی یہ نفس کو کوٹ کوٹ کر ایک خاص چیز بنا دینے اور ایک ایسی زمین تیار کر دینے والا ہے جس پر ذمہ داریاں اور فرائض دھرے جا سکیں۔

غرض خدا کے ساتھ تعلق کے اندر یہ پختگی اور گہرائی بطور خاص مطلوب ہے تا کہ انسان وہ چیز بن سکے جس پر دین کے وہ سب بھاری بھر کم فرائض شریعت جب چاہے لاد سکے اور وہ ذمہ داریاں باحسن اسلوب اس کو اٹھوائی جا سکیں جو اس راستے کا لازمہ ہیں۔ خصوصاً وہ فرائض اور ذمہ داریاں جو جہاد اور آزمائشوں میں صبر واستقامت سے متعلق ہیں۔

رہی وہ روحانیت جو خود ہی اس راستے کی آخری منزل بن جائے...... رہی وہ 'قلبی' ترقی جو اس گاڑی کا 'آخری سٹیشن' ہو اور تربیت کے عمل میں نفوس کو دینے کیلئے اس کے ماسوا کچھ نہ رہ گیا ہو تو اس صورت میں کیا یہ روحانیت وہی روحانیت ہوگی جو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کے نفوس کے اندر پھونکی تھی؟ گو تشبیہ میں کچھ فرق ہے مگر یہ گویا ایسے ہی ہے کہ آپ ایک سپاہی کو عسکری تربیت تو خوب دیں مگر اسے کسی معرکہ میں بھیجنا کسی پروگرام کا حصہ ہی نہ ہو! یا پھر کسی بنیاد کو آپ کوٹ کوٹ کر پختہ کر دیں مگر اس پر کوئی عمارت اٹھانا سرے سے پیش نظر نہ ہو!

اس دین کا معاملہ بے حد عظیم الشان ہے۔ یہ وہ خدائی منہج ہے جو زندگی کے پورے کے پورے دھارے کو بدل دینے اور اصلاح کر دینے کیلئے آیا ہے اور اس پائے کا ایک صالح انسان پیدا کرنے جس کے بل پر زمین میں خلافت راشدہ کی سطح کا اجتماعی انتظام ممکن ہو...... یہ محض کوئی روحانی پرواز نہیں۔ یہ محض کوئی 'اشراقات' نہیں۔ یہ محض پر کیف، احساسات اور پر جذب مقامات کا لطف نہیں چاہے یہ احساسات اور مقامات کتنے ہی اعلیٰ پائے کے کیوں نہ ہوں...... یہ تو ایک سر توڑ محنت اور جہد کا نام ہے۔ یہ تو جہاد کا راستہ ہے۔ باطل کے ساتھ جنگ اور کشمکش میں آخری حد تک جان لڑا دینے کا مشن ہے۔ عمل اور جہاد کی ایک ایسی ڈائینا مک جہت ہے جو باطل کے انہدام اور معاشرے میں حق کے ناقابل تسخیر قلعے کھڑا کرنے سے کم کسی چیز پہ قانع ہی نہ ہو...... 'روحانی تربیت' اس عمل کی اساس اور غذا ہے نہ کہ اس راستے کی سب سے آخری منزل۔

باطل کے ساتھ جنگ میں انسان کتنی ہی بار لڑکھڑاتا ہے۔ شکستہ حال ہو جاتا ہے۔ ہمت ساتھ چھوڑنے لگتی ہے۔ اس کو اس سہارے کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے گرنے سے پہلے سنبھال لے اور بیٹھتے ہوئے کو اٹھا دے۔ بے ہمتی کے حملوں سے اس کا تحفظ کرے...... یہاں، وہ روحانی قوت اور توانائی ہمارے سامنے آتی ہے جو ہر بار اس کے ایمانی وجود میں زندگی کی رمق بن کر دوڑ جایا کرے۔ جو اس کو ایمان پر ڈٹ جانے اور جم جانے میں مدد دے اور حق پر استقامت میں اس کی مددگار ہو...... اور اس کیلئے راستے کے اندر چلتے ہوئے قلب کی دُنیا میں روشنیاں کئے رکھے۔

باطل کے ساتھ جنگ میں انسان کسی وقت خوف اور اندیشوں کا شکار ہو جاتا ہے، خصوصاً جب دُنیا دشمنوں سے بھری ہو اور وہ خود کو ان کے مقابلے میں تنہا پائے یا پھر اپنے ساتھ کھڑے ہوؤں کو اپنے ہی جیسا مستضعف اور بے بس پائے جو اسے نصرت دینے سے عاجز ہوں...... یہاں وہ روحانی قوت اور توانائی ہمارے سامنے آتی ہے جس کی بدولت یہ خدا کا اُنس پاتا ہے تو پھر اس کا سب خوف اور وحشت چلی جاتی ہے...... جس کی بدولت یہ آخرت کے وہ پکے ہوئے ثمر اسی دُنیا میں دیکھنے لگتا ہے جو اس کی سعی کو ایک نئی مہمیز دے دیں۔

باطل کے ساتھ جنگ میں انسان دنیوی آسائشوں کا فقدان پاتا ہے۔ قبیلہ وخاندان اور دوستوں مددگاروں کی چہل پہل نہیں دیکھتا۔ آرام دہ بستر اور کام ودہن کی لذت کی اس راستے میں چلنے

والے کیلئے کوئی ضمانت ہی نہیں۔ انسان کو یہاں یہ سب کمیاں دیکھنے کو ملتی ہیں یا مل سکتی ہیں۔ زمینی لطف اور مفاد اپنی ایک کشش رکھتے ہیں اور اس کے پاؤں کی زنجیر بننا چاہتے ہیں...... یہاں وہ روحانی توانائی ہمارے سامنے آتی ہے جو زمین کی اس کشش ثقل کے مخالف سمت میں ایک کشش پیدا کر کے اس کے وجود کو ایک خاص توازن دیتی ہے۔ مادی محرومیتوں کے عوض اسے ایک نہایت اعلیٰ جنس کی دولت بخشتی ہے اور اس کے ذریعے یہ سب نقصانات پورے کروا دیتی ہے۔ یہ خدا کی معیت ہے اور خدا کا اس سے خوش ہو جانے کا احساس اور خدا کا وعدۂ جنت۔

یہ دراصل ایک ایسا زاد راہ ہے جسے لے کر انسان صحیح سالم راستے کی سب مسافت طے کر لے......لیکن اگر انسان کو 'بیٹھا' ہی رہنا ہے اور راستے کی 'مسافت' طے ہی نہیں کرنی تو پھر اس 'زاد' کی بھی کیا حقیقت!؟

تو کیا یہ روحانی ترقی تنہا اس بات کیلئے کافی ہے کہ اُمت کو اس تبدیلی سے ہمکنار کر دے جو اس کو انحطاط کے اس درجہ اور اس کیفیت سے نکال لائے؟

بلاشبہ یہ کچھ افراد کو ضرور آج کی اس تباہ کن سرگردانی سے رہائی دلا سکتی ہے اور ان کے گرد کچھ ایسی شعوری فصیلیں کھڑی کر سکتی ہے جو ان کو کھلی کھلی بربادیوں سے تحفظ دے سکیں مگر اُمت کی سطح پر جو سرگردانی آج پائی جاتی ہے اور معاشرے کی سطح پر جو انحراف اس وقت دیکھا جا سکتا ہے اس کے مقابلے میں یہ بے اثر ہی رہے گی۔ یہ وہ سپاہ تیار نہیں کر رہی جسے یہ جنگ کے میدان میں لے کر اترے اور اپنے جانبازوں کو اس 'تدافع' میں شریک کرائے جو کہ از روائے قرآن فساد سے زمین کے تحفظ کیلئے ایک خدائی سنت ہے:

| | |
|---|---|
| وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَـٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ (البقرة: ۲۵۱) | اگر ایسا نہ ہوتا کہ اللہ بعض انسانوں کو بعض انسانوں سے دفع کروایا کرے تو زمین کا نظام بگڑ جاتا مگر اللہ دُنیا والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے |

☆☆☆☆☆☆☆

'جذبات جگانا' دعوتی عمل کے اندر بلاشبہ مطلوب ہے۔ ضرورت ہے کہ لوگ جس چیز پر ایمان رکھتے ہوں، اس کیلئے جوش اور غیرت کھائیں اور کاٹھ کی بے جان مورت نہ ہوں جو غضبناک ہونا جانیں اور نہ کسی بڑے سے بڑے واقعے پر ٹس سے مس ہونا۔ ایسے لوگوں کے بل پر ہرگز دعوت نہ پھیل پائے گی

چاہے وہ کتنے ہی دیندار اور 'باشرع' کیوں نہ ہوں...... مگر جذبہ وحمیت تنہا وہ چیز نہیں جو آپ کو کسی کنارے پہنچا دے۔ حتی کہ بعید نہیں یہ فائدے سے زیادہ نقصان دہ ہو۔ کیونکہ جوش عموماً ہوش کی قیمت پہ ہوتا ہے۔ جذبات عموماً وہاں دیکھے گئے ہیں جہاں علمِ صحیح وراسخ روپوش ہو۔ 'زور' عموماً وہاں دیکھنے میں آیا ہے جہاں تجربہ کاری کا فقدان ہو۔ پس جہاں یہ صورتحال ہو وہاں 'جوش وجذبہ' اپنے وہ بہت سے خوبصورت امتیاز کھو دیتا ہے جن سے کہ دراصل اس کو مزین رہنا ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ 'جوش وجذبہ' کی خوبیاں باقی نہیں رہتیں بلکہ اس کے نقصان دہ اثرات سامنے آنے لگتے ہیں خصوصاً اگر یہ 'جوش وجذبہ' ایک عصبیت اور حزبیت کی صورت دھارنے لگے۔ خواہ یہ عصبیت ایک خاص شخص کیلئے ہو یا خاص جماعت کیلئے یا خاص طبقے اور حزب کیلئے یا کسی خاص نظریے کیلئے یا کسی خاص مسلک یا مذہب کیلئے۔ تب یہ 'جوش وجذبہ' آدمی پر وہ سب راستے بند کر دیتا ہے جن سے کوئی نفع بخش دانائی کبھی اس کے در تک راہ پا سکتی ہو۔ تب ضد اور جھگڑے کی نوبت آتی ہے اور بات بات پر الجھنے کی اور اس بحث وجدال کی جو دین کے اندر حد درجہ مذموم ہے۔

اس وقت دینی کام کے میدان میں جو تفرقہ وانتشار اور سلسلہ ہائے مخاصمت دیکھنے میں آرہے ہیں اور چھوٹی چھوٹی جماعتیں بن رہنے کا جو رجحان ملاحظہ کیا جا رہا ہے اور ایک دوسرے ہی کے خلاف تنقید اور تنقیص کے محاذ سرگرم دیکھے جا رہے ہیں...... زیادہ تر اس کی تہہ میں ہمیں جوش وجذبہ کی وہ صورت نظر آتی ہے جو اپنی اصل جگہ چھوڑ بیٹھتی ہے اور اپنی حد سے تجاوز کر جاتی ہے، جس کے تحت آدمی سمجھتا ہے کہ جس چیز پر اس کا اعتقاد ہے وہ مطلق حق ہے اور اس کے ماسوا ہر چیز مطلق باطل!

☆☆☆☆☆☆☆

'فکری پختگی' ہر دور کے اندر ہی دعوت کے اخص الخاص لوازم میں سے ایک ہے۔ البتہ ہمارے اس دور میں تو یہ کسی بھی دور سے بڑھ کر ضروری ہے کیونکہ غموض اور ابہام اور جہالت کی جس دھند نے اسلام کی صورت آج ڈھانپ رکھی ہے اور لوگوں کے نفوس میں اسلام کے اصل حقائق کو روپوش کرا دیا ہے اور جس کے باعث اسلام کو آج اس غربت ثانیہ کے دور کا سامنا ہے...... دھندلاہٹ کی نہ صرف یہ ایک ایسی دبیز اور کثیف تہہ ہے جس کو ہٹانا آسان نہیں بلکہ یہ اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ اس نے اسلام کے 'بعض' نقوش نہیں قریب قریب 'سب' نقوش چھپا دیے ہیں۔ جس کے باعث آج یہ ضرورت آن ٹھہری

ہے کہ اسلام کے اصل حقائق اور مفہومات کی ایک وسیع اور مکمل محیط تفہیم ہی از سرِ نو کرائی جائے۔ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰہ کے مفہوم سے لے کر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ کے تقاضوں تک پر لوگوں کے اذہان کو مرکوز کرا کر رکھ دیا جائے۔

لَآ اِلٰـهَ اِلَّا الـلّٰہ کے سب نواقض پھر سے ایک ایک کرکے پڑھائے جائیں اور یہ سب اسباق بار بار دہرائے جائیں۔ کیونکہ اس اوجھل پن کی زد میں جس قدر لَآ اِلٰـهَ اِلَّا الـلّٰہ کا مفہوم آیا ہے اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ کے تقاضے اور لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰہ کے نواقض اس کی زد میں آئے ہیں مفاہیمِ اسلام کا کوئی اور پہلو اس اوجھل پن کا اس شدت کے ساتھ شکار نہ ہوا ہوگا۔ گو اسلام کے سب کے سب مفہومات ہی برابر کے ضرورت مند ہیں کہ ان کو ذہنوں میں پختہ وراسخ کر دیا جائے۔ خواہ وہ عبادت کا درست مفہوم ہو خواہ وہ قضا وقدر کا، خواہ دنیا و آخرت کی سعی کا، خواہ تعمیر ارض کا، خواہ تربیت کا مفہوم ہو اور خواہ جہاد کا مفہوم......

ایک طرف اسلام کے یہ مفہومات ہیں جو ذہن وفکر کی پختگی کا ایک زبردست میدان ہیں تو دوسری طرف اُمت کی حالت موجودہ کی تشخیص کا علم ہے اور ان اسباب کا احاطہ جو اسے اس حالت کو پہنچا دینے کا باعث بنے۔ فہم وفکر کے اس پہلو میں پختگی پیدا کئے بغیر بھی ہم قاصر ہی رہیں گے کہ آج دعوتی عمل کیلئے کوئی لائحۂ عمل وضع کرسکیں۔ مرض کی گہرائی سے ناواقف رہیں گے تو سطحی تدبیریں ہی کرتے رہیں گے اور علاج کے صحیح ذرائع تک رسائی نہ کر پائیں گے۔ اُمت کا معاملہ آج جس صورتحال سے دوچار ہے بہت کم لوگ ہیں جو اس کی اصل حقیقت کا ادراک رکھتے ہوں۔ بیشتر لوگ اس کے ادراک سے قاصر ہیں بے شک وہ اجمالی طور پر جانتے ہوں کہ اُمت آج اس حالت پر نہیں جس پر اسے ہونا چاہیے اور بے شک وہ یہ بھی مانتے ہوں کہ اس صورتحال کا باعث اُمت کے ایک بڑے طبقے کا اسلام کی حقیقت سے نا آشنا رہنا ہے مگر یہ کہ یہ 'نا آشنائی' کس سطح کی ہے اور اس کی گہرائی کہاں تک جاتی ہے، یہ بات چارہ گروں کی اکثریت پر آج مخفی ہے۔ اُمت کا 'اس حالت پر نہ ہونا جس پر اسے دراصل ہونا چاہئے' آج کس درجے اور کس نوعیت کا ہے اور اس مسئلے کی نزاکت اور سنگینی کی کیا کیا جہتیں ہیں، اصل سوال یہ ہے اور اس کا جواب دینے پر یہاں کے اکثر معالج قدرت نہیں رکھتے!

پھر اس ذہنی وفکری پختگی کا ایک تیسرا پہلو ہے اور وہ ہے دشمن کی پہچان۔ اعداء کا وہ کید ومکر اور ان کے وہ منصوبے جو وہ اسلام کو روئے زمین سے مٹا دینے کیلئے اپنائے ہوئے ہیں...... اس کید ومکر کے حجم

اور نوعیت اور انکے طریقہ واردات کی بابت بصیرت۔ آج لوگوں کی اکثریت بلکہ داعیوں کی اکثریت واقعات کی ان سب کڑیوں کو ملانے سے قاصر ہے جو اس عالمی اور علاقائی منظرنامے کی اصل تصویر دکھانے کیلئے ملائی جانا ضروری ہیں۔ سازشیں جو نئے سے نئے پینترے بدلتی ہیں اور حیلے ہتھکنڈے ہاتھ کی جس صفائی سے پیش آتے ہیں اکثر لوگ بلکہ اکثر داعی ان کی نوعیت جاننے سے قاصر ہیں بے شک وہ عمومی طور پر یہ جانتے ہی ہوں کہ 'یہود ونصاریٰ ہمارے دشمن ہیں'، اور یہ کہ 'وہ اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں سے کبھی نہ رکیں گے'! صرف یہ جاننا کافی نہیں! بہت سے پھندے جن میں اسلامی جماعتوں کو دھیرے دھیرے غیر محسوس انداز میں کھینچ لایا جاتا ہے اور وہ بہت سے مواقف جن کو اپنانے کی جانب دینی جماعتوں کو 'راہ' دکھائی جاتی ہے اور جو کہ دعوت کیلئے بعد ازاں بے حد ضرر رساں ثابت ہوتے ہیں اس کا سبب داعیوں اور قیادتوں کی وہ لاعلمی ہے جو ان کو دشمن کے حیلہ ومکر کی حقیقت اور نوعیت کی بابت لاحق ہے۔ جبکہ اعدائے اسلام اپنے ذرائع اور وسائل سے کام لے کر اسلام پسندوں کی سب سرگرمیوں سے مطلع رہتے ہیں اور مسلسل پوری دقت کے ساتھ اس بات پر نظر رکھتے ہیں کہ عالم اسلام میں کس کس قسم کی پیش رفت ہو رہی ہے اور کس کس طرح کے افکار اور تحریکیں جنم لے رہی ہیں۔ وہ بڑی ہوشمندی کے ساتھ منصوبے بناتے ہیں اور ہمیں تب پتہ چلتا ہے جب 'چوٹ' پڑتی ہے!

درست ہے کہ اس فکری پختگی کا پیدا کیا جانا آج اس وقت دعوت کے اخص الخاص لوازم میں سے ایک ہے۔ لیکن یہ 'فکری پختگی'' اکیلی کافی نہیں کہ تحریک کی دُنیا میں کوئی حقیقی تبدیلی لے آئے۔ اس فکری پختگی کا جو کردار ہوگا وہ یہ کہ یہ راسخ عقیدہ کے ہمراہ میدان میں اترے اور ایک ہوشمند تحریک کا زادراہ بنے۔ 'تحریک' کی ضرورت اپنی جگہ برقرار ہے۔ اسے جو کام کرنا ہے وہ یہ کہ یہ تحریک کا راستہ روشن کرے، اس میں بصیرت کی جوت جگائے اور راستے کی رکاوٹوں کو اس پر واضح کرے۔ رہا یہ کہ جب یہ 'فکر' محض ایک 'ذہنی عمل' بن کر رہ جائے اور معلومات کا انبار بن جائے تو پھر یہ ایک ذہنی عیاشی ہے جس کو نفوس کے اندر کوئی ہلچل مچانا ہے اور نہ دُنیائے واقع کے اندر کوئی انقلاب برپا کرنا۔

☆☆☆☆☆☆☆

'جہادی تربیت' بلاشبہ تحریک کے لوازم میں سے ایک ہے۔ سہل مزاج طبعتیں جو مجاہدانہ جفاکشی کی خوگر نہ ہوں دعوت کا بار نہیں اُٹھا سکتیں۔ ان کانٹوں کے بیچ سے نہیں گزر سکتیں جو دعوت کی راہ میں بچھا

دیے جاتے ہیں۔ ان وحشی درندوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتیں جو داعیوں پر خونخوار انداز میں غراتے ہیں اور جب بھی موقعہ ملے ان پر بے دردی سے جھپٹتے ہیں اور ہزار انداز سے ان پر ستم ڈھاتے ہیں۔

مگر یہ مجاہدہ اور جفاکشی کی یہ تربیت اور یہ سخت کوشی اور یہ جرات اقدام تنہا اس بات کیلئے کافی نہیں کہ یہ ایک دعوت کھڑی کر دے۔ بلکہ یہ تنہا اس امر کیلئے بھی کافی نہیں کہ یہ دشمنوں سے دعوت کا تحفظ کر دے۔ بسا اوقات تو یہ دشمن کو ایک زیادہ بڑی اور زیادہ بہیمانہ کارروائی کرنے پر ابھارتی ہے خصوصاً اس وقت جب اس مجاہدہ اور جرات اقدام میں سیاسی بصیرت اور تحریکی پختگی کی کمی ہو اور جب اس چیز کا فہم نہ پا یا جائے کہ اس کشمکش میں پورا اترنے کیلئے جہد کی نوعیت دراصل ہے کیا۔

سب سے خطرناک بات جو ان تحریکوں سے کسی نہ کسی وقت سرزد ہو جاتی ہے جن کا کل زور جہادی تربیت پر ہی ہوتا ہے یا پھر یہ کہ وہ تربیت کے اس پہلو پر توجہ کچھ اس قدر زیادہ مرکوز کراتی ہیں کہ تربیت کے باقی سب پہلو حاشیائی ہو جاتے ہیں...... وہ سب سے خطرناک بات جو ان تحریکوں سے سرزد ہو جاتی ہے یا ہو سکتی ہے وہ یہ کہ معاشرے کے اندر یہ 'تصادم' کا راستہ جا اختیار کریں یا پھر یہ کہ ایک غیر محسوس طریقے سے ان کو 'تصادم' کی جانب کھینچ لایا جائے جبکہ 'باعثِ نزاع' اور 'موضوعِ کشمکش' ابھی عین نکھر کر سامنے آیا ہی نہ ہو اور جو کہ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ کا بنیادی قضیہ ہے اور جبکہ سبیل المجرمین ابھی واضح ہی نہ ہوا ہو جیسا کہ کتاب اللہ میں بات کی گئی ہے۔[1] تب اس بات کا موقعہ اٹھا کر دعوت پر ایک کاری ضرب لگائی جاتی ہے اور لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں کہ 'ہوا کیا ہے' جبکہ ضروری یہ ہے کہ کشمکش کا عنوان ہر کس و ناکس کو معلوم ہو اور کسی کیلئے یہ 'سمجھ سے باہر' نہ ہو کہ دو فریقوں میں کس بات پر ٹھنی ہوئی ہے۔ تب ہی طاغوتوں کو 'عوام' کو بے وقوف بنانے کا موقعہ ملتا ہے کہ 'ہم اسلام کے خلاف نہیں 'دہشت گردی' کے خلاف برسرِ جنگ ہیں'!

☆☆☆☆☆☆☆

یہ وہ سب وجوہات ہیں جن کے باعث ہمیں اصرار ہے کہ یہاں ایک ایسے تربیتی عمل کی ضرورت ہے جو اپنی ایک مدھم رفتار میں آگے بڑھے مگر ہو وہ اس قدر وسیع کہ تربیت کے ان سب جوانب پر محیط ہو...... جو سب سے پہلے وہ 'بنیادی ایمانی جمعیت' پیدا کرے جو کہ اس عمل کا نقطۂ اساس

(۱) سبیل المجرمین کے واضح ہو جانے کا مبحث ملاحظہ فرمایئے اس کتاب کی فصل ''اسلام کی پہلی کھیپ کیونکر برآمد ہوئی'' میں

ہے اور پھر آہستگی مگر پوری جان کے ساتھ 'توسیعِ جمعیت' کرنے پہ لگ جائے۔ اس پورے عمل میں کئی نسلیں بھی لگ جائیں تو کوئی بڑی بات نہیں!

اصل بات دیکھنے کی یہ ہوگی کہ 'چیز' کیسی تیار کی جارہی ہے اور وہ ہے کتنی ضروری۔

بیماریوں کا وہ پورا مجموعہ جو اس اُمت کے وجود کو لاحق ہو چکا ہے اور جس نے اس کو 'سیل آب کے خس وخاشاک' کی نوبت کو پہنچا دیا ہے، اور پھر اس نوبت کو پہنچا دینے کے بعد صدیوں کے دشمن کو 'کھانے کے اس تھال' پر ٹوٹ پڑنے کی دعوت دی ہے...... بیماریوں اور روگوں کا یہ پورا مجموعہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے کہ اس کا کچھ سطحی سا علاج کر دیا جائے۔ نرا وعظ، محض روحانی تربیت، محض جذبہ جگا دینا، محض فکری پختگی پیدا کرتے رہنا، صرف جہادی تربیت...... ان میں سے کوئی ایک علاج ایسا نہیں جو تنہا اس مریض کو شفایاب کرا لائے۔ ان میں سے جس چیز کو بھی آپ اس انداز میں اختیار کریں گے کہ بس اسی پر زیادہ زور ہو اور اس ڈر سے کہ 'پورا کام' تو بہت وقت لے لے گا بس اسی ایک علاج کو ہی فوری نسخہ جان کہ جلد کوئی نتیجہ برآمد کرنے کی کوشش کریں گے...... ہوتا یہی رہے گا کہ آپ ایک مسئلہ سے نکلیں گے تو کسی دوسرے مسئلے سے دوچار ہو جائیں گے!

اس وقت جو کام ہمارے سامنے ہے وہ ہرگز یہ نہیں کہ ایک ٹھیک ٹھیک عمارت کی کہیں کہیں سے بس کچھ مرمت کر لی جائے...... ہمیں جس چیز کا سامنا ہے وہ یہ کہ ایسی عمارت جو قریب تھا کہ ڈھ جائے اس کی بنیاد کو از سرِ نو پختہ کر دیا جائے۔ ایک ایسی عمارت جس کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہوں اس پر اوپر اوپر سے مرمت کا آپ جتنا بھی کام کریں گے وہ بڑی حد تک بے فائدہ رہے گا۔

بات بہت سیدھی ہے......

اس دین کی بنیاد اور اساس لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے:

| | |
|---|---|
| أَلَـمْ تَـرَ كَيْفَ ضَـرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَـجَـرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْـلُـهَـا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّـمَـاءِ تُـؤْتِـيْ أُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَـضْـرِبُ الـلّٰـهُ الْأَمْـثَـالَ لِـلـنَّـاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْن (ابراہیم:۲۴-۲۵) | کیا تم نے نہیں دیکھا اللہ نے کیسی مثال بیان کی کلمۂ طیبہ کی۔ مانند ایک شجرۂ طیبہ کے، جس کا تنا جما ہوا ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچتی ہیں۔ وہ اپنا پھل اپنے رب کے حکم سے ہر وقت دیتا ہے۔ ایسے ہی اللہ لوگوں کیلئے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ اسباق لیں۔ |

سوال صرف ایک ہے۔بس اسی کا جواب دے لیجئے مگر جواب بہت واضح اور صریح اور بے لاگ ہونا چاہیے جس میں آپ نے کوئی التباس نہ رہنے دیا ہو۔سوال صرف اتنا ہے کہ آپ کا یہ معاشرہ ___الاماشاء اللہ___ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کی حقیقت کا فہم اور ادراک بھی آیا رکھتا ہے......یا نہیں؟؟

اس کا جواب میری نظر میں تو واضح ہے......

عام 'معاشرے' اور 'لوگوں' کی تو بات چھوڑیں داعیوں کی ایک کثیر تعداد آج ایسی ہے جن پر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کے مفاہیم اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کے تقاضے واضح نہیں اور گرد کی ایک دبیز تہہ نے ان مفہومات اور ان تقاضوں کو ان سے ڈھانپ رکھا ہے۔خاص طور پر جہاں تک لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کے نواقض کا تعلق ہے کیونکہ یہ داعی خود بھی ارجائی فکر، جس نے کہ عمل کو مسمائے ایمان سے خارج کر رکھا ہے، کے اثرات سے ابھی آزاد نہیں ہو سکے۔

داعیوں کی کثیر تعداد آج ایسی ہے جو ابھی یہ تعین نہیں کر پائی کہ یہ جسے 'معاشرہ' یا 'عوام' کہتے ہیں اس کو راہ راست پہ لے آنے کا چیلنج آج ہے کس نوعیت اور حجم کا اور یہ کہ اسلام سے اس معاشرہ کی دوری ہے کس سطح کی۔یہی وجہ ہے کہ ان تحریکوں نے 'مجمع' اکٹھا کرنے کی جلدی کی اور ان کو لے کر 'جادہ پیما' ہو جانے میں عجلت سے کام لیا جبکہ ابھی ان داعیوں اور تحریکوں پر وہ مسئلہ اور اس مسئلہ کی نوعیت واضح ہی نہ ہوئی تھی جس کی بنیاد پر ان معاشروں کو دعوت دی جانا تھی اور جس پر ان کو اکٹھا کیا جانا اور ساتھ چلایا جانا تھا!

یہ وجہ ہے جو ہمیں اصرار ہے کہ اس معاملہ کا نقطۂ ابتداء 'بنیادی ایمانی جمعیت' کی تیاری ہے عین اس نہج پر جس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنی وہ ٹھوس بنیادی جمعیت ابتدا کے اندر تیار کی تھی، بے شک ہم یہ جانتے ہیں یہ ناممکن ہے کہ آج تیار کی جانے والی ایسی کوئی جمعیت اس معیار کو پہنچے جس کو رسول اللہ ﷺ کی تیار کردہ اولین جمعیت پہنچی تھی! بلکہ یہ تو مطلوب بھی نہیں کہ بعد کی کوئی نسل اسلام کی اس اولین نسل کے معیار کو پہنچے۔معیار وہی ہو، یہ شرط نہیں، البتہ نہج کی بات اور ہے۔نہج وہی ہو، یہ البتہ شرط ہے۔'معیار' بدلتا رہنے والی چیز ہے مگر 'منہج' ایک آفاقی چیز ہے۔اس کو بہر حال نہیں بدلنا۔اس 'منہج' کی بنیاد پر 'تربیت' دی جانا ایک آفاقی ضرورت ہے اس کو بہر حال

*نہیں بدلنا، چاہے اس 'منہج' پر تربیت دینے اور تربیت لینے والے پھر جس بھی 'معیار' کو پہنچیں 'اور ہر ایک ہی کیلیئے ان کے عمل کے بقدر درجات ہیں'*۔[1]

اب جب اس ٹھوس بنیادی جمعیت کی تیاری ہوگی تو اس کا پہلا سبق **لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه** ہوگا...... علم میں، عمل میں اور اس کے تقاضوں کی بنیاد پر تربیت پانے میں۔ یہ سبق پڑھی ہوئی اور اس کی بنیاد پر تیاری پانے والی 'اساسی جمعیت' پھر 'توسیع شدہ' جمعیت کو وجود میں لائے گی اور اس کو ساتھ لے کر چلے گی...... اُس وقت جب 'عوام' کو دعوت کے گرد اکٹھا کر کے 'چل پڑنے' کا وقت آئے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

(۱) الاحقاف:۱۹ وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا "اور ہر ایک کے لئے ہی ان کے عمل کے بقدر درجات ہیں"

# 'جو ہے' سے
# 'جو ہونا چاہیے' تک

یہ تو واضح ہے کہ 'جو ہے' وہ اس سے بہت مختلف ہے 'جو ہونا چاہیئے تھا'!

اس سے پہلے ہم ان بعض اسباب کا جائزہ لے آئے ہیں جو اس بات کی تفسیر کرسکیں کہ اِس 'موجود' اور اُس 'مطلوب' میں یہ فرق کیونکر آیا۔ اس 'فرق' کے پائے جانے کے باعث جو کچھ نتائج برآمد ہوئے ان کا بھی ہم جائزہ لے آئے ہیں۔

البتہ اب جب ہم نے اس نبوی منہج پر کچھ تفصیل سے بات کرلی ہے جو اسلام کی اولین تحریک کی بنیادی جمعیت تیار کیے جانے اور پھر بنیادی جمعیت کو توسیع دیے جانے کیلئے نبی ﷺ کے زیرنگرانی عمل میں آیا.. تو اب ہم پھر سے اس موضوع پر آتے ہیں کہ 'جو ہے' اور 'جو ہونا چاہیئے' میں یہ جو فرق ہے وہ کیونکر ہے..

'عجلت پسندی' ایک وہ عمومی وصف ہے جو ہمیں اسلامی بیداری کے اس پورے عمل میں اس کی ابتدا سے لے کر انتہا تک آجاتا!!

خود 'اساسی جمعیت' کی تیاری کے معاملے میں ہی جلد بازی ہوئی!

ابتدا کے اندر اگر ہم نے کماحقہ اندازہ کرلیا ہوتا کہ:

☆ وہ خلل جو اُمت کے وجود اور اس کی بنیادی ساخت کو لاحق ہوا ہے اور اس کے باعث حقیقتِ اسلام یہاں کے معاشروں سے روپوش ہوئی ہے اور اسلام اپنے ہی نام لیواؤں کے مابین کیونکر اجنبی ہو چکا ہے اور جس سے فائدہ پا کر اس اُمت کے دشمن اس پر ہر طرف سے ٹوٹ پڑے ہیں...... یہ خلل دراصل ہے کتنا گہرا

☆ وہ جہد جو اُمت کو اس کی تاریخ میں پیش آنے والے اس سب سے بڑے خلل کو دور کرنے کیلئے اور اس کے وجود کو لاحق امراض سے اس کی شفایابی کیلئے کی جانا مطلوب ہے وہ جہد ہے

کس حجم اور نوعیت کی

☆ وہ محنت جو دشمنوں نے اسلام کا کام تمام کردینے کیلئے مختلف سطحوں پر پچھلی کئی صدیوں سے کی ہے خود اس کا حجم اور نوعیت کیا ہے

ان تین باتوں کا کماحقہ اندازہ اگر ہم نے کرلیا ہوتا تو ہم نے اپنی تحریکی اٹھان کے معاملہ میں کہیں زیادہ گہرائی اور دھیمے پن سے کام لیا ہوتا اور جلد بازی کا اسلوب نہ اپنایا ہوتا!

تو کیا جب تحریکی اور دعوتی عمل کی یہاں صدا بلند ہوئی اس وقت ہمیں درست درست اندازہ تھا کہ ایک اساسی جمعیت کی تیاری جو یہاں درکار ہے وہ کس پائے کی ہونی چاہیے اور اس کی مواصفات کیا ہوں؟ کیا یہ بات ہمارے ذہن میں پوری طرح واضح تھی کہ اس دعوت کا رخ پوری قوت کے ساتھ 'عوامی طبقوں' کی جانب کردینا، قبل اس کے کہ بنیادی جمعیت کی تیاری مطلوبہ سطح پر ہوچکی ہو، ہمیں بہت سی مشکلات سے دوچار کرسکتا ہے؟ یعنی جب عوامی طبقے ایک 'جذبہ' جگا دیے جانے کے باعث اس دعوت کے ساتھ آ ملنے کیلئے جوق در جوق آگے بڑھیں تو ان کو وہ مربی اور وہ معلم ہی نہ ملیں جو کہ حقیقتِ اسلام کے ازسرنو وجود میں لائے جانے کیلئے اس دور کی ضرورت ہیں؟! کیونکہ ہم وہ مربی اور معلم ابھی تیار ہی نہ کر پائے تھے جو دعوت کی صدا پر لبیک کہنے والے عوامی جمگھٹوں کو باحسن اسلوب 'سنبھال' لیں۔ اور کیا ہم پر واضح تھا کہ 'جذبہ' جگا جگا کر عوامی طبقوں کو ساتھ ملاتے جانا بغیر اس کے کہ ہم ان کو تربیت کی خاص سطح تک پہنچا لیں کچھ خطرناک مضمرات کا حامل ہوسکتا ہے، خصوصاً دعوتی عمل کو اس وقت کچھ ناقابل تلافی دھچکے لگ سکتے ہیں جب کچھ مقامی اور عالمی قوتیں بھڑک اٹھیں اور اس پر ہاتھ ڈال دیں جبکہ دعوت کے ساتھ چلنے والے لوگ ابھی کسی ایسی ضرب کیلئے تیار ہی نہ ہوں بلکہ خود تحریکی جمعیت ہی ایسی کسی ضرب کو کامیابی کے ساتھ سہہ جانے کیلئے مطلوبہ استعداد کی حامل نہ ہوئی ہو؟!

حالات سے جو واضح ہوتا ہے اس کو دیکھیں تو میرا خیال ہے یہ امور ہم پر اس حد تک واضح نہ تھے جس حد تک ہونے چاہییں تھے۔ حتی کہ تحریک کی بنیاد اٹھانے میں ہی کچھ عجلت برتی گئی۔ وہ خام مواد جو اسے حاصل تھا اس کو کندن بنایا جاسکتا تھا مگر اس پر پورا کام نہیں ہوا۔ یہ تو سچ ہے کہ جو بھی تحریک شروع ہوگی وہ کچھ ایسے ہی مواد سے مشروع ہوگی جو ابھی خام ہو۔ مگر اس کا چناؤ ابتدا کے اندر ایک خاص معیار چاہتا ہے۔ پھر اس کی تیاری ایک خاص انداز کی محنت اور عرق ریزی چاہتی ہے۔ اس کی تنقیح ایک خاص

درجے کی کی جانا ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہی پھر اس کو دعوت کے میدان میں کوئی 'کام' دیا جانا ہوتا ہے۔ خاص طور پر دعوت اگر اسلام پہ آنے والی غربت اور اجنبیت کو 'چیر' کر ماحول میں برآمد کی جانا ہو اور اس کو دشمنی کی ایک خاص نوعیت اور کیفیت سے پالا پڑنا ہو!!

جو ہوا سو ہوا۔ ہم اس وقت کسی کو ملامت کرنے نہیں جا رہے۔ جس نے خدا کے راستے میں جو محنت کی اس کا اجر وہ خدا سے ان شاء اللہ ضرور پائے گا۔ یہاں ہمارے زیر بحث جو بات ہے وہ بس اتنی کہ 'جو ہے' اور 'جو ہونا چاہئے تھا' میں فرق کی نشاندہی کر دی جائے۔

اس میں شک نہیں کہ داعی تحریک، خدا آپؒ پر رحمت کرے اور جو کچھ وہ اس اُمت کیلئے کر گئے اس پر ان کو جزائے خیر دے، نے اس انسانی مواد کو جو آپ کو حاصل تھا نکھارنے پر بھرپور محنت کی اور ان سب مادوں سے جو معاشرے سے خود بخود لگ جاتے ہیں اس کی تنقیح کر دینے پر خوب توجہ دی...... ان نوجوانوں کو 'انفرادی زندگی' کے حصار سے نکالا۔ ان کے اندر اجتماعیت کی روح پھونکی۔ اخوت، تعاون، محبت اور امدادِ باہمی کی بنیاد پر ان کو صف آرا کیا۔ ان کو رشتۂ اخوت سے منسلک ہونے کا شعور دیا۔ 'ذاتی' حیثیت میں 'عبادت گزار' رہنے کی بجائے عبادت و بندگی کو جماعت میں ڈھال دینے پہ ان کو گامزن کیا اور پرہیزگاری کے وہ اجتماعی اُفق ان کو دکھائے جس میں **امر بالمعروف ونهی عن المنکر** بھی آتا ہے اور ایک ایسے معاشرے کا قیام بھی جو اللہ کی شریعت کو محکم مانے۔ علاوہ ازیں ان کو اعلیٰ اخلاق پر تربیت دی اور اللہ کے دین کیلئے فدائیت اور جانبازی سکھائی۔

مگر حالات سے جو واضح ہوتا ہے اس کو دیکھیں تو ایک سیاسی اور تحریکی وفکری معنی میں پختگی کی سطح ابھی خاصی نیچی تھی اور اس کو ابھی اور بلند ہونا تھا۔ اس سے بڑھ کر سنگین بات یہ کہ آج اس دور میں اسلام کی تحریک کو 'جو کام' کرنا ہے اور معاملے کو 'کہاں سے اٹھا کر کہاں تک پہنچانا' ہے اس کے ادراک میں بہت کمی رہ گئی تھی۔

'ایک بہت بڑی جماعت' کھڑی کر لینے میں ہم سے کچھ جلدی ہو گئی تھی...... ایک بہت بڑی عوامی جماعت جو ہمارے خیال میں اقتدار تک پہنچنے کیلئے پائی جانا ضروری تھی اور جس کے ذریعے اقتدار لے لینے کے بعد ہم معاشرے کے اندر خدا کی شریعت کو نافذ کر دینا چاہتے تھے!

بلاشبہ یہ ایک جائز ہدف تھا۔ اگرچہ جاہلیت بھی ہر انسان کو ہی یہ حق دیتی ہے کہ وہ قانونی ذرائع اختیار کر کے اقتدار تک پہنچے سوائے یہ کہ وہ کوئی اسلام پسند ہو۔ یہاں اسلام پسند اگر اس بات کی کوشش کریں تو وہ مجرم کہلائیں گے! مگر اس بات کو جانے دیجئے کہ یہ جاہلیت کا وہ معروف موقف ہے جو وہ اہل حق کی بابت اختیار کرتی ہے اور یہ اس وقت سے ہے جب سے جاہلیت کہیں پائی گئی اور دعوت حق کا وہاں وجود ہوا۔

مگر مسئلہ اس ہدف کے جائز ہونے یا نہ ہونے میں نہیں بلکہ اس بنیادی سوال میں ہے کہ کیا محض 'نفاذ شریعت' اس بات کیلئے کافی ہے کہ اِس اُمت کی کایا پلٹ جائے جو کہ (بالفاظ حدیث) سطح سیلاب پہ پائے جانے والے خس وخاشاک کی حالت کو پہنچ چکی ہے، یا پھر اس کیلئے کچھ اور بنیادی امور بھی درکار ہیں 'نفاذ شریعت' سے پہلے اور بعد میں بھی اور اس کے وجود میں آ جانے کے دوران بھی؟!

اگر داعیِ اول رحمہ اللہ نے اس منتخب جمعیت پر جس کو کہ اس کی جماعت کی تاسیسی بنیاد بننا تھا وہ بات واضح کردی ہوتی جو کہ آپ نے بعد ازاں ۱۹۴۸ء میں (یعنی ابتدائے دعوت کے پورے بیس سال بعد) عوام پر واضح کی تو معاملات شاید بہت مختلف انداز میں پیش آتے!

۱۳۶۷ ھجری (۱۹۴۸ عیسوی) میں امام شہید نے ایک مہم کا آغاز کیا جس کو 'معرکہ مصحف' کا نام دیا گیا تھا۔ اس میں آپ کا بیان تھا:

''اسلام دین بھی ہے اور ریاست بھی۔ یہ بات کسی شک وشبہ کی متحمل نہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اسلام ربانی شریعت ہے جس میں انسانی تعلیمات ہیں تو سماجی احکام بھی۔ اس کی تنفیذ اور اقامت کا کام اہل ایمان کو سونپا گیا ہے اور مسلمانوں پر جو حکمران ہے وہ اس فرض کا براہ راست مخاطب ہے۔ اگر وہ حکمران شریعت کے ان احکام کے حفظ واقامت سے سرتابی کرتا ہے تو وہ مسلمان حکمران نہیں رہتا۔ ریاست کے قوانین اگر اس فرض سے اہمال برتتے ہیں تو وہ ریاست اسلامی نہیں رہتی۔ اگر جماعت یا اُمت اس اہمال پر راضی بہ رضا ہو جاتی ہے تو چاہے زبان سے اسلامی ہونے کا وہ کتنا ہی دعویٰ کرے اسلامی نہیں رہتی۔ مسلمان حکمران کے شرائط میں سے ہے کہ وہ خود فرائض اسلام کا پابند وملتزم ہو۔ خدا کی حرمتوں کو پامال کرنے سے دور رہنے والا ہو۔ کبائر کے ارتکاب سے باز رہتا ہو۔ یہ سب باتیں درست مگر یہ اس کو مسلم حکمران قرار دینے کیلئے کافی نہیں جب تک کہ وہ ریاست میں از روئے دستور اس بات کا پابند نہ ہو کہ احکام اسلام کا تحفظ کرے اور مسلمانوں کے مابین ان کا قیام کرے۔ دعوتِ اسلام کا

حکمرانوں کی بابت وہی موقف ہوگا جو کہ ان کا دعوتِ اسلام کی بابت ہو"۔(۱)

کیا خیال ہے اگر انہوں نے ابتدا ہی سے یہ لہجہ واضح کر دیا ہوتا تو عوام کے وہ سب گروہ جو ایک جذباتی انداز میں آپ کے اردگرد اکٹھے ہو گئے تھے یہاں تک کہ ان کی تعداد پانچ لاکھ کو پہنچ گئی تھی، اور جن میں اکثریت نوجوانوں کی تھی، جبکہ قوم کی کل آبادی اس وقت ابھی انیس ملین سے تجاوز نہ کرتی تھی...... کیا آپ کے گرداگرد اکٹھے ہو جاتے؟ بلکہ وہ منتخب جمعیت بھی کیا اس آسانی سے آپ کے گرد مجتمع ہو جاتی اور جذبات کے زیر اثر اتنا فاصلہ طے کر لیتی؟

میرا نہیں خیال!

اور کیا تب بھی یہ انہی اشخاص پر مشتمل ہوتی جن پر کہ یہ بالفعل مشتمل تھی، یا پھر کسی اور سطح کے عناصر پر مشتمل ہوتی؟

کچھ کہا نہیں جا سکتا! کم از کم یقین سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی!

بہر حال وہ کوئی سے بھی اشخاص ہوتے جن پر اس اساسی جمعیت کی بنیاد اٹھائی جاتی، دعوت کا لہجہ زیادہ گہرا اور زیادہ واضح اور زیادہ دوٹوک ہونے کی صورت میں وہ لوگ زیادہ مضبوط ہوتے۔ شعور اور ادراک میں زیادہ گہرے ہوتے۔ لمبا چلنے میں زیادہ بہتر صلاحیت کے حامل ہوتے اور اس کی نسبت جو بالفعل پیش آیا وہ عجلت اپنانے سے زیادہ بچ کر رہتے۔ جذباتی اپروچ سے نسبتاً دور ہوتے اور یہ نہ سمجھتے کہ ان کا ہدف سہل الحصول ہے۔ تب وہ ذہنی اور اعصابی طور پر بھی اور تربیتی اور فکری طور پر بھی اس سے ایک کہیں بڑی سطح کی کشمکش کیلئے تیاری کرتے۔ جبکہ یہاں حال یہ تھا کہ ان میں سے بہت سارے یہ سمجھتے رہے کہ جن وسائل کو وہ اختیار کئے ہوئے ہیں وہ بہت جلد ان کا 'مطلوبہ' نتیجہ برآمد کرلانے والے ہیں!

مگر اس صورت میں، جب تبدیلی کا یہ پورا نقشہ ان پر واضح ہوتا، یہ لوگ مطلع ہوتے کہ راستہ طویل ہے بلکہ بہت طویل ہے اور یہ کہ جو جدوجہد یہاں مطلوب ہے بہت بھاری بھی ہے اور بہت مختلف بھی۔ اور یہ کہ جو وسائل اس تبدیلی کیلئے مطلوب ہیں وہ کیفیت اور نوعیت میں ان وسائل سے بہت بڑھ کر ہیں جو ان کے منہج میں اپنائے گئے۔ کیونکہ جو کام پیش نظر ہے وہ ایک پہلے سے موجود عمارت میں کچھ 'اصلاحات' نہیں بلکہ اس کی پوری بنیاد کی ہی ایک تجدید نو ہے۔

(۱) ملاحظہ کیجئے جریدہ روزنامہ "الاخوان المسلمون" شمارہ ۶۲۷ سن سوئم، مؤرخہ ۷ رجب ۱۹۶۷ھ اتوار بمطابق ۱۶ مئی ۱۹۴۸ء

اور جہاں تک ساتھ چلنے والے 'عوام' کا تعلق ہے تو اگر تبدیلی کی یہ بنیادیں ان پر واضح ہوتیں تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس جوق در جوق انداز میں دعوت کے ساتھ آ ملتے۔ تب ان کو اندازہ ہوتا کہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے کہ پرتاثیر تقریریں سنی جائیں اور زبردست جلسوں میں شرکت کی جائے جیسا کہ وہ ان زبردست اجتماعات میں، جن کو کہ وہ روحانیت سے پُر کہا کرتے تھے پورے جوش وخروش سے شریک ہوتے اور حدِ نگاہ تک پائے جانے والے انسانوں کے ٹھٹھ دیکھ کر 'اُمیدوں' سے لدے پھندے واپس آتے!

تب ان عوامی انداز کے طبقوں کو معلوم ہوتا کہ یہ جاہلیت کے ساتھ ایک باقاعدہ ہاتھا پائی ہے اور جو کہ انسان کو بہت سے خطرات میں دھکیل سکتی ہے جن کو کہ خوامخواہ مول لے آنا ایک 'سمجھدار' کا کام نہیں: *وقالوا ان نتبع الهدى معك نتخطف من أرضنا* (القصص: ۵۷) ''کہنے لگے تمہارے ساتھ مل کر اگر ہم اس ہدایت کے پیچھے چل پڑیں تو اپنے گھر سے اچک لئے جائیں''۔

تب یہ تحریک بہت دھیمے قدموں سے چلتی۔ مگر ایک زیادہ صحیح وپختہ راستے پہ ہوتی۔ بنیادی جمعیت نسبتاً زیادہ وقت لے کر تیار ہوتی۔ اس کیلئے زیادہ آہستگی کے ساتھ اور زیادہ گہری نظر کے ساتھ جوان چنے جاتے اور یوں اس کو اپنی ابتدائی تیاری مکمل کرنے کیلئے کہیں زیادہ بہتر انسانی خام مواد ملتا۔ پھر ان کی تیاری کیلئے محنت بھی زیادہ اعلیٰ پائے کی ہوتی تا کہ بنیاد اٹھانے کیلئے ایک زیادہ کارآمد نتیج حاصل ہو اور روحانی تربیت، اخلاقی تربیت، فکری تربیت، نفسیاتی تربیت اور مستند علم شریعت کے حصول وغیرہ کے حوالے سے تربیت اور تیاری کے سب پہلو عمل میں آجاتے...... اس مجموعی فضا میں رہتے ہوئے جو اس ربانی ہدایت سے تشکیل پاتی: كفوا أيديكم وأقيموا الصلوة وأتوا الزكوة ''ہاتھ روک رکھو اور اقامت صلوات اور ایتاء زکوۃ کئے رہو''۔

پھر اسی دھیمے انداز میں 'بنیادی جمعیت' کی 'توسیع' عمل میں آتی اور وہ اس وقت جب اس 'توسیع' کی واقعتاً نوبت آ چکتی، یعنی جب بنیادی جمعیت کی تیاری ہو چکی ہوتی، ایسے جانباز افراد کی بنیاد پر جنھوں نے اپنے آپ کو دعوت کیلئے ایک پوری بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہوتا اور ان کو پورا ادراک ہوتا کہ مسئلۂ درپیش ہے کیا اور اس کے تقاضے ہیں کیا۔ ان کو پورا اندازہ ہوتا کہ اُمت کس حالت کو پہنچی ہوئی ہے اور اسکو روگ کون کون سے لاحق ہیں۔ ان پر پوری طرح واضح ہوتا کہ تبدیلی کے اس پورے عمل میں کیا کیا کچھ کیا جانا ہے اور مطلوبہ عمل کی نوعیت ہے کیا۔ یہ تشکیلِ جمعیت اور توسیعِ جمعیت 'عوام' کی جانب

رخ کرنے سے پہلے ہو چکی ہوتی اور پھر ان عوامی طبقوں کو پرچم تلے آ کھڑے ہونے کی صدا دی جاتی۔

'سیاسی کام' بھی، یعنی قومی مسائل اور سماجی معاملات میں الجھنے کا کام بھی تب ذرا تاخیر سے ہوتا۔ جبکہ اس دوران ایک صحیح اور پختہ بنیاد کو ہی معاشرے کے اندر کھڑا کرنے پر محنت ہو رہی ہوتی جس کی اساس صحیح عقیدہ ہوتا اور صحیح تربیت ہوتی، تربیت کے تمام تر تقاضوں سمیت۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو دعوت کیلئے پیش کیا ہوتا ان کو باقاعدہ تیار کر لیا گیا ہوتا بالکل اسی انداز میں جس میں مدینہ کے معاشرے کو رسول اللہ ﷺ کے اولین سابقین نے تیار کیا تھا۔

اس کے بعد پھر بے شک 'مڈبھیڑ' ہو جاتی! اس سے چارہ بہر حال نہیں۔ خدائی سنتوں کی رو سے جو اس نے حیات انسانی کے اندر مقرر ٹھہرا رکھی ہیں یہ ہو کر رہتا ہے۔ اس کی ابتدا بھی جاہلیت ہی کی جانب سے ہوتی ہے کیونکہ وہ زمین میں ایک جماعتِ مومنہ کے وجود سے ہمیشہ ہی اپنے لئے ایک خطرہ محسوس کرتی ہے، بے شک اہل ایمان تعداد میں تھوڑے کیوں نہ ہوں۔ بے شک وہ اس مقابلے میں آنے سے کتنا ہی بچیں۔ جاہلیت ان سے خطرہ بہر حال محسوس کرتی ہے: **انّ ھؤلاء لشرذمة قلیلون وانھم لنا لغائظون وانّا لجمیع حاذرون** (الشعراء: ۵۴-۵۶) *"یہ (اصحابِ موسیٰ) چھوٹا سا ایک ٹولہ ہیں۔ یہ ہمیں بے حد ناقابلِ برداشت ہیں۔ اور در حقیقت ہم سب (ان سے) خدشہ رکھتے ہیں"*

☆☆☆☆☆☆☆

مگر اس صورت میں زیادہ امکان ہوتا کہ یہ 'آمنا سامنا' کچھ مؤخر کر لیا جاتا جبکہ اس دوران ایک 'اساسی جمعیت' کی تیاری کیلئے اور 'توسیع شدہ جمعیت' کی تیاری کیلئے زیادہ وقت حاصل کر لیا جاتا اور ان دونوں کی تربیت کیلئے تمام تر ممکنہ صورتیں بروئے کار لائی جاتیں۔ مزید یہ کہ...... جب یہ سب کام '**کفوا ایدیکم**' کی فضا میں رہ کر ہوتا اور ان پاک طینت لوگوں کا کوئی 'قصور' دُنیا کو نظر ہی نہ آتا سوائے '**ان یقولوا ربنا اللہ**' تو یہ بات اس معاملہ میں مددگار ہوتی کہ 'عوام' بھی سمجھیں کہ اس دعوت اور جاہلیت کے مابین مسئلۂ نزاع کی حقیقت ہے کیا۔ تب اس صورت میں عوام کے ذہن میں اس 'اصل مسئلہ' کے ساتھ وہ دوسرے 'مسائل' گڈمڈ نہ ہوتے جو کہ ان کو واقعتاً گڈمڈ نظر آئے۔ تب طاغوتوں کیلئے آسان نہ رہتا کہ وہ اسلام کے خلاف اپنی اس جنگ میں عوام کو بے وقوف بنائیں کسی وقت طاقت کا استعمال کر کے اور کسی وقت ذرائع ابلاغ کے ہتھکنڈے استعمال کر کے۔ کیونکہ اس صورت میں 'سبیل المجرمین' واضح ہو جاتا

کیونکہ 'تفصیلِ آیات' کا کام ہو رہا ہوتا اور خدائی منہج پر دعوت کا کام آگے بڑھ رہا ہوتا۔ تب لوگوں کیلئے یہ آسان ہوتا کہ وہ اس 'الجھے' ہوئے معاملے میں کیا موقف اپنائیں: وكذلك نفصل الأيات ولتستبين سبيل المجرمين (الأنعام:۵۵) 'ہم تو ایسے ہی آیات کو کھول کر بیان کرتے ہیں اور اس لئے بھی کہ سبیل المجرمین واضح ہو کر رہ جائے'۔

☆☆☆☆☆☆☆

مگر جو بالفعل ہوا وہ اس سے برعکس تھا۔

'مسئلۂ باعث نزاع' اس واضح انداز میں پورے بیس سال کے بعد لوگوں کے سامنے آیا۔ جبکہ اس دوران دین پسند جمگھٹے اس دعوت کے گرداگرد اکٹھے رہے بغیر یہ اندازہ کئے کہ اس میں کیا کیا خطرات مضمر ہیں۔ دعوت 'کس چیز' کی تھی، یہ بات شدید خلط ملط تھی۔ ابھی اس کا وہ آہنگ نہ بنایا گیا تھا کہ یہ صاف صاف لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کی دعوت ہو۔ بہت سے سیاسی، قومی اور سماجی مسائل اس میں گڈمڈ تھے۔ ایسا کرنے کے پیچھے اصحابِ دعوت کا یہ گمان کارفرما تھا کہ ان مسائل کو سامنے لانے سے دعوت کو عوامی پذیرائی دلانے میں مدد ملے گی! اور یہ کہ عوام کو جوش و خروش کے ساتھ چلانے کا یہی طریقہ ہے کہ وہ مسائل جو 'عوام' کی نظر میں اہم اور توجہ طلب ہیں دعوت میں انہی مسائل کا زیادہ سہارا لیا جائے! یہاں تک کہ مسئلہ فلسطین کا وہ بم پھٹا جس نے اس ساری صورتحال کو ہی بدل کر رکھ دیا۔ یعنی ۱۹۴۸ء میں......

تب اس نوخیز تحریک کے خلاف ظلم اور بربریت کی وہ بدترین صورتیں پیش آئیں جو کہ خیال تک میں نہ آسکیں۔

بالکل درست، کہ دعوت کے خلاف جاہلیت کے بھڑک اٹھنے کی توقع ہونی ہی چاہئے تھی۔

کیونکہ، جیسا کہ ہم نے کہا، یہ خدائی سنتوں میں سے ایک سنت ہے اور امام شہید اپنے رفقا اور اپنے پیروکاروں کو اپنے خطاب میں کہا کرتے تھے: ''میں یہ بات بہت واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ تمہاری دعوت ابھی بہت سے لوگوں پر مخفی ہے۔ جس دن وہ اس سے واقف ہوں گے اور اس کے مضمرات اور اس کے اہداف ومقاصد کا ادراک کریں گے اس دن اس دعوت کو ان کی جانب سے شدید مخالفت اور سنگین دشمنی دیکھنے کو ملے گی۔ اس دن تمہیں اپنے سامنے بڑی ہی مشقتیں نظر آئیں گی اور ہر طرف رکاوٹیں دکھائی دیں گی...... حقیقت میں اس وقت ہی تم وہ راستہ اختیار کرو گے جو کہ درحقیقت داعیانِ

حق کا راستہ ہوا کرتا ہے''۔[1]

مگر جس انداز میں دعوتِ دین پر مظالم ڈھائے گئے اس کا اندازہ بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ مذبح خانے تھے جو اس دعوت کا ساتھ دینے کا خمیازہ بنے اور ابھی تک بنے چلے آ رہے ہیں۔

صلیبی مغرب کو درحقیقت اس 'مقام' کی نشاندہی ہو گئی تھی جہاں سے 'خطرہ' ہے۔ یہ وہ 'اسلام' ہے جو سیاست کو موضوع بناتا ہے اور محض 'قلبی' و 'بدنی' عبادات پر قانع نہیں ہوتا بلکہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ واقعِ زمین میں اپنایا جانے والا ایک کلی منہج ہو اور پوری کی پوری انسانی زندگی کو چلائے خواہ وہ سیاست ہو، معیشت ہو، سماج ہو، فکر اور تعلیم ہو یا اخلاق یا زندگی کا کوئی سا بھی شعبہ۔ مغرب کی نظر میں آخر اس سے بڑھ کر خطرے کی کوئی بھی بات ہو سکتی ہے؟[2]

ایسے 'اسلام' کا سدباب کرنا تو چنانچہ ضروری ہے! اس کے خلاف سب قویٰ کو بروئے کار لایا جانا ہے! اس کا ہر جگہ تعاقب ہونا چاہیے اور اس کے سوتے خشک کر دیے جانے چاہئیں! اس کو بدنما بنا کر پیش کیا جانا چاہیے تاکہ نوجوان اس کی طرف رخ نہ کریں کیونکہ اس صورت میں خطرہ بڑھ جاتا ہے!

صلیبی ذہنیت اور صہیونیت کے دِل میں غضب کی آگ بھڑکانے میں دو باتیں بیک وقت سبب بنیں:

(۱) اسلامی بیداری کا 'اچانک پن' عین اس وقت سامنے آیا جب صلیبی ذہنیت دو سو سال سے زائد عرصہ کی مسلسل محنت و منصوبہ بندی کے بعد اب یہ توقع کرنے لگی تھی کہ اسلام کا کام تمام کرنے میں وہ قریب قریب کامیاب ہو چکی ہے۔ مگر یہ دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے کہ 'اسلام' تو پھر جاگنے لگا ہے!

---

(۱) مجموعہ رسائل امام شہید حسن البنا، ص ۱۰۸، مطبوعہ المؤسسۃ الاسلامیۃ للطباعۃ والنشر بیروت، طبع ۱۴۰۳ھ، ۱۹۸۳ء

(۲) مغرب یہ باور کراتا ہے کہ وہ صرف 'جنگجو اسلام' Militant Islam کے خلاف برسرِ جنگ ہے، اور جس کو کہ وہ 'دہشت گردی' کا نام دیتا ہے، اور یہ کہ ''اسلام'' کے ساتھ اس کی کوئی جنگ نہیں۔ مگر مغرب کا یہ جھوٹ ایک الجزائر کے معاملے میں طشت از بام ہو گیا جہاں مغرب کا وہ موقف جو اس نے الجزائر کی اسلامی تحریک کے خلاف اپنایا۔ الجزائر کی اسلامی تحریک ہرگز کوئی 'جنگجو' جماعت نہ تھی، نہ ہی 'جنگ' اس کے منشور یا پروگرام میں شامل تھی۔ یہ تحریک بیلٹ باکس کے راستے سے آئی تھی، جو کہ مغرب کا اپنا ہی دیا ہوا طریق کار ہے۔ مگر اب کے مغرب اپنے اس مذہب کو روبہ عمل آتا دیکھنا گوارا نہ کر سکا۔ جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مغرب کو دراصل یہ گوارا نہیں کہ اسلام کہیں پر حکمرانی کرے، چاہے اسلام کی حکمرانی کیلئے جونسا بھی راستہ اپنایا گیا ہو!

(۲) عالمی یہودیت ایک لمبی منصوبہ بندی اور محنت کر کے اس نقطے تک پہنچی تھی کہ وہ اپنی ایک ریاست سرزمینِ اسلام کے قلب میں قائم کر لے۔ وہ یہ خواب دیکھ رہی تھی کہ وہ امن وامان سے یہاں اپنی ایک مملکت قائم کر کے رہے گی۔ یہ نئی اسلامی بیداری اس کیلئے ایک بہت بڑا جھٹکا تھا!

یہ دونوں باتیں بیک وقت پیش آئیں اور معاً اس بات کی متقاضی ہوئیں کہ اس 'مشترک' دشمن کا پورے زور کے ساتھ صفایا کر دیا جائے۔

کیا یہ ممکن تھا کہ اسلامی تحریک اس صلیبی وصہیونی عداوت سے اور اس کے مکر وسازش سے محفوظ رہتی اور اس کا کام تمام کرنے کی اس کی جانب سے کوئی کوشش نہ ہوتی؟ ہماری نظر میں یہ خیال اور محال ہے!

لیکن ہمارے خیال میں ایک اور صورت کے پیدا ہونے کا بھی امکان تھا بشرطیکہ معاملات صحیح تر منہج پہ چلتے۔ وہ 'عوام' جن کو میدان میں قبل از وقت لے آیا گیا تھا...... یہ 'عوام' اگر 'مسئلۂ باعث نزاع' کی حقیقت سے درست آگہی رکھتے اور اسلام اور جاہلیت کی کشمکش کا درست ادراک رکھتے تو نقشہ کچھ مختلف ہوتا! البتہ جب ہم 'عوام' کی بات کرتے ہیں تو ان کو ادراک کے اس نقطے تک پہنچانا ممکن ہی نہ تھا جب تک کہ ان کی ایک خاص سطح کی تربیت نہ کر لی جاتی۔ ان کی تربیت ممکن نہ تھی جب تک اس اساسی جمعیت کی ایک درست منہج پر تیاری نہ کر لی گئی ہوتی۔ یوں ایک کڑی میں رہ جانے والا نقص پھر باقی کی سب کڑیوں میں آجانے والے نقص کا باعث بنا!

اس کے بعد پھر وہ واقعات پیش آئے جن کی جانب پچھلی فصول میں ہم اشارہ کر آئے ہیں...... یعنی دشمنوں کی وحشتناکیوں کے بالمقابل ظاہر کیے جانے والے ردعمل جو اسلامی طبقوں کی جانب سے پیش آئے۔ اس سے پھر وہ 'غیر واضح' اور 'خلط ملط' صورتحال اور بھی غیر واضح اور خلط ملط ہوئی۔ 'اساسی جمعیت' سے لے کر 'عوامی حمایت' تک سب کچھ ابہام میں چلا گیا اور تحریک کا کوئی 'مقدمہ' ہی نہ رہا۔ ہماری مراد ہے ایک طرف کچھ اسلامی دھڑوں کا پارلیمانوں کے اندر جا بیٹھنا اور اس سے نظامِ موجودہ کو غیر شرعی منوایا جانے کا مسئلہ سرے سے بے جان ہو جانا اور اس کے ساتھ صرف ایک 'سیاسی' انداز کے اختلاف کا تاثر ابھر آنا۔ مزید برآں خدائی شریعت کی تحکیم کی 'آپ سے آپ فرضیت' ہونے کی بجائے اس کا 'اکثریت کے ووٹوں' کے ساتھ نتھی ہو رہنا...... اور دوسری طرف کچھ اسلامی دھڑوں کا برسراقتدار طبقوں کے خلاف مسلح کارروائیاں چھیڑ بیٹھنا اور اس سے تحریک کا اصل مقدمہ اور بھی حاشیائی ہو جانا اور اس سارے کے سارے

معاملے کا لوگوں کی نظر میں بس یہ ہو رہنا کہ کون مرا اور کس نے مارا، اور کون جیتا اور کون ہارا! (1)

پھر تو کچھ اور دھڑے بھی نکل آئے جو کہ تکفیری رجحانات کے مالک تھے اور جن کی جنگ ہی 'لوگوں' کے ساتھ تھی...... اس بنا پر کہ ان کے نزدیک لوگ 'کافر' ہو گئے ہیں اور ان کی جان مال حلال ہے جب تک کہ وہ 'اہل ایمان' کی 'جماعت' میں شامل نہیں ہو جاتے!

اس سے دین کیلئے کیے جانے والے کام کا جو نقصان ہوا وہ اندازے سے باہر ہے۔ ایسے تکفیری رجحانات سے جن پر خود شریعت سے ہی کوئی سند نہیں ملتی، لوگ تو متنفر ہوئے ہی ذرائع ابلاغ کو ایک بہت اچھا موقعہ ہاتھ آیا جو کہ دین کے تحریکی عمل کو خراب کرنے کی ویسے ہی تاک میں رہتے ہیں۔ اب ان کو موقعہ ملا کہ اسلام کو خونیں رنگ میں پیش کریں۔ حالانکہ یہ تکفیری رجحانات کے حامل یہاں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھے۔ مگر ذرائع ابلاغ نے اس سے فائدہ اٹھا کر پورے کے پورے تحریکی عمل کی صورت بگاڑ دینے کی ٹھانی اور سب کو بلا امتیاز 'دہشت گرد' بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی جن کا کہ قلعہ قمعہ کر دیا جانا چاہئے اور جن کے سوتے خشک کر دینے چاہیں!

عالمی ذرائع ابلاغ اس بات کے حاجتمند نہ تھے کہ کوئی انہیں اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے پر اکسائے یا اس کی جانب 'توجہ' دلائے۔ اسلام کے خلاف جو بغض اور کینہ وہ لئے بیٹھے ہیں اس کے باعث وہ تو تیار بیٹھے تھے کہ کوئی ایسا 'موقعہ' ہاتھ آئے اور پھر وہ اس کا آخری حد تک فائدہ اٹھائیں!

اِدھر یہ حال ہوا کہ معاشرے کے اندر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے مقدمے پر ابہام اور غموض کی ایک دبیز تہہ چڑھا دی گئی۔ تحریکوں کے افراد سے لے کر عوام تک اس کا اثر دیکھنے میں آیا...... اُدھر یہ حال رہا کہ اس صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فکر ارجا کے علمبردار میدان میں اتر آئے اور اپنے فکر کی پورے زور شور سے اشاعت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ کچھ 'علماء' تک جن کو کہ لوگ اہل الذکر شمار کرتے اور علم دین میں مرجع تسلیم کرتے تھے اس کی گرداب میں آ گئے۔ یہ ان طبقوں کو بھی شرک میں پڑا ہوا نہ مانتے تھے جو کہ فی الواقع شرک کے مرتکب تھے۔ یہ شرک میں پڑے ہوؤں سے بھی ارتکابِ شرک کی نفی کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے اور بدستور ان کو مومن ہونے کے پکے سرٹیفکیٹ جاری کر رہے تھے! یوں یہ اس جرم عظیم کو لوگوں کی نظر میں 'معمولی' بنا دینے کا باعث بنے...... اس جرمِ عظیم کو جو کہ کوئی انسان خدا کے حق میں کبھی

(۱) ملاحظہ کیجئے اس کتاب کی فصل: ''تحریکوں میں عجلت پسندی کے آ جانے کے اسباب اور عواقب''

کرسکتا ہے یعنی خدا کی اتاری ہوئی شریعت سے روگردانی اور اس کو ہٹا کر اور عین اس کی جگہ پر جاہلیت کی دی ہوئی شریعتوں کو انسانوں کے مابین حکم ٹھہرا دینا۔ اس جرم کو یہ لوگ 'محض ایک گناہ' کے طور پر پیش کر رہے تھے اور جو کہ ان کی نظر میں اس بات کا مستحق نہیں کہ اس پر 'زمین آسمان' ایک کر دیا جائے!

حق یہ ہے کہ اس مسئلہ کو معاشرے میں پڑھا پڑھایا جانے کیلئے ایک طویل تر تعلیمی مشن درکار تھا اور ایک شدید تر محنت اور عمیق تر ترکیز۔ اس کا آغاز تحریکوں کے اپنے افراد سے ہوتا اور ان کو یہ مسئلہ از بر کرانے کیلئے اچھا خاصا وقت صرف کر دیا جاتا یہاں تک کہ یہ ان کا ایک باقاعدہ مقدمہ بن جاتا۔ پھر اس اساسی جمعیت کی توسیع ہوتی اور انہی بنیادوں پر ہوتی بغیر اس سے کہ 'عوام' کے خلاف 'فتووں' کا کوئی محاذ کھولا جاتا۔

☆☆☆☆☆☆☆

اس کے بعد یہ ہوا کہ اسلام کے اس تحریکی عمل میں 'ٹولوں' کا فنا منا سامنے آنے لگا، جس کے متعدد اسباب تھے:

اس کا ایک سبب یہ تھا کہ کوئی ایسی بھاری بھرکم قیادت باقی نہ رہی تھی جو اپنی زوردار شخصیت کے باعث پورے کے پورے تحریکی عمل کو اپنے گرد پرو لیتی۔ یا اور نہیں تو ان میں نقطہ ہائے نظر کی قربت ہی پیدا کرائے رکھتی۔ اس کے بجائے اب یہاں چھوٹی سطح کی قیادتیں تھیں جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو اور اپنی رائے کو ہی سب کچھ سمجھتی اور اس کے گمان میں درست راستہ بس اسی کا راستہ ہے اور سب دوسرے 'غلطی' پر ہیں۔

اس کا ایک سبب یہ تھا کہ دعوت کا علم اٹھانے والے بہت سے نوجوان کسی ایسے ماحول میں پروان نہ چڑھے تھے جس میں تربیت کا بھرپور بندوبست ہوتا اور دینی اخوت اور مسلمانوں کے ساتھ جڑ کے رہنے کی روح ان کی گھٹی میں اتاری گئی ہوتی۔ یہ ایک سطحی سی فکری یگانگت تھی جو کہ تفسیر یا تاویل یا فہم کے اختلاف کا ایک بھی دھچکا برداشت نہ کر سکے۔ ایک ایک مسئلہ پر 'جماعتوں' کے جڑنے اور ٹوٹنے کے واقعات ہونے لگے۔

اس کا ایک بڑا سبب علمِ شرعی کا نہ پایا جانا تھا۔ جبکہ ایک پختہ اور راسخ شرعی علم ایک درست فکر اور ایک درست سلوک کو برآمد کرنے کیلئے بنیادی ضابطے کا درجہ رکھتا ہے۔

پھر اس کا ایک سبب، جو کہ کچھ ایسا محتاج بیان نہیں، اسلام دشمن اداروں اور ایجنسیوں کی ان تھک محنت تھی۔ جو کہ دینی میدان میں کام کرنے والوں کے مابین ہر اختلاف کو گہرا کرنے اور ان کو ایک

دوسرے سے کاٹ کر رکھ دینے کیلئے برسرِ عمل تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

کیا اس صورتحال کے سلجھنے کی کوئی اُمید ہے؟ کیا اس بات کی اُمید ہے کہ وہ طبقے جو اپنا راستہ اختیار کرنے میں کچھ جلدی کر بیٹھے ہیں اپنی راہِ عمل میں ذرا ایک نظر ثانی کر لیں؟ ان غلطیوں کا تدارک کر لینے کی ایک کوشش کریں جن میں وہ کسی وجہ سے پڑ گئے اور ایک درست نبوی منہج پر اپنے کام کی ایک نئی ابتدا کریں؟

جو ہوا یقیناً وہ خدا کے مقدر کئے ہوئے اُمور میں سے ایک 'مقدر' ہے...... مگر ہم نے خدا کی کتاب اور رسولؐ کی سنت سے جو سیکھا ہے وہ یہ کہ خدا کے قضا و قدر پر ایمان رکھنا اس بات کے منافی نہیں کہ انسان کو بھی اس کی غلطی کی ذمہ داری اٹھوائی جائے۔ نہ ہی قضا و قدر پر ایمان اس امر میں مانع ہے کہ جو غلطی ہو چکی ہو اس کی درستی کی بھرپور سعی نہ کی جائے۔

تو کیا اس بات کی اُمید ہے کہ اسلام کیلئے کئے جانے والے کام کو ایک درست پٹڑی پر چڑھا لیا جائے اور ہمارے دینی طبقے ایک غور و خوض اور نظر ثانی کے عمل سے گزر کر اپنی تحریک کو ایک نئی اور بہترین اور موثر ترین سمت دے لیں؟

پٹڑی کو درست کر لینا بہر حال ایک بنیادی فرض رہے گا...... کہنے والے یہ کہیں گے کہ اسلام کے تحریکی عمل کو دشمن اس بات کا موقعہ نہ دے گا کہ وہ اپنا رخ اب جا کر درست کر لے اور یہ کہ دشمن ایسا ہو جانے سے پہلے ہی اس کے ساتھ جنگ چھیڑ دے گا۔ ہمارا کہنا ہے: یہ جنگ تو بہر حال نہیں رکے گی۔ مگر یہ اسلامی تحریک کا خاتمہ نہیں کر دینے کی۔ بلکہ یہ تحریک کو مہمیز دینے کے عوامل میں سے ایک عامل ہو گی اور اس معاملہ میں مددگار ہو گی کہ لوگ اس بات سے آگاہی پائیں کہ اسلام اور جاہلیت میں یہ جو معرکہ بپا ہے اس کی اصل حقیقت دراصل ہے کیا۔

جن لوگوں کو خدا نے بات کی سمجھ دے رکھی ہے ان پر نصیحت کا فرض بھی بہر حال فرض رہے گا۔

"الدین النصیحة" قالوا: لمن یا رسول اللہ؟ قال: للہ ولرسولہ ولکتابہ ولعامة المسلمین وخاصتھم" (متفق علیہ)

*"دین نصیحت و خیر خواہی کا نام ہے" عرض کیا: کس کی خاطر اے اللہ کے رسول؟ فرمایا" خدا کی خاطر، اس کے رسول کی خاطر، اس کی کتاب کی خاطر، عامۃ المسلمین کی خاطر اور اُن کے خواص کی خاطر"۔*

☆☆☆☆☆☆☆

# مستقبل پر ایک نظر

ہمارے بہت سے اصحاب صورتِ موجودہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پریشان ہوجاتے ہیں، چاہے وہ اس وحشتناک جنگ کو دیکھ کر ہو جو کہ ہر خطے میں اس وقت اسلامی تحریکوں کے خلاف روا کرلی گئی ہے اور چاہے وہ ان اغلاط کو دیکھ کر ہو جن کا خود ان اسلامی تحریکوں کی جانب سے ارتکاب ہوتا رہا ہے یا ابھی تک ہو رہا ہے۔ تب وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اسلامی تحریک کا کوئی مستقبل نہیں اور یہ کہ وہ ناگفتہ بہ صورتحال جس سے مسلمان آج دوچار ہیں ویسی ہی ناگفتہ بہ رہے گی یا پھر شاید اس سے بھی بُری صورتحال اختیار کرلے گی۔

البتہ ہم یقین جازم رکھتے ہیں کہ مستقبل اسلام کا ہے۔

ہمارے تصورات وہم پر مبنی نہیں۔ خوابوں پر مشتمل نہیں۔ نہ ہم ان بڑے بڑے بحرانوں سے ہی صرف نظر کرتے ہیں جو اسلام کیلئے کئے جانے والے کام کو اندرون اور بیرون سے لاحق ہیں ہم ان بحرانات اور ان خطرات کی سنگینی کو گھٹا کر بھی ہرگز نہیں دیکھتے اور ان کی اسلام کیلئے کئے جانے والے کام پر جو زد پڑتی ہے اس کی اہمیت بھی کم نہیں کراتے۔

مگر ہمارا ایمان ہے کہ حالات کی زمام کار انسانوں کے ہاتھ میں نہیں۔ دوست اور نہ دشمن کسی کا ان پر اختیار نہیں۔ زمام کار خدا کے ہاتھ میں ہے اور مشیئت اسی کی۔ اسی کی تدبیر غالب رہتی ہے۔ **واللہ غالب علی امرہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون** (یوسف:۲۱) *''اللہ اپنے معاملے پر غالب رہتا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں''*۔

یہ اللہ ہی ہے کہ جس نے مقدر ٹھہرا دیا ہے کہ یہ دین زندہ و پائندہ رہے اور کرۂ ارض کے ہر دین پر غالب رہے: **ھو الذی أرسل رسولہ بالھُدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلّہ وَلو کَرِہَ المشر کون** (الصّف:۹) *''وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدیٰ اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ*

اسے ہر دین پر غالب کر دے، اگرچہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔

لیبلغن هذا الأمر ما بلغ الليل والنهار: "اس (دین کا) معاملہ وہاں تک پہنچ کر رہے گا جہاں تک دن اور رات کی پہنچ ہے"۔ (مسند احمد)

خدا کا ٹھہرایا ہوا البتہ رو پذیر ہو کر رہتا ہے، اس کی سنتوں اور قانونوں کی راہ سے جو کہ بدلتے ہیں اور نہ چوکتے ہیں۔ خدا کا ٹھہرایا ہوا رو پذیر ہوتا ہے اس کے وعد اور وعید کی راہ سے اور اس کی مشیئت کی راہ سے جو کہ مطلق آزاد ہے اور جسے روبہ حقیقت ہونے کیلئے کن فیکون کی دیر ہوتی ہے اور جو کہ ان اسباب کو آپ سے آپ پیدا کر لیتی ہے جن کی راہ سے کسی چیز کو جب وہ ٹھہرادی جائے رو پذیر ہونا ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

ان خدائی سنتوں کی رو سے جب ہم معاملے کو دیکھتے ہیں اور خدائی وعدہ و وعید کی رو سے معاملے کو نگاہ میں لاتے ہیں تو میدان میں ہم دو عنصر پاتے ہیں جو کہ باہم برسر جنگ ہیں۔ ایک طرف اسلامی قوتیں ہیں اور دوسری طرف دشمنانِ اسلام ہیں، وہ چاہے صہیونی ہوں چاہے صلیبی اور چاہے ان کے حلیف۔ ان دو متحارب عناصر کی بابت مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں کیا توقع کی جانا چاہیئے؟

جہاں تک اسلامی قوتوں کا تعلق ہے، تو بلاشک وشبہہ یہ اسلامی عمل کی اٹھان کیلئے ایک بڑی محنت کر چکی ہیں۔ پورے عالم اسلام کی سطح پر اور پوری اُمت کے وجود کے اندر اسلامی روح کے عود کر آنے میں ان قوتوں اور تحریکوں کا ایک بڑا حصہ ہے۔ آج مسلم نوجوانوں کی دُنیا میں اسلام کی جانب واپسی کے جو جذبات موجزن ہیں اور دین سے تمسک کی جانب ایک بڑے اعتماد کے ساتھ ان کے قدم اٹھتے ہیں تو یہ حقیقت خدا کے فضل اور مشیئت کے بعد ان تحریکوں کی سعی وجہد ہی کی مرہون منت ہے جو سقوط خلافت سے لے کر اب تک سات آٹھ عشرے سے ہوتی رہی ہے۔

مگر کچھ نقصان دہ امور جو اسلامی کام کے اندر پائے گئے وہ اپنی جگہ ایک بڑی رکاوٹ رہے ہیں جو کہ محنت اور توانائی کو بڑی حد تک بے سمت اور بے اثر کر دینے کا باعث ہے اور عمل کے اندر تر کیز اور اثر اندازی نہ آنے دینے کا سبب۔

تو کیا معاملہ یونہی چلتا رہے گا؟

**قل لا یعلم من فی السماوات والأرض الغیب إلا اللہ** (النمل:٦٥)

*"کہو: کوئی بھی جو آسمانوں میں ہے یا زمین میں غیب نہیں جانتا، سوائے اللہ"۔*

تاہم دو ہی امکان ہیں جو کہ پائے جا سکتے ہیں، یا معاملہ اسی ڈگر پر چلتا رہے، اور یا پھر تبدیل ہو جائے۔

ہم البتہ جس چیز کی اُمید کرتے ہیں وہ یہ کہ ان تلخ حقائق اور تجربات کی روشنی میں کہ جس سے دینی عمل گزر آیا ہے، معاملہ تبدیل ہو کر صحیح صورتحال کی جانب آئے، غلطیوں کی تصحیح اور تلافی کر لی جائے اور ایک صحیح درست منہج پر ازسرنو جادہ پیما ہوا جائے۔

مگر چلیے ہم ان میں سے بدتر احتمال ہی فرض کر لیتے ہیں۔ یعنی یہ کہ دعوت کے میدان میں حالیہ سرگرم حلقے اپنے اپنے مؤقف پر ہی ڈٹے رہتے ہیں یہ گمان کرتے ہوئے کہ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا منہج ہی درست ترین منہج ہے اور باقی سب جو منہج اپنائے ہوئے ہیں بعید از صواب ہیں، یا یہ بنیاد اختیار کرتے ہوئے کہ ان میں سے ہر تحریک اپنے اپنے راستے میں اب جتنا طویل راستہ طے کر آئی ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ واپسی کی اب کوئی صورت نہیں، یا پھر کوئی اور بنیاد اختیار کرتے ہوئے جس کے ذریعے ہر تحریک اپنے اپنے حالیہ مؤقف اور طرز عمل کیلئے وجہ جواز ڈھونڈ لے۔

پھر بھی کیا ہوگا؟ کیا یہ بات خدا کو عاجز کر دینے والی ہے؟ خدا کا ٹھہرا ہوا پورا ہونے پہ آئے تو انسانوں کا اتفاق اور عدم اتفاق غیر متعلقہ ہو جاتا ہے۔

'تبدیلی' کا سامان خدا کی سنتوں میں ہمیشہ ہی موجود رہتا ہے: **وان تتولّوا یستبدل قوماً غیر کُم ثمّ لا یکونوا أمثالکم** (محمد:٣٨) *"اگر تم پھر جاؤ تو اللہ تمہاری بجائے کسی اور قوم کو لے آئے گا جو پھر تم جیسے نہ ہوں گے"۔*

خدا کا اگر یہ فیصلہ ہے کہ اس دین کو زندہ و پائندہ رہنا ہے اور یہ کہ وہ اسے ہر دین پر غالب کر کے رکھے گا، جیسا کہ اس نے اپنی نازل کردہ کتاب میں فرما رکھا ہے، اور اپنی رسولؐ کی زبان سے بھی مختلف پیرایوں میں ہمیں یہ خبر دے رکھی ہے، تو پھر اس وقت دینی کام میں پائے جانے والے منفی عوامل خدا کی اس مشیئت کی راہ میں کھڑے نہیں ہو سکتے۔ اللہ اپنا وعدہ پورا کر کے رہے گا اور اس کے روبہ عمل آنے کے سب اسباب وہ خود پیدا کر لے گا۔ **انّ اللہ بالغُ أمرِہ، قد جعل اللہ لِکلّ شیءٍ قدراً** (الطلاق:٣) *"اللہ اپنا*

کام پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے"۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یـاأیھـا الذین آمنوا مَن یَرتَدّ مِنکم عن دینه فسوف یأتی اللہ بِقَوم یحُبھّم ویُحِبّو نه اَذِلّةٍ علـی المؤمنین اَعِزّةٍ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لَومَةَ لائمٍ ذلک فـضل اللہ یؤتیه مَن یّشاء و اللہ ذوالفضل العظیم (المائدہ:۵۴) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہو گا، جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے، جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گیا ور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے"۔

☆☆☆☆☆☆☆

رہے اعداء، تو آیئے دیکھتے ہیں خدا کی سنتوں اور اس کے وعدو وعید میں سے کیا کیا کچھ ان پر لاگو ہوتا ہے۔

جہاں تک صلیبی مغرب کا تعلق ہے تو خدائی سنتوں میں سے سب سے بڑھ کر جو چیز اُن پر منطبق ہوتی ہے تو وہ ہے: فَلَـمّـا نَسُـوا مـاذُکّرُوا به فتحنا علیھم اَبواب کلّ شيءٍ (الانعام:۴۴) "پھر جب انھوں نے اس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوش حالیوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے"۔

یہ اس لئے کہ دُنیا اُن کی منتہائے آرزو تھی اور یہی ان کی تمام تر سعی کا محور، جس کیلئے انہوں نے خوب خوب محنت کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی اس محنت اور سعی کے بھر بھر کے بدلے دیئے، جو کہ عین اس کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے: مَـن کان یرید الحیوٰۃ الدنیا و زِینَتَھا نوَفّ اِلیھم اَعمالھم فیھـا وَھـم فیھـا لا یُبخَسون (ھود:۱۵) "جو لوگ بس اس دنیا کی زندگی اور اس کی خوش نمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں انہیں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی"۔

اور جو کہ خدائی مشیئت کے عین مطابق ہے، یعنی یہ کہ دُنیا وہ مومن اور کافر ہر دو کو اس کی محنت وسعی کے بقدر دے گا اور یہ کہ اس دُنیا کو وہ کافروں سے روک کر نہ رکھے گا، بلکہ کسی وقت تو وہ ان کو کچھ زیادہ ہی دے دے گا تا کہ وہ کچھ اور بھی زیادہ کفر کر لیں: کلاًّ نُمِدّ ھؤلاء وھؤلاء مِن عطاءِ رَبّک

وما كان عَطاءُ رَبّك مَحظوراً (بنی اسرائیل:۲۰) اِن کو بھی اور اُن کو بھی، دونوں فریقوں کو ہم (دنیا میں) سامانِ زیست دیے جا رہے ہیں، یہ تیرے رب کا عطیہ ہے، اور تیرے رب کی عطا کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ ولا يَحسبَنّ الّذين كفروا انّما نُملِي لهم خيرٌ لأنفسهم، اِنّما نملي لهم لِيَزدادُوا اِثماً ولَهُم عذابٌ مُهِينٌ (آل عمران:۱۷۸) ''یہ ڈھیل جو ہم انہیں دیے جاتے ہیں اِس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتری نہ سمجھیں، ہم تو انہیں اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بارِ گناہ سمیٹ لیں، پھر ان کے لیے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے''۔

پس آج اگر مغرب کو زمین میں تمکن حاصل ہے، اور وہ یہاں اپنے آپ کو برتر سمجھتا ہے، جو کہ خدائی سنتوں کے بموجب ہو رہا ہے، تو یہ خدائی سنتیں ہی ہمیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ کسی کو یہاں تا ابد مواقع اور مہلتیں نہیں ملا کرتی ہیں۔ کفر کے وارے نیارے ایک وقت تک ہوتے ہیں۔ پھر اس کے بعد جب وقت آ جاتا ہے تو خدا کا ٹھہرایا ہوا کچھ اور روپذیر ہو جاتا ہے: فَلَمّا نَسُوا ماذُكّرُوا به فَتَحنا عليهم اَبواب كُلَّ شَيءٍ حتىّ إذا فرِحوا بما اُوتوا اَخَذناهم بَغتَةً فإذاهُم مُبلِسُون، فَقُطِعَ دابِرُ القومِ الذين ظلموا والحمد لله رب العالمين (الانعام:۴۴،۴۵) ''پھر جب انھوں نے اُس نصیحت کو جو انھیں کی گئی تھی بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوش حالیوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انھیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انھیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اِس طرح اُن لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنھوں نے ظلم کیا تھا اور تمام تعریف ہے اللہ ربّ العالمین کے لیے (کہ اُس نے اُن کی جڑ کاٹ دی)''

مگر جس وقت ان پر دُنیا کے سب دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اس وقت بھی وہ تنگیِ زیست سے دوچار ہوتے ہیں جو کہ خدا کی جانب سے ہر اس شخص کیلئے دنیوی وعید ہے جو اس کی جانب سے آئے ہوئے پیغام سے اعراض برتے: وَمَن اَعرَضَ عَن ذِكرِي فاِنّ لَه مَعِيشَةً ضَنكاً وَنَحشُرُهُ يومَ القِيامَةِ اَعمىٰ (طٰہٰ:۱۲۴) اور جو میرے ''ذِکر'' (درسِ نصیحت) سے منہ موڑے گا اُس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔

مغرب، جس پر آج مادی تمکن کے سب دروازے وا کر دیئے گئے ہیں، جس تنگیِ زیست سے دوچار ہے وہ ہے وہاں پایا جانے والا ذہنی اضطراب، نفسیاتی عارضے، خودکشی رجحانات، اعصابی امراض،

کثرتِ شراب نوشی، منشیات اور جرائم، ایڈز اور نئے سے نئے پیدا ہونے والی وبائیں اور آفتیں اور امراض جو آج سے پہلے پائے ہی نہ جاتے تھے یا کم از کم وباؤں کی صورت اختیار نہ کرتے تھے، علاوہ ازیں معاشی، سیاسی، جنگی اور فکری بحران...... وجہ یہ کہ برکت اور اطمینانِ قلب کا دروازہ ان دروازوں میں شامل نہیں جو کفار پر اس وقت جب وہ خدائی پیغام کو بھلا ڈالتے ہیں، چوپٹ کھول دیئے جاتے ہیں۔ 'برکت' اور 'اطمینانِ قلب' کے دروازے بہر حال اہل ایمان ہی کے ساتھ خاص ہیں جن کی راہ سے اللہ اہل ایمان پر نعیم آخرت سے پہلے اس عالمِ دُنیا میں بھی اپنا فضل کرتا ہے: وَلَوْ اَنَّ اَهلَ الْقُرىٰ آمَنوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحنا عليهِم بركٰتٍ مِنَ السماء والارض (الاعراف:۹۶) اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم اُن پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے......

الذين آمنوا وتَطْمَئنّ قُلوبُهم بِذِكْرِ الله، اَلا بِذِكْرِ الله تَطْمَئِنّ القُلوب. الذين آمنوا وعملوا الصّٰلحات طُوبىٰ لهم وحُسْنُ مآب (الرعد:۲۸،۲۹) *"اور اُن کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔ پھر جن لوگوں نے دعوتِ حق کو مانا اور نیک عمل کیے وہ خوش نصیب ہیں اور اُن کے لیے اچھا انجام ہے"*۔

مختصر یہ کہ مغرب کو آج مادی قوت کے سب وسائل حاصل ہیں مگر وہ اس حالت کو باقی رکھنے کی قدرت بہر حال نہیں رکھتا کیونکہ وہ ان عوامل سے تہی دامن ہے جنہیں رکھنے والوں کیلئے اللہ تعالیٰ پائندگی لکھ دیتا ہے......اور جو کہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہے اور عملِ صالحات......

بلاشبہ ان لوگوں کے ہاں اعمالِ صالحہ بھی پائے جاتے ہیں مانند سماجی خدمات، انسانی بقاء کیلئے طبی خدمات، زندگی کی راہیں آسان کرنے کے کئی ایک مظاہر جو کہ عالمِ انسان کو بعض تنگیوں اور مشقتوں سے نجات دلاتے ہیں وغیرہ وغیرہ...... مگر بات یہ ہے کہ تاریخ میں جو بھی جاہلیتیں گزر چکی ہیں ان میں سے کوئی جاہلیت بھی اعمالِ صالحہ سے یکسر خالی نہیں رہی اور اس کے بہت سے افراد کئی اچھے کام کرتے ہی رہے ہیں۔ مگر ایک تو، صرف اس امر کے سبب اس سے جاہلیت کی صفت ساقط نہیں ہو جاتی، کیونکہ جاہلیت کی صفت انسان سے اس وقت تک نہیں جاتی جب تک کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لے آتا اور جب تک کہ وہ 'ما انزل اللہ' کا اتباع اختیار نہیں کر لیتا اور دوسرا، ایک سیاہ لبادے پر، جو کہ شر سے پُر ہے، پائے جانے والے منتشر سفید نقطے جتنے بھی سراہے جائیں لبادے کی حقیقت بدل ڈالنے

کے معاملے میں کفایت نہیں کرتے اور یہ جاہلیت اپنے روا رکھنے والے کو خدائی سنتوں سے تحفظ دلانے کی بھی ضمانت نہیں، خواہ مہلت کا عرصہ کتنا ہی دراز کیوں نہ ہو جائے۔

وہ الحاد جو آج کی مغربی تہذیب دُنیا کے اندر پھیلا رہی ہے، وہ اخلاقی پستی اور غلاظت جو اس کے ذرائع ابلاغ نشر کر رہے ہیں، شہوانیت میں غرق ہو جانے کی جو تحریک اس نے چلا رکھی ہے، زندگانی دُنیا کو مزین کر کے پیش کرنے اور آخرت کو فراموش کرانے کی سعی جس سطح پر یہ کر رہی ہے اور 'خدا' کو ہر حساب کتاب سے باہر رکھنے اور خدا کی اس صفت کو کہ وہ انسان کے ہر ہر عمل کو دیکھتا اور لکھتا ہے اور اس کی ہر ہر حرکت کا عنقریب حساب کرنے والا ہے، یکسر بھلا دینے کی جو فضا اس کے زیر انتظام قائم ہوئی ہے اور مسلسل روبہ ارتقا ہے...... یہ سب وہ باتیں ہیں جو ایک تہذیب کو اس قابل نہیں رہنے دیتیں کہ اللہ اس کو زمین میں پائندہ رکھے، اگرچہ وہ اس کو مہلت دے اور مہلت کا یہ عرصہ، جس قدر اس کی حکمت کا اقتضا ہو، دراز کر دے۔

اور یہ صرف ہم نہیں جو اپنے 'جذبات' کے زیر اثر یا محض اپنے 'خوابوں کی تعبیر' کے طور پر یہ بات کرتے ہیں۔ کچھ عشرہ بیشتر برٹرنڈ رسل کہہ چکا ہے: ''گورے کی تہذیب ختم ہوئی۔ کیونکہ گورے کے پاس دینے کیلئے اب کچھ باقی نہیں رہا''۔

اس سے پہلے الکسیس کا ریل کہہ چکا ہے: ''یہ تہذیب بہت جلد اپنے سقوط کو پہنچنے والی ہے''۔

کل ابھی ہم کمیونزم کے زمیں بوس ہونے کا نظارہ کر آئے ہیں۔ اب آج یہ حال ہے کہ مغربی جرائد ہی، جن میں کہ امریکی جرائد بھی آتے ہیں، یہ بحثیں کر رہے ہیں کہ کیا امریکہ کا زوال شروع ہو چکا ہے؟

البتہ ہم اتنے سادہ بھی نہیں کہ یہ سوچنے لگیں کہ یہ واقعہ کل صبح تک رونما ہو چکا ہوگا۔ بلاشبہہ اس جاہلی تہذیب کو اب بھی کچھ ایسے عوامل حاصل ہیں جو خدائی سنتوں کی رو سے اس کی عمر میں ابھی کچھ اور توسیع کراتے رہیں: منظّم عمل کی حیران کن صلاحیت، کام کرنے میں بلا کی محنت اور مہم جوئی، پرفارمنس میں عمدگی اور معیار قائم رکھنے کی شدید لگن اور منصوبہ بندی کی زبردست صلاحیت رکھنا...... اور ان سب باتوں سے پہلے، اس ''تہذیبی متبادل'' کا ابھی منصۂ شہود پر ہی نہ آیا ہونا جس کا ظہور اس تہذیب کے سقوط میں تیزی لے آنے کا سبب بنے!

مگر یہ سب باتیں ایک حتمی انجام کو صرف مؤخر کر سکتی ہیں، ٹال نہیں سکتیں، کیونکہ ایسی تہذیبوں کا گر جانا خدائی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

اور جہاں تک یہود کا معاملہ ہے، تو وہ اور بھی مختلف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلت اور مسکنت لکھ دی ہے، جو کہ ان کے اپنے ہی کئے کے سبب ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے اس معاملے میں استثناء یا پھر استثناءات بھی رکھ دی ہیں: وَقَضَيْنَا اِلٰى بنى اسرائيل فى الكتٰب لَتُفْسِدُنّ فى الاَرْضِ مرّتَيْنِ ولَتَعْلُنّ عُلُوّاً كبيراً، فَاِذا جاءَ وَعْدُ اُوْلٰهُما بَعَثنا عَلَيْكُم عِباداً لَنا اُولى بأسٍ شَديدٍ فجاسُوا خِلٰلَ الدّيَارِ، وَكان وَعْداً مَّفْعولًا، ثمّ رَدَدْنا لَكُمُ الكَرّةَ عليهم واَمْدَدْنكم بِاَموالٍ و بنينَ وجعلنكم اَكْثَرَ نفيراً، اِنْ اَحْسَنْتُم اَحْسَنْتُم لِاَنْفُسِكم وَاِنْ اَسأْتم فَلَها، فَاِذا جاءَ وَعْدُ الآخِرةِ لِيَسوؤا وُجوهَكم وَلِيَدْخُلوا الْمسجدَ كَما دَخَلوه اَوّلَ مَرّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا ما عَلَوْا تَتْبيراً، عَسىٰ رَبكم اَنْ يّرْحَمَكم وَاِنْ عُدتُّم عُدْنا (بنی اسرائیل:۴-۸) *"پھر ہم نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل کو اس بات پر متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فسادِ عظیم برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ آخر کار جب اُن میں سے پہلی سرکشی کا موقع پیش آیا، تو اے بنی اسرائیل ہم نے تمہارے مقابلے پر اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا۔ اِس کے بعد ہم نے تمہیں اُن پر غلبے کا موقع دے دیا اور تمہیں مال اور اولاد سے مدد دی اور تمہاری تعداد پہلے سے بڑھا دی۔ دیکھو! تم نے بھلائی کی تو وہ تمہارے اپنے ہی لیے بھلائی تھی، اور برائی کی تو وہ تمہاری اپنی ذات کے لیے برائی ثابت ہوئی۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں اُسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر اُن کا ہاتھ پڑے اُسے تباہ کر کے رکھ دیں۔ ہو سکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے، لیکن اگر تم نے پھر اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو ہم بھی پھر اپنی سزا کا اعادہ کریں گے....."*

اسی طرح ایک اور مقام پر یہودیوں پر ذلت اور رسوائی کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ضُرِبَتْ عليهمُ الذِّلّةُ اينَ ماثُقِفوا اِلّا بِحَبلٍ مِنَ اللهِ وحَبْلٍ مِنَ النّاس (آل عمران:۱۱۲) "یہ

*جہاں بھی پائے گئے اِن پر ذلت کی مار ہی پڑی، کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے"۔*

اب اس وقت وہ اپنی ان اشتناؤں کے عروج پر ہیں جن کا اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے۔قریب قریب پوری دُنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔حکمرانوں کو مہروں کی طرح چلاتے ہیں۔اپنی پالیسیاں ان پر مسلط کرتے ہیں۔جس سے ناراض ہو جائیں اس کو بے تاج بھی کر دیتے ہیں۔جوان کے راستے میں آئے اسے قتل تک کرا دیتے ہیں، کینیڈی ایسے صدر کو نہیں بخشتے......مگر یہ جتنا کچھ بھی ہے محض ایک قاعدے سے 'استثنا' ہے! وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ (الاعراف:١٦٧) *"اور یاد کرو جب کہ تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ "وہ قیامت تک برابر ایسے لوگ بنی اسرائیل پر مسلط کرتا رہے گا جو اُن کو بدترین عذاب دیں گے"۔*

دائمی قاعدہ یہی ہے۔اس کے سوا جو ہے وہ بس 'استثناء' ہے۔'استثناء' کی خاصیت یہ ہوا کرتی ہے کہ وہ دائمی نہ ہو کیونکہ وہ قاعدے کے خلاف آیا کرتا ہے!

قاعدہ خدا کا ٹھہرایا ہوا ہوتا ہے۔استثناء بھی اس کا ٹھہرایا ہوا ہوتا ہے۔مگر استثناء اپنا وقت پورا کرتا ہے تو معاملہ پھر دائمی قاعدہ پر ہی آ رہتا ہے جو کہ خدائی وعدہ و وعید کا تقاضا ہو۔

ہوسکتا ہے ہم ان استثناؤں کے پیچھے کارفرما خدا کی حکمت کا ادراک نہ کر پائیں جو کہ آیاتِ کتاب میں ذکر کر دی گئیں لیکن ان کا وقوع ہونا بہرحال طے ہے چاہے ہم ان کی حکمت سمجھیں یا نہ البتہ یہ ادراک ضروری ہے کہ ہے یہ قاعدہ سے استثناء اور یہ کہ یہ استثناء ایک خاص وقت تک ہی رہ سکتا ہے۔

یہود خود یہ بات جانتے ہیں۔کسی اور مصدر سے نہیں خود اپنی ہی کتابوں سے!

☆☆☆☆☆☆☆

اب معاصر جاہلیت بہ مقتضائے سنت خداوندی اور اپنے اس فساد کے سبب جس کا یہ عالم میں ذریعہ بنی رہی ہے روبہ خاتمہ ہوگی تو انسانیت کو ایک متبادل کی ضرورت ہوگی جو اس خلا کو پُر کرے۔

'متبادل' اسلام کے سوا کیا رہ گیا ہے؟ اسلام ہی ہے جو زمین پر بھلائی کا دور واپس لے آئے، اہل زمین کو عافیت اور شفائے امراض کی راہ پر گامزن کر سکے: يا أهل الكتاب قد جاء كم رسولنا يبين لكم كثيراً مما كنتم تُخفون من الكتٰب ويَعفوا عَن كثيرٍ، قد جاء كم من الله نورٌ و

کتٰبٌ مبینٌ، یھدی به الله مَنِ اتَّبَعَ رضوانه سُبُلَ السّلام ویُخرِجھم مِنَ الظُّلمٰت اِلی النّور باِذنه ویھدیھم اِلیٰ صِراطٍ مُستقیم (المائدہ:۱۵-۱۶) ''اے اہل کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس آ گیا ہے جو کتابِ الٰہی کی بہت سی اُن باتوں کو تمہارے سامنے کھول رہا ہے جن پر تم پردہ ڈالا کرتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر جاتا ہے۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آ گئی ہے اور ایک ایسی حق نُما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے اُن کو اندھیروں سے نکال کر اُجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف اُن کی رہنمائی کرتا ہے''۔

اسلام ہی وہ کامل اور قدیم منہج ہے جس میں کہیں بھی کوئی ٹیڑھ نہیں جبکہ جاہلیت کے سب مناہج کہیں نہ کہیں ٹیڑھے ہو جاتے ہیں اور خلقت سمیت ڈوبتے ہیں۔

اس وقت بھی یہ حالت ہے کہ ہر سال لاکھوں انسان ان ظلمتوں اور تاریکیوں سے بھاگ کر جن میں وہ آج تک قید رہے اسلام کی روشنی میں پناہ لینے لگے ہیں۔ کچھ اس وجہ سے نہیں کہ مسلمانوں کی صورت میں انہیں اسلام کا کوئی ایک زندہ نمونہ نظر آ رہا ہے اور وہ اس کی پیروی کرنے آتے ہیں، آج کی اس صورتحال میں مسلمان کسی معاشرتی سطح پر ایسا نمونہ پیش کر ہی نہیں رہے جس کی کشش میں لوگ اسلام کی طرف آئیں بلکہ وہ نمونہ تو جو مسلمانوں کی جانب سے پیش کیا گیا ہے الٹا لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کر دینے والا ہے...... پس یہ لوگ جو آج اسلام کی جانب آ رہے ہیں اس سرگردانی اور بے مقصدیت کے ڈسے ہوئے ہیں جس سے خلاصی پانے کیلئے وہ اپنے ماحول سے بھاگتے ہیں تو انہیں اسلام میں پناہ نظر آتی ہے۔

مغرب کے پاس سائنس ہے اور مادی فوقیت ہے۔ مگر روح سے عاری ہے...... روح جو کہ خدا کا پتہ مانگتی ہے اور خدا کی ہدایت سے راہ پاتی ہے۔ یہ روح اسلام کے پاس ہے۔ اسلام کا حسن البتہ یہ ہے کہ وہ اس روح کو سائنس اور مادی ترقی کا 'متبادل' بھی نہیں بناتا بلکہ ان دونوں کو 'جڑواں' بناتا ہے جو ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں اور زمین پر ایک 'مکمل تہذیب' کی اساس رکھتے ہیں: اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰئِکَةِ اِنِّی خٰلِقٌ بشراً مِن طِینٍ فَاِذا سَوَّیته و نفختُ فیه مِن رُّوحِی فَقَعوا لَه سٰجدین (ص:

۷۱۔۷۲) ”جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ“۔

’قبضۂ خاک‘ اور ’نفخۂ روح‘ مل کر ’انسان‘ کو وجود دیتے ہیں۔ انسان کی تکمیل انہی دو عنصروں میں ہم آہنگی آ جانے کی مرہون منت ہے۔ یہیں سے وہ ’ہدایت یافتہ انسان‘ برآمد کرایا جا سکتا ہے جو بصیرت اور راستی کی بنیاد پر یہاں زمین کی تعمیر کرے اور عین اس عمل کے دوران اس کی نگاہیں یوم آخرت پر مرکوز ہوں۔ ’زندگی‘ انہی دو سمتوں سے تشکیل پاتی ہے: هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولاً فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ (الملک:۱۵) ”وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو تابع کر رکھا ہے، چلو، اُس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق، اُسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے“۔ اسی ورح فرمایا: وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (القصص:۷۷) ”جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر“۔

وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ، وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (التوبہ:۷۲)

”ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انھیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان سدا بہار باغوں میں ان کے لیے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انھیں حاصل ہوگی۔ یہی بڑی کامیابی ہے“۔

اسلام ہی وہ نجات دہندہ ہے جس کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی کہ انسانیت آج ضرورت مند ہے اور جس کیلئے یہ بے حال ہو رہی ہے......

برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ چارلس برطانوی وزارت خارجہ کے سیمینار ہال میں ایک پر مغز لیکچر دیتے ہیں (بہ تاریخ دسمبر ۱۹۹۶ء) جس میں کہ وہ امکانات جو ابھی اوپر بیان ہوئے نہایت کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ شہزادہ چارلس کے لیکچر میں کہا گیا:

> ”دور حاضر کی اس مادیت کو توازن کا ایک شدید فقدان لاحق ہے۔ اس کے دور رس ضرر رساں مضمرات روز بروز بڑھ رہے ہیں...... پچھلی تین صدیوں کے دوران ــــ کم از کم

مغرب کے اندر ــــ ہم اس معاملہ میں منقسم ہو چکے ہیں کہ اپنے وجود اور گردوپیش کی دُنیا کو کیونکر دیکھا جائے۔ سائنس نے ہماری عقول پر کچھ ایسی اجارہ داری بلکہ استبدادی سطوت قائم کر لی ہے کہ کائناتی وجود کو دیکھنے کیلئے ہمارے پاس بس اب یہی طریقہ باقی رہ گیا ہے۔ سائنس اور ایمان کے راستے ہمارے ہاں جدا جدا ہو گئے ہیں۔ اور اب ورڈزورتھ کے بقول ہماری وہ حالت ہو گئی ہے کہ ہم اس مادرِ قدرت mother nature کا وہ بہت ہی چھوٹا سا حصہ دیکھنے کے قابل رہ گئے ہیں جو ہمارے سامنے ہی آ جائے۔

سائنس کوشش کرنے لگی ہے کہ 'نیچر' کو 'خالق' سے تنہا کر دے جس سے کہ وجود کے حصے بخرے ہو گئے۔ 'مقدسات' کو ہمارے شعور کی مملکت میں ایک بہت ہی ثانوی حیثیت دے کر دور دراز گوشے میں محدود اور ہماری روزمرہ زندگی سے لاتعلق کر دیا گیا ہے۔ اب جا کر ہی ہم اس کے تباہ کن نتائج کا اندازہ کرنے لگے ہیں۔ لگتا ہے ہم ــــ فرزندانِ عالمِ مغرب ــــ وجود کا ایک جامع مفہوم رکھنے سے ہی محروم ہو گئے ہیں اور اس وسیع کائنات میں جو کہ خدا کی تخلیق ہے اپنے کردار اور ذمہ داری کا تعین کرنے کے ہی قابل نہیں رہے۔ یہاں تک کہ اب ہم پچھلے زمانوں سے چلے آنے والے ورثے اور زمانۂ قدیم سے انسان کے ہاں پائی جانے والی حکمت اور دانائی کی قدر کرنے بلکہ اس کا ادراک کرنے تک میں ناکام ہو رہے ہیں جبکہ وہ انسانی ورثہ طویل صدیوں پر مشتمل ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس ورثہ کی ہمارے ہاں شدید مخالفت پائی جاتی ہے، گویا یہ کوئی قابل نفرت کوڑھ پن ہے جو معاشرہ کی سطح پر پایا گیا۔

میری نظر میں، بہت ضروری ہے، کہ وجود کی ایک کلی اور جامع تفسیر کی جائے۔ سائنس نے ایک خدمت ہماری بہت اچھی کر دی ہے اور وہ یہ کہ اس نے ہمیں اندازہ کرایا کہ یہ کائنات اس سے کہیں عمیق تر اور پیچیدہ تر ہے جتنی کہ اس سے پہلے ہم سمجھتے تھے۔ البتہ سائنس اپنی اس مادی صورت میں یکطرفہ طور پر، ہمیں ہر چیز کی تفسیر کر کے نہیں دے سکتی۔ اس دُنیا کے خالق کو محض کسی ریاضی دان سے تشبیہہ دینا درست

نہیں جیسا کہ نیوٹن کا خیال تھا۔ اس کو محض گھڑیال ساز [1] کی حیثیت دے لینا کافی نہیں۔ وہ جدائی جو سائنس وٹیکنالوجی کے مابین اور قدروں اور اخلاقی پیمانوں اور مقدسات کے مابین ڈال دی گئی ہے آج وہ اپنی ایک خوفناک صورت کو پہنچ چکی ہے۔ جس کے مظاہر کبھی ہم جینیات (genetics) میں انسانی مداخلت کی صورت میں دیکھتے ہیں اور کبھی ٹیکنالوجی کے پیدا کردہ اس گھمنڈ میں جو اپنی ایک بدترین صورت میں گائیوں کے باؤلے پن کی صورت میں ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

میں ہمیشہ سے یہ محسوس کرتا رہا ہوں کہ انسانی ورثہ وترقی انسان کی اپنی تخلیق نہیں بلکہ یہ ایک فطری الہام ہے جو کائنات کا خالق ہم پر کرتا رہا ہے کہ ہم قدرت کے راز پائیں اور اُس ہم آہنگی کا ادراک کریں جو (اس کی تدبیر سے) متفرق اجزا میں ایک خوبصورت ربط لے آتی ہے اور یہ بات سب کے سب مظاہرِ قدرت پر صادق آتی ہے۔ انسانی سفر میں جو راستے سمیٹے گئے وہ ہمیں اس راز کا پتہ دیتے ہیں جو کائنات کے اندر ایک ابدی نظم کی عکاسی کرتا ہے اور جو کہ ہمیں دعوت دیتے ہیں کہ ہم اس ناپیدا کنار کائنات کے پیچھے کارفرما کچھ عظیم حقائق کا ادراک کریں۔ تا کہ ــــ بقول ولیم بلیک ــــ ایک پوری کائنات کو ایک 'ذرے' کے اندر دیکھ لینے کی صلاحیت پائیں اور زمانے کی وسعتوں کو ایک 'لمحہ' کے اندر......

البتہ اسلامی ثقافت نے اپنے تاریخی ورثہ کا تسلسل برقرار رکھتے ہوئے یہ سعی کی ہے کہ روحانیت اور جامعیت پر مبنی وہ نگاہ اس کے ہاں باقی رہے جو وجود کی ایک کلی تفسیر کرے۔ اسلامی ثقافت نے اپنی یہ صلاحیت کچھ اس انداز سے برقرار رکھی ہے جو ہمارے مغرب میں پچھلی کچھ نسلوں کے ہاں زمانے کا ساتھ دے پائی اور نہ تطبیق کے

(۱) نیوٹن کا نظریہ تھا کہ خدا نے کائنات کو کسی بہت ہی باریک بیں گھڑی ساز کی طرح بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ کائنات کی صورت میں ایک بہت بڑا گھڑیال بنا دینے والے خدا کیلئے نمازیں اور عبادتیں کرنے کی البتہ کوئی ضرورت یا افادیت نہیں۔ اس کے خیال میں گھڑیال ساز چاہے بھی تو اس کی حرکت کی جہتیں اب تبدیل نہیں کرسکتا۔

قابل رہی۔ اس سلسلہ میں عالم اسلام کے زاویۂ نگاہ میں وہ بہت کچھ ہے جو کہ اس سے سیکھا جا سکتا ہے۔

بلاشبہ آج ہم ضرورت مند ہیں، مسلم معلموں کے جو ہمیں سکھائیں کہ جہاں ہم عقول کے ذریعے آگہی پاتے ہیں وہاں کس طرح ہم قلوب کے ذریعے بھی آگہی پانے کے قابل ہوں۔ کیا بعید یہ تیسرا میلینیم جو کہ آرہا ہے مثالی حد تک حوصلہ افزا ثابت ہو کہ ہم ان رشتوں کو تلاش کر سکیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ ہم پاس آیا ہوا یہ موقع گنوا نہ دیں کہ حقیقت اور وجود کو پورا دیکھنے کیلئے وہ زاویۂ نگاہ جو ایک روحانی پہلو پہ سہارا کرتا ہے ہم (اہلِ مغرب) بھی آج اسے ازسرِ نو دریافت کر سکیں"۔ (۱)

☆☆☆☆☆☆☆

اسلام ہی نجات دہندہ ہے اور اسلام ہی اب آئندہ متبادل......

خدائی تقدیر ایک غیبِ محض ہے مگر اُس کے کچھ آثار بھی کسی وقت نمایاں ہو جاتے ہیں۔

خدائی تقدیر اگر یہی تھی کہ یہ دین (اپنی تاریخی حیثیت میں) زمین کے اندر ایک قصہ ماضی بن رہے تو پھر وہ صلیبی مکر و منصوبہ جو دولتِ عثمانی کے خاتمہ اور خلافت کے سقوط پر منتج ہوا تھا وہ اِس دین کو (اِس کی اُس تاریخی حیثیت میں) ایک داستانِ ماضی بنا دینے کیلئے بہت کافی تھا۔ بلکہ صیہونیت و صلیبیت نے تو اُس روز یہ سمجھ بھی لیا تھا کہ وہ اپنے اس صدیوں پرانے دشمن کو واقعتاً زیر کر لینے کے بعد اُس کا کام تمام کر چکی ہے! مگر خدائی تقدیر کچھ اور نکلی...... چند ہی سالوں میں اُن کے سامنے اسلامی بیداری کی تحریک کھڑی تھی!

اس اسلامی بیداری سے جب صلیبیت و صیہونیت غضبناک اور حواس باختہ ہوئی تو پھر اِس پر قہر ڈھانے لگی...... قید، تشدد، اذیت، قتل، گوشمالی، جو جو بس چلا کر گزری...... یہ سوچتے ہوئے کہ وہ دشمن جو اُس ضرب سے نہیں مرا جسے یہ کاری سمجھ چکی تھی اب اُس سے جان چھڑانے کا یہی طریقہ ہے۔ مگر خدائی تقدیر کچھ اور نکلی...... اس ظلم و تشدد کے باعث یہ تحریک زمین کے سبھی خطوں کے اندر پھیل گئی!

(۱) از جریدہ "الشرق الاوسط"، شمارہ نمبر ۶۵۹۲، مؤرخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۹۶ء

سب کے سب آثار کچھ کہہ رہے ہیں تو وہ یہی کہ اسلام ہی آئندہ کا متبادل ہے جو کہ اُس فساد کی جو کہ جاہلیت نے زمین میں ڈال دیا ہے اصلاح کرے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

اسلام بہرحال آرہا ہے، خواہ دونوں میں سے جس راستے سے بھی آئے: خواہ اُس راستے سے جو پُر امن ہے، آہستہ رو ہے اور بتدریج آنے والا ہے...... جس کو کہ ہم خود ترجیح دیتے اور پسندیدہ جانتے ہیں اور اسی کے ہم داعی ہیں، خواہ اُس کے مرحلۂ تمام کو پہنچنے کیلئے کئی نسلیں درکار ہوں......

اور خواہ زور اور شدت کے راستے سے جیسے کہ مغرب کی اپنی ہی حماقتیں اور پھر اسرائیل کی حماقتیں بھی، اور سے اور ہوا دے رہی ہیں!

آج جو صلیبیت وصیہونیت کرۂ ارض پر اقتدار رکھتی ہے، اپنی حماقتوں کے سبب خود اپنے مفادات کا بھی نقصان کر رہی ہے۔ جس وحشت سے یہ اسلامی تحریکوں پر ظلم ڈھا رہی ہے اس سے اسلام کیلئے کئے جانے والے کام کو ایسی نسلیں میسر آرہی ہیں جو کہ ان نسلوں سے کہ جن کے خلاف یہ اس وقت برسر جنگ ہے، کہیں زیادہ جفاکش، کہیں زیادہ لمبا چلنے والی، کہیں زیادہ ہوش منداور کہیں زیادہ تجربہ کار ہوں!

ان کے عقلاء اس سے پوری طرح باخبر ہیں۔ وہ اپنی قوموں کو اس سے خبردار بھی کرتے ہیں۔ مگر وہ بغض اور کینہ جو یہ دِلوں میں چھپائے ہوئے ہیں انہیں اس حقیقت سے اندھا کئے جا رہا ہے۔ اب یہ ہر نصیحت کے سامنے بہرے ثابت ہو رہے ہیں چاہے وہ نصیحت ان کے اپنے ہی عقلاء کی جانب سے آرہی ہو!

یہ سب کچھ کسی خدائی تقدیر سے ہو رہا ہے اور پھر خدائی سنتوں کے عین مطابق! **وسکنتم في مساكن الذين ظلموا انفسهم وتبين لكم كيف فعلنا بهم وضربنا لكم الأمثال وقد مكروا مكرهم** (ابراہیم: ۴۵-۴۶) ”حالانکہ تم ان قوموں کی بستیوں میں رہ بس چکے تھے جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا اور دیکھ چکے تھے کہ ہم نے ان سے کیا سلوک کیا اور ان کی مثالیں دے دے کر ہم تمھیں سمجھا بھی چکے تھے۔ انھوں نے اپنی ساری ہی چالیں چل دیکھیں......“

تاریخ میں جتنے بڑے بڑے دھماکے ہوئے ہیں تو وہ تب جب دنیا کے سرکشوں نے کسی زور سے اٹھتی لہر کو دبا دینے کی کوشش کی۔ سرکش اس پر دباؤ بڑھاتے چلے جاتے ہیں کہ وہ ختم ہو کر رہ جائے۔ تب سرکشوں کا پیدا کیا ہوا وہ دباؤ ہی اس دھماکے کو وجود میں لے آنے کا سبب بن جاتا ہے جس کا کہ سرکش پھر خود ہی شکار ہو جاتے ہیں!

آج صلیبیت اور صیہونیت ـــــ اپنی حماقت سے ـــــ جو کر رہی ہے یہ وہ اس خاص نوعیت کا دباؤ ہے جو کسی دھماکے کا پیش خیمہ بنا کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

پس ہم دیکھتے ہیں کہ تقدیر کی ایک ہی ضرب سے تین امور بیک وقت انجام پا رہے ہیں۔

(۱) اُمت مسلمہ کو اپنی اس تفریط اور کوتاہی پر جو وہ خدا کے دین کے حق میں کرتی آئی ہے، سزا مل رہی ہے۔

خدا نے دراصل اس اُمت کو ایک ایسی امانت اٹھوائی ہوئی ہے جو کہ تاریخ میں اس سے پہلے کسی اُمت کو نہیں اٹھوائی اور وہ یہ کہ اس کو خاتم الانبیاء کی اُمت بنایا۔ دورِ ختم نبوت کی اُمت ہونا ہی وہ امانت ہے جو اس اُمت کو خیر أمة بناتا ہے اور سابقہ اُمتوں پر اس کو فضیلت و برتری دلواتا ہے: كنتم خير اُمّةٍ اُخرِجتُ للنّاس تاَمرون بالمعروف وتنهَون عَنِ المنكرِ و تؤمنون بالله (آل عمران:۱۱۰) ”اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو“۔

وكذلك جعلنٰكم اُمّةً وَسطاً لِتكونوا شُهَداءَ على النّاس ويكونَ الرَّسول عليكم شَهيداً (البقرۃ: ۱۴۳) *”اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک اُمتِ وسط بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو“۔*

مگر زمانے کا ایک عرصہ یوں گزرا کہ یہ اُمت (ایک بڑی سطح پر) اس امانت سے غافل پائی گئی۔ اپنا مشن بھول گئی، نہ صرف نوعِ انسانی سے متعلق اپنا مشن بھلا دیا بلکہ خود اپنے متعلق جو اس کا کوئی مشن تھا وہ بھی بھلا دیا...... تب مشیئت الٰہی کو تقاضا ہوا کہ اسے دشمنوں کے ہاتھوں سزا دلوائی جائے، جس

سے کہ اس اُمت کے رسولؐ نے اسے خبردار کردیا تھا:

**یُوشِکُ اَنْ تَداعیٰ علیکم الاُمَمُ کماتداعیٰ الاَکَلة اِلیٰ قصعتها قالوا: اَمِن قِلَّةٍ نَحن یَومَئِذٍ یا رسولَ الله ؟ قال: "بَل اَنتم یَومَئِذٍ کثیر، ولکِنَّکم غُثاء کغُثاء السَّیْل، وینزِعَنَّ الله المَهابَةَ مِن صُدورِ اَعدائِکم، ولَیَقْذِفَنَّ فی قُلوبکم الوَهْن" قالوا: وما الوَهْنُ؟ قال: "حُبّ الدُّنیا و کَراهِیَة الموتِ"**[1]

*"عنقریب دُنیا کی قومیں تم پر یوں ٹوٹ پڑیں گی جیسے بھوکے کھانے کے تھال پر ٹوٹ پڑتے ہیں"۔(صحابہ نے) عرض کی: کیا یہ اس لئے کہ اس روز ہم بہت تھوڑے ہوں گے، اے اللہ کے رسولؐ؟ فرمایا: نہیں بلکہ تعداد میں تو تم بہت زیادہ ہو گے مگر سطح آب پر خس وخاشاک کی طرح گھاس پھوس ہو گے۔ اللہ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت ختم کرادے گا اور تمہارے دِلوں میں وہن ڈال دے گا، عرض کی 'وہن' کیا ہوگا اے اللہ کے رسولؐ؟ فرمایا: دُنیا میں دِل ہونا اور موت سے جی چرانا"۔*

(۲) جس دوران اس اُمت کو اس کے دشمن کے ہاتھوں سزا دلوائی گئی، اس دوران اس دشمن کو زمین میں تمکین دلوادی گئی، تا کہ ایک دوسری خدائی سنت ظہور میں آئے اور وہ یہ کہ خدا کے ساتھ کھل کھلا کر کفر کرنے والوں پر دُنیا کے دروازے کچھ دیر چوپٹ کھول دیئے جائیں اور اس خاص لمحے کے آنے تک جب ان کو زمین کے اندر اپنے کروفر، اپنے اعراض، اپنی سرکشی اور جبر وستم پر سزا دی جائے گی، اور جو کہ قیامت کی سزا کے علاوہ ایک سزا ہو سکتی ہے، اس لمحہ کے آنے تک ان کو زمین میں جرائم کرنے کا خوب خوب موقعہ دیا جائے:

**لِیَحمِلوا اَوْزارَهُم کامِلةً یوم القِیامة ومِن اَوْزارِ الّذین یُضِلّونهم بغیر علمٍ اَلاساءَ ما یَزِرون** (النحل:۲۵)

*(یہ باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں) 'تا کہ قیامت کے روز اپنے بوجھ بھی پورے اٹھائیں اور ساتھ ساتھ کچھ اُن لوگوں کے بوجھ بھی سمیٹیں جنھیں یہ بربنائے جہالت گمراہ کررہے ہیں۔ دیکھو! کیسی سخت ذمہ داری ہے جو یہ اپنے سر لے رہے ہیں"۔*

(۱) حدیث کا حوالہ پیچھے گزر چکا۔

ولا یحسبن الذین کفروا انَّما نُملِی لهم خَیرٌ لأنفسهم اِنَّما نُملِی لهم لِیزدادُوا اِثْماً ولهم عذابٌ مُّهینٌ (آل عمران:۱۷۸)

"یہ ڈھیل جو ہم انھیں دیے جاتے ہیں اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتری نہ سمجھیں، ہم تو انھیں اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بارِ گناہ سمیٹ لیں، پھر اُن کے لیے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے"۔

(۲) پھر اسی دوران ہی، اس عمل کے نتیجے میں اہل ایمان کی تمحیص ہو جائے۔ یہ اپنے ایمان میں پختہ اور عمیق ہو جائیں اور آزمائش کے اس عمل سے گزر جائیں جس کے بعد ان کو ایک بڑی ذمہ داری اٹھوائی جاتی ہے: ولیمحص اللہ الذین آمنوا ویمحق الکفرین : (آل عمران:۱۴۱) "اور وہ اِس آزمائش کے ذریعہ سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا ہے"۔

موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے محلات میں رہ کر پرورش پانا اور پھر بعد کے کچھ مرحلوں سے گزرنا قدر خداوندی تھی۔ آج قدر خداوندی سے ہی، اس اُمت کے ہاں ایک نئی نسل کی پرورش ہو رہی ہے۔ یہ وہ نسل ہے جو 'خش و خاشاک' والی نسل کے بعد اٹھ رہی ہے اور جس کے اٹھنے کا سہرا کسی حد تک ان دشمنوں کو جاتا ہے جو اس دین کو صفحۂ ہستی سے ختم کر دینے کیلئے منصوبے بناتے آئے ہیں:

واللہ غالبٌ علی اَمرِہ ولکنَّ اَکثرَالنّاس لا یعلمون (یوسف:۲۱)

"اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں"۔

☆☆☆☆☆☆☆

اب یہ جو سارا سفر باقی ہے، مسلمانوں کیلئے یہ کوئی تفریحی مہم بہر حال نہ ہوگا۔ یہاں قربانیاں ہوں گی۔ جانیں جائیں گی۔ کہرام، آزمائشیں، اذیتیں سب کچھ ہوگا۔ ایک مسلسل جہد ہوگی اور ایک ان تھک محنت:

وَلِیعْلم اللہ الذین آمنوا منکم ویتَّخِذَ منکم شُهَداءَ (آل عمران:۱۴۰)

"اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سے سچے مومن کون ہیں، اور اُن لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں"۔

یعنی مسلمانوں کو وہ قیمت بھی دینا ہوگی جو کہ دینِ خداوندی کے حق میں ان کی ایک طویل سستی اورکوتاہی کے باعث ان پر حق بنتا ہے اور پھر وہ جہد بھی صرف کرنا ہوگی جو 'بھٹکے ہوئے آہو' کو اصل راہ پر چڑھا آنے کیلئے صرف کرنا ہوتی ہے۔

مگر جس دوران وہ شہید دے رہے ہوں گے، عذاب سہہ رہے ہوں گے اور جبر و مشقت سے گزر رہے ہوں گے...... اس سب کچھ کو سہہ جانے اور بھول جانے کیلئے جو چیز ان کو سہارا دے گی وہ یہ کہ اب وہ اللہ کے راستے میں جہاد کر رہے ہیں، جس سے زمین میں اللہ کا کلمہ بلند ہو اور یہ کہ یہ خدائی تقدیر کا وہ پردہ ہیں جس کے پس منظر میں اس دین کو انسانی دُنیا میں پھر سے تمکین دلوائی جا رہی ہے۔

جو چیز ان کو سہارا دے گی وہ یہ کہ ان کیلئے آخرت میں جنت ہے اور اللہ عزوجل کی رضا وخوشی:

وَعَدَ اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ، وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (التوبہ:۷۲)

*"ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انھیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ان سدا بہار باغوں میں ان کے لیے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انھیں حاصل ہوگی۔یہی بڑی کامیابی ہے"۔*

☆☆☆☆☆☆☆

شجر سلف سے پیوستہ، فضائے عہد سے وابستہ

# مطبوعاتِ ایقاظ

| | |
|---|---|
| روزِ غضب<br>زوالِ اسرائیل پر انبیاء کی بشارتیں، توراتی صحیفوں کی اپنی شہادت | ڈاکٹر سفر الحوالی |
| روبہ زوال امیریکن ایمپائر<br>عالم اسلام پر حالیہ صلیبی یورش کے پس منظر میں | حامد کمال الدین |
| مسجدِ اقصیٰ، ڈیڑھ ارب مسلمانوں کا مسئلہ (کتاب و آڈیو) | حامد کمال الدین |
| مسلم ہستی کا احیاء | حامد کمال الدین |
| دعوت کا منہج کیا ہو؟ | محمد قطب |
| ایمان کا سبق | حامد کمال الدین |
| شروط لا الٰہ الا اللہ | حامد کمال الدین |
| نواقضِ اسلام | حامد کمال الدین |
| توحید کے تین اساسی محور | حامد کمال الدین |
| موحد تحریک | حامد کمال الدین |
| آپ کے فہم دین کا مصدر کیا ہے؟ | حامد کمال الدین |
| اہل کتاب سے برأت | ڈاکٹر سفر الحوالی |
| صیام اور بندگی کے معانی (کتاب و آڈیو) | حامد کمال الدین |
| یہ گرد نہیں بیٹھے گی! | حامد کمال الدین |
| یہ وہی انگریزی نظام ہے، مگر اب یہ 'اسلامی' بھی ہے! | حامد کمال الدین |

کتب خانوں، یا ہم سے بذریعہ وی پی طلب فرمایئے، انٹرنٹ پر بھی دستیاب www.eeqaz.com, www.eeqaz.org

ایقاظ کے مضامین پھیلایئے، البتہ

# فوٹو سٹیٹ کرانے کی ضرورت نہیں!

**ہم اپنے اُن قارئین کے ممنون ہیں جنھوں نے ایقاظ کے بعض گزشتہ مضامین یہاں کے فکری حلقوں تک زیادہ سے زیادہ پہنچانے میں دلچسپی ظاہر فرمائی ہے۔**

اِس بات کے پیش نظر کہ مضامین کو فوٹو سٹیٹ کر کے تقسیم کرنا مہنگا پڑتا ہے، ادارہ ایقاظ اپنے اِن قارئین کیلئے یہ سہولت پیش کرتا ہے کہ:

**تقسیمِ عام کیلئے آپ ایقاظ کے حالیہ یا گزشتہ کسی بھی شمارہ میں شائع شدہ کوئی بھی مضمون الگ سے طلب فرما سکتے ہیں۔**

آپ کا کوئی بھی طلب کردہ مضمون ادارہ ایقاظ آپ کو 25 پیسے فی صفحہ کے حساب سے ارسال کرے گا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مضمون 40 صفحے کا ہے تو وہ آپ کو 10 روپے میں پڑے گا۔ ڈاک خرچ بھی بذمہ ادارہ ہوگا۔ البتہ چونکہ یہ سہولت تقسیم عام کیلئے پیش کی جا رہی ہے لہٰذا کسی بھی مضمون کی ایک صد کاپی طلب کرنا ضروری ہوگا۔

Ph: **0323-403-1624** matbooateeqaz@gmail.com

شجرِ سلف سے پیوستہ، فضائے عہد سے وابستہ

# سہ ماہی ایقاظ

## خصوصاً اِن موضوعات کے مطالعہ کیلئے:

☆ ایمان، عقیدہ، فکر، منہج، تربیت...... جو کہ بصیرت کی اساس ہیں

☆ ولاء اور براء...... جو کہ مسلم شخصیت کی پہچان ہیں......

☆ امتِ اسلام میں اخوت اور وحدت کے پنپنے اور انسانوں کے گرد کھڑی کردی گئی سب سرحدوں کو بے وقعت کردینے کی دعوت، سوائے اُن 'حدوں' کے جو معبود کے تعین اور طرزِ حیات کے چناؤ سے وجود میں آتی ہیں

☆ تحریک، سماجی تبدیلی، تہذیبی پیش رفت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، دعوت، تعلیم،...... باطل، شرک، ابتداع، فسق اور انحراف کے جملہ مظاہر کی تردید ومخاصمت، جاہلیت سے دو بدوئی...... جو کہ جہاد کے کچھ اہم ابواب ہیں

☆ انسانی رشتوں کا پاس، محروم، نادار، پسے ہوئے طبقے کی خیر خواہی اور اعلیٰ قدروں کی ترویج...... جو کہ مکارمِ اخلاق کے کچھ اہم مندرجات ہیں

- ایقاظ ایک منبر ہے اُس مبارک مشن میں تحریری شمولیت کیلئے جس کا مقصد آج کے اسلامی تحریکوں سے وابستہ نوجوانوں کو عقیدہ کے ایک اصیل متوازن منہج سے آراستہ اور ایک ٹھوس فکری اہلیت سے لیس کردینا ہے اور اہلسنت گروہوں سے وابستہ تحریکی وجہادی وسماجی عمل کو فکری وثقافتی پہلوؤں سے مضبوط کردینا

- ایقاظ ایک کاوش ہے جذبہ کو بصیرت میں مدغم کردینے اور عمل کو علم سے برآمد کرنے کا منہج سامنے لانے کی

- ایقاظ ایک صدا ہے یہاں کے علمی ودعوتی حلقوں میں اس فقہِ اختلاف اور فقہِ ائتلاف کو زندہ وبحال کرنے کی جو کہ اہلسنت کا ایک امتیازی خاصہ اور ان کی قوت کا تاریخی راز ہے، اور جس کے عام ہوجانے سے حق کی قوتیں اپنے آپس کے وہمی معرکے ختم کرکے ایک نئے سرے سے متحد وصف آرا ہوں گی اور اتحاد ویکجہتی کے وقتی وسطحی وغیر طبعی مظاہر سے نجات پائیں گی۔

336 D سبزہ زار، لاہور 0323-4031624

www.eeqaz.com

شجر سلف سے پیوستہ، فضائے عہد سے وابستہ.. **حقیقتِ دین و عصر حاضر کے افکار و مسائل** پر

آگہی بخش مجلّہ، مطبوعات وویب سائٹ ایقاظ کے تحریری مشن میں معاون بنیے